عظیم کتابیں
عوام کی بغاوت
تصنیف
اورٹیگا گیسیٹ
ترجمہ
آئی یو جرال
مقتدرہ قومی زبان
پاکستان

عوام کی بغاوت

تصنیف
اورٹیگا گیسیٹ

ترجمہ
آئی یو جرال

مقتدرہ قومی زبان
پاکستان

سلسلہ مطبوعات: ۳۷۴

عالمی معیاری کتاب نمبر ۲-۲۳۸-۴۷۴-۹۶۹ ISBN

طبع اول ـــــــــــ اگست ۱۹۹۹ء

تعداد ـــــــــــ پانچ سو

قیمت ـــــــــــ ۱۱۰ روپے

فنی تدوین ـــــــــــ ڈاکٹر عطش درانی

کمپوزکاری ـــــــــــ حمزہ کمپیوٹر کمپوزنگ سنٹر، اسلام آباد

پروف خوانی ـــــــــــ محمد نذیر رانجھا

سرورق ـــــــــــ قسور علی خاموش

اہتمام ـــــــــــ اجمل وجیہہ

مطبع ـــــــــــ ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی

ناشر ـــــــــــ **افتخار عارف**

صدر نشین

مقتدرہ قومی زبان، ایچ ۸/۴،

پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد۔

پیش لفظ

تاریخ شاہد ہے کہ تہذیب و تمدن انسانی کے ارتقاء میں دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ انسانی دانش و بینش کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ دانش انسانی نے فہم و ادراک کی حدود مقرر کی ہیں، علوم و فنون کو نئے زاویے عطا کیے ہیں اور فضیلت کے ان عظیم الشان کارناموں کو چند ایسی کتابوں کی صورت میں یادگار بھی چھوڑا ہے جو ان علمی فتوحات کے سبب خود بھی بڑی کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان گراں مایہ آثار نے اپنے زمانے میں بھی اور اپنے بعد آنے والے زمانوں میں بھی ذہن انسانی کے ارتقاء میں جو کردار ادا کیا ہے صاحبان علم اس سے بخوبی واقف ہیں۔ ہر چند کہ یہ کتابیں مختلف اقوام کا سرمایہ اور ورثہ ہیں اور مختلف زبانوں میں معرض وجود میں آئی تھیں لیکن اپنی اہمیت اور اثر و نفوذ کے سبب تراجم کے ذریعے دنیا کی دوسری تہذیبوں اور زبانوں میں بھی منتقل ہوئیں اور یوں حیات جاوداں کی منزلوں سے بہرہ ور ہو گئیں۔ اب یہ عالمی سطح پر علم و دانش کا اجتماعی سرمایہ ہیں۔

اردو زبان کے فروغ کے لیے تراجم کی ضرورت اور اہمیت کا احساس اس زبان کے علمی دنیا میں داخل ہونے کے ساتھ ہی کر لیا گیا تھا۔ فروغ اردو کے اداروں نے تراجم کو ہمیشہ اولین صف میں رکھا ہے چنانچہ اردو نثر کی تاریخ میں جتنا حصہ اہم طبع زاد تحریروں کا ہے کم و بیش اتنا ہی سرمایہ تراجم کا بھی ہے۔ تراجم کے بغیر شاید اردو زبان علمی موضوعات کی ان وسعتوں اور بلندیوں سے ہمکنار نہ ہو سکتی جن پر وہ آج نظر آتی ہے۔ اردو تراجم کی تاریخ میں بعض کارنامے تو تخلیقی ادب

کے ہم پایہ نظر آتے ہیں اور یہ مقام حاصل کرنا کسی بھی زبان کے لیے بڑے اعزاز اور عظمت کی بات ہے۔

اسی دیرینہ روایت کے تسلسل میں قیام پاکستان کے جشن طلائی کے موقع پر مقتدرہ قومی زبان نے پچاس ایسی کتابوں کے اردو تراجم شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جن کا شمار مختلف علوم کے حوالے سے دنیا کی عظیم کتابوں میں ہوتا ہے۔ زیر نظر کتاب "**عوام کی بغاوت**" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے مصنف ممتاز ہسپانوی دانشور اور ٹیگا گیسیٹ ہیں جب کہ اس کے ترجمہ کا کام آئی یو جرال نے کیا ہے۔

——— افتخار عارف

نئے معاہدہ عمرانی کا مصنف

ہسپانوی زبان میں لکھنے والے جوز اورٹیگا وائی گیسیٹ (Jose Ortega Y Gasset) کو اس کی کتاب "عوام کی بغاوت" سے بیسویں صدی عیسوی میں وہی شہرت ملی جو روسو کو اٹھارویں صدی میں "معاہدۂ عمرانی لکھنے پر حاصل ہوئی تھی۔ گیسیٹ میڈرڈ میں ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا۔ سیاستدان اور دانشور کی حیثیت سے اس نے خاص شہرت پائی۔ ہسپانوی ری پبلکن حکومت دانشور کی حیثیت سے بھی وہ خاصا مشہور ہوا۔ ہسپانوی ری پبلکن حکومت میں پارلیمان کا رکن رہا۔ علاوہ ازیں میڈرڈ یونیورسٹی میں وہ کئی سال تک ما بعد الطبیعیات کے شعبے کا چیئرمین رہا۔ اس کے علاوہ رسالہ Reviata de Occidente کا ایڈیٹر رہا۔ "عوام کی بغاوت" پہلی بار ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔

انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ اسی سال اس نے وفات پائی۔ مترجم کے کہنے پر اسے گمنام رہنے دیا گیا۔ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے۔ مصنف کی ۲۵ویں برسی پر ایک ایڈیشن امریکا سے شائع ہوا۔

اس کتاب کے علاوہ بھی مابعد الطبیعیات ، فلسفہ، سیاست، تاریخ، تعلیم اور آرٹ کے موضوع پر اس کی کم و بیش بارہ کتابیں شائع ہوئیں لیکن شہرہ آفاق کتاب "عوام کی بغاوت" ہی ٹھہری۔

گیسیٹ کے نزدیک ۱۲۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک مغربی دنیا کی آبادی مستقل رہی لیکن انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے نصف اول تک یورب اور امریکا کی آبادی کم و بیش تین گنا

ہو چکی ہے۔ اس سے "عوامی آدمی" کا تصور ابھرا ہے۔ جمہوریت کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے گیسیٹ نے اس جمہوری یا عوامی آدمی(Mass-man) کی بقاء کے مسئلے پر سوالات اٹھائے ہیں۔

اردو میں پہلی بار اس کا ترجمہ **معروف** صحافی آئی یو جرال نے پیش کیا ہے۔ ترجمہ اس قدر سلیس، رواں اور عام فہم ہے کہ گیسیٹ کا فلسفہ عام قاری کے نقطہ نظر سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس طرح عظیم کتب کے سلسلے میں اب عصرِ حاضر کی ایک اور کتاب کا اضافہ ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر عطش درانی

فہرست

باب اول

عوام کی یلغار

اس وقت یورپ کی عوامی زندگی میں "نیکی یا بدی" کی حقیقت نے خصوصی اہمیت اختیار کر لی ہے اور اس ٹھوس حقیقت نے عوام کی سماجی اور سیاسی قوت میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ عوام الناس اپنی تعریف کے حوالے سے بلاواسطہ یا براہ راست اپنی اہمیت کا اظہار کر سکتے ہیں۔ مگر ان کے ساتھ دھوکا یہ ہوا ہے کہ اپنی ہی سوسائٹی پر بہت کم حکمرانی کر سکے گویا اس حقیقت کا مطلب یہ ہوا کہ یورپ اس وقت حقیقتاً" اس اذیت ناک بحران سے دوچار ہے جس بحران سے عوام الناس، قومیں اور تہذیب و تمدن پر تباہ کن مصائب نازل ہو سکتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسے بحران قوموں پر اور انسانی تہذیب و تمدن پر ایک سے زائد بار آئے، جن کی خصوصیات اور نتائج کا سب کو علم ہے اور اس کے نام سے بھی سب واقف ہیں یعنی اسے "بغاوت" کا نام دیا گیا۔ اس خوفناک، بھیانک اور تلخ حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے آغاز کے اسباب کو سمجھا جائے نیز "عوام" "بغاوت" کے الفاظ کو باطل قرار دینے سے گریز کیا جائے۔ سماجی طاقت کا سرچشمہ سیاسی ہوتا ہے۔ جبکہ عوامی زندگی جس میں وحدت اور اکائی ہو غیر سیاسی ہوتی ہے۔ وہ ابتدا ہی سے فکری، اخلاقی، معاشی، مذہبی اور اجتماعی عادات و اطوار کی اکائیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس میں اضافی طور پر لباس کے فیشن اور تفریح طبع کے مشاغل بھی شامل ہیں۔

اس تاریخی اور عجیب صورت حال کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے زمانی اور مکانی حوالے سے ہمیں اپنی ساری توجہ بصری اور نظری تجربے کی طرف موڑ دینا ہو گی اور ہمیں ان عصری تقاضوں پر کام کرنا ہو گا جنھیں ہم سادہ اور صاف صاف دیکھتے ہیں اور اس حقیقت کو اس کے اپنے خاص حقیقی انداز ہی میں پیش کیا جائے تو یہ بالکل واضح اور سادہ ہے۔ البتہ اس کی جزئیات کو الگ الگ پیش نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں اس کو باہم وابستگی کی حقیقت قرار دے کر اسے اکثریت کی اکملیت اور سچائی

قرار دیتا ہوں۔ شہروں اور قصبوں میں عوام کی بھرمار ہے۔ ریل گاڑیاں مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہیں۔ شہر اور قصبے کرایہ داروں سے آباد ہیں۔ ہوٹلوں' ریستورانوں اور کیفوں میں گاہکوں کا انبوہ لگا ہوتا ہے۔ سیرگاہوں میں چہل قدمی کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں کے دواخانوں میں مریضوں کا رش ہوتا ہے۔ تھیٹروں میں تماشائیوں کا جم غفیر اور ساحل سمندر کی جھیلوں میں نہانے والوں کا بے حد ہجوم ہوتا ہے۔ ماضی میں مذکورہ جگہوں پر اس قسم کے عوامی ہجوم کا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا۔ لیکن اب یہ مسئلہ پریشان کن صورت اختیار کر گیا ہے۔ ہوٹلوں میں جاؤ تو کمروں کے حصول میں دشواری پیش آتی ہے۔ اوپر دی گئی جگہوں پر آپ کہیں بھی جائیں آپ کو بے شمار پریشانیاں اٹھانی پڑیں گی اور اکثریتی عوام کو متعدد اور مشکل مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ مسئلہ گھمبیر شکل اختیار کر چکا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم اپنی عوامی زندگی میں زیادہ آسان' سادہ' غیر متغیر اور مستقل حقیقت کو پیش کر سکتے ہیں؟ تو آیئے! ہم اپنے حقیقی مشاہدے کی سطح پر غور کریں تو نہایت تعجب اور حیرت کے ساتھ یہ بات سامنے آتی ہے اور صاف دکھائی دیتا ہے کہ غیر متوقع طور پر پھوٹنے والے سرچشموں کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ جس میں دن کی سفید روشنی نے ہمارے حقیقی اجالے کو پارہ پارہ کر کے ہمارے مثبت اور ٹھوس مشاہدے کو زیادہ رنگین بنا دیا ہے۔ آخر یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ جس نے ہماری قوت بصارت کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ہمارے ذہنوں اور ہماری سوچوں میں کثرت افراد کی تصویر اور نقشہ ہر وقت گھومتا رہتا ہے کہ عوام الناس نے ہر جگہ پر قبضہ جما رکھا ہے۔ نیز عوام نے جو ہتھیار اور اوزار ایجاد کر لیے ہیں اس کے معمولی پر تو سے ہم خود ہی ورطہ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں یعنی خوشگوار تعجب کو اپنی ہی نظر لگ جاتی ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟ کیا یہ صورت حال غیر معمولی نہیں؟ تھیٹر میں بہت ساری نشستیں اس لیے لگائی جاتی ہیں کہ شاید کھچا کھچ بھر جائے۔ مگر اب صورت حال کچھ اس طرح سے ہے کہ نشستیں کم اور بندے زیادہ یعنی ہجوم بڑھ جاتا ہے اور نشستیں کم پڑ جاتی ہیں اور لوگ ہیں کہ وہ تھیٹر دیکھنے کے لیے باہر کھڑے ہو کر اندر کے مناظر دیکھنے پر بے تاب اور مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ صداقت منطقی امر ہے تو ہمیں یہ صداقت تسلیم کر لینی چاہیے۔ تاہم اب ایسے غیر معمولی واقعات روزمرہ کا معمول ہیں۔ لہٰذا تغیر و تبدل کا ظہور لازمی ہو گیا ہے۔ یہ ایک مسلمہ جدت طرازی ہے جو پہلے ہی لمحے ہماری خوشگوار حیرت کو ناکام کر دیتی ہے۔

حیران کن اور اچانک کسی موضوع کے ذہن میں در آنے کا مطلب ہے کہ آپ نے اس موضوع پر غور کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ حیرت انگیز تجربہ کسی بھی دانشور اور فلاسفر کے لیے تسلی

بخش اور قابل اطمینان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ کھلے دل و دماغ اور کھلی آنکھوں سے اس عجیب اور نئے مشاہدے کو آشکارا کرتا ہے۔ ایسے جہاں دیدہ اور جہاں نما شخص کے لیے کائنات کی ہر چیز عجوبہ بن کر سامنے آتی ہے۔ اس کے اس اکتسابی اور مشاہداتی شعبہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جہاں فٹ بال کے شوقین کو جلا بخشنے سے انکاری ہے۔ وہاں دوسری طرف ادیب اور محقق کی حیات کو دوامی انکشافات اور تجربہ کی دولت سے مالامال کر دیتی ہے۔ یہ صلاحیت اسے گہرے مطالعہ اور حیرت انگیز تجربے نے عطا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ قدیم کے انسانوں نے منروا کے الو کو آگے دیکھنے کے لیے بڑی بڑی اور خیرہ کن آنکھوں کی نعمت عنایت کی تھی۔

ماضی میں ہم بستگی اور لبریزیت کی کیفیت کو نظرانداز کر دیا جاتا تھا مگر اب ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہمارے گردوپیش کی عوامی کثرت کے ترکیبی جزئیات نے لاشے کو کوئی زقند نہیں پہنچایا۔ قریباً" پندرہ سال بیشتر لوگوں کی وہی تعداد موجود تھی۔ جنگ کے بعد افراد کی کثرت تعداد کو یقیناً" کم ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہ ہوا یہاں ہم پھر اہم نقطہ کے برخلاف واپس آتے ہیں وہ افراد جو کثرت تعداد کا باعث بنے، موجود تھے۔ مگر کردار اور کثرت تعداد کی صورت میں نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے گروہوں اور قبیلوں کی شکل، جدا جدا، بکھری بکھری تنہائیوں میں مختلف جگہوں پر پھیل گئے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ وہ لوگ خطہ ارضی کے کسی نہ کسی گوشے میں رہائش پذیر ہو کر کسی نہ کسی صورت میں حالات کے مطابق زندگی گزار رہے تھے۔ ہر ایک گروہ، قبیلہ یا فرد اپنی اپنی پسند کی جگہ پر قابض ہو گیا۔ انھوں نے دوسرے ملکوں، دیہاتوں، گاؤں، قصبوں اور چھوٹے بڑے شہروں کے کوارٹروں میں رہائش اختیار کر لی۔ وہ لوگ خواہ کہیں بھی آباد ہو گئے، اس کثرت تعداد نے ہمیں کثرت تعداد کی نظروں ہی سے دیکھا اور مسلسل دیکھتے رہے۔ وہ نہ صرف ایک سمت سے دیکھ رہے تھے بلکہ وہ ہمیں بہترین مقامات اور پاکیزہ انسان کی تخلیقی اور ثقافتی آنکھوں کی آفرینش سے دیکھ رہے تھے اور ٹھیک ٹھیک انداز میں دیکھ رہے تھے۔ ماضی میں یہ تخلیقی صلاحیت اور وصف مخصوص افراد اور گروہوں کے لیے مخصوص و محفوظ کیا جاتا رہا ہے۔ الغرض یہ عنایات اقلیتی گروہوں کے لیے مخصوص تھیں۔ مگر اب کثرت تعداد ہر چیز کا مشاہدہ کرتے ہوئے سامنے آ گئی ہے اور اس تعداد نے ترجیحی بنیادوں پر اپنے مرتبہ اور مقام کو حاصل کرنا اور منوانا شروع کر دیا ہے۔ یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ کثرت آبادی پہلے ہی موجود تھی۔ البتہ ان کے مقام و مرتبہ اور ان کی صلاحیتوں پر توجہ نہیں دی گئی۔ یا جان بوجھ کر نظرانداز کر دیا گیا تھا اور معاشرتی منظر سے پس منظر میں دھکیل دیے گئے اور اب جبکہ اسی کثرت آبادی نے پس منظر سے پیش منظر میں آ کر سٹیج ہال کے قمقموں والا مقام و مرتبہ پا لیا ہے۔ تب جا کر اس منصب جلیلہ پر فائز ہوئے ہیں۔ یہاں سے وہ معاشرہ میں بہترین کردار ادا کر سکیں گے۔ جبکہ ماضی قریب میں تو معاشرہ میں ان کا

کوئی بھی کردار نہ تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو صرف اجتماعی طور پر گانے والوں کا کردار تھا۔

کثرت تعداد کا مفہوم یا تصور مقداری اور بصری ہوتا ہے۔ اس کی فطری جزئیات میں کوئی تبدیلی کیے بغیر ہم یہ کہتے ہیں آیئے! علم تمدن کے تعلق کی روشنی کے حوالے سے ہم یوں بیان کر سکتے ہیں تب ہمیں انسانی سماج کے ارتقائی تصور کے جم غفیر سے سامنا ہے۔ معاشرہ کی تشکیل دو متحرک عناصر کی ہم آہنگی سے ہوتی ہے۔ ایک اقلیتیں اور دوسرے جمہور۔ اقلیتیں ان افراد یا گروہوں میں سے تشکیل پاتی ہیں۔ جو خصوصی قابلیت اور اہلیت کے مالک ہوتے ہیں اور جمہور کثرت تعداد کے اس انبوہ کو کہتے ہیں جو عام طور پر ناخواندہ ہوتا ہے۔ جمہور سے پروتعاری مراد نہ لیے جائیں اور نہ ہی یہ جمہور کا مفہوم ہے۔ جمہور سے مراد متوسط طبقہ کے عام لوگ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے اکثریت کثرت تعداد کو کہا جاتا ہے اور اس حوالے سے اس کی یہ عام سماجی اہمیت بن جاتی ہے اور ان کی ایک دوسرے سے تفریق نہیں کی جاتی کیونکہ وہ نسلی امتیاز کو دہرا لیتے ہیں۔ ہم نے اس افرادی اکثریت کو اہلیت میں تبدیل کر کے کیا فائدہ حاصل کیا؟ اس کا سادہ اور عام فہم جواب یہ ہے کہ اول الذکر کے تخلیقی عمل کو آخرالذکر کے ذریعے سے سمجھ لیتے ہیں۔ ان بے مقصد تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ کثرت تعداد کی عمومی ترتیب میں مکانیت کی ہم آہنگی معاونت کرتی ہے۔ مثلاً" خواہشات' خیالات' طرز زندگی اور وہ افراد جو اس کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس کی حقیقت کو بیچ کی دلالت کرتے ہیں۔ اس پر بھی یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ کسی بھی سماجی اور معاشرتی گروہ کو ایسا واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ تاہم! کوشش کریں تو اس میں سے بھی چھانٹی ہو سکتی ہے۔ مگر اس میں بھی ایک اہم اختلاف موجود ہے۔ ان اکثریتی گروپوں کے وہ عوام اور تعداد جو کسی کی حامل نہیں ہوتی اس کے ارکان کے موثر طبقوں میں بھی خواہش اور خیال کو معیاری بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے جس سے خود بخود ایک بڑی تعداد خارج ہو جاتی ہے۔ اقلیت وجود میں لانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہر ایک رکن اپنے آپ کو اکثریت سے بعض ناگزیر وجوہات کے باعث علیحدہ کرے اس طرح بعد میں اس کی ثانوی حیثیت وجود میں آتی ہے۔ اس کے نزدیک یہ اس کا انفرادی فعل ہے۔ اس کے نتیجہ میں اور ہم زمانیت کے لحاظ سے وہ باہم مماثلت رکھتے ہیں یا اپنے فطری رویے کی یکسانیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس طرح کی بہت ساری مثالیں ہیں۔ کسی ایک گروہ کا ایک فرد دن کی روشنی میں اپنی علیحدگی کا اعلان کرتا ہے۔ مثلاً" ایک انگریز چرچ آف انگلینڈ کی پابندیوں سے انکاری ہے۔ مگر وہ ہمارے دونوں گروپوں میں شامل بھی ہوتا ہے۔ ان افراد میں وہ بھی ہیں جو صرف اس پر راضی ہوتے ہیں جو صرف چرچ کے احکامات ماننے سے منحرف ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو کثرت تعداد کی لامحدود وابستگی کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس سے اقلیت کا سرچشمہ پھوٹتا ہے اور اس طرح اقلیت کا قیام عمل میں آتا ہے۔ جب اس نے اکثریت سے بلا کم و

کاست علیحدگی اختیار کر لی ہے اور یہی عناصر کسی اقلیت کے وجود میں آنے کا باعث بنتے ہیں۔ عوام کی محدود تعداد موسیقار کی دلگداز آواز سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ ان کے بارے میں ملازم از روئے بذلہ گوئی فرماتے ہیں۔ یہ جو چند افراد کی موجودگی اکثریت کی غیر حاضری پر دباؤ ڈالتی ہے یا واویلا کرتی ہے۔

موضوع کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ عوام چند افراد کا انتظار کیے بغیر وسیع تر عوامی معاشرہ کی تشکیل کر جاتے ہیں۔ ایک فرد کی موجودگی ہی سے ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ "جمہور" ہے کہ نہیں۔ کیونکہ عوام ہی سب کچھ ہوتی ہے جو اپنی بھی قدر و منزلت نہیں کرتی کہ اچھا ہے یا برا اس کی بھی ٹھوس وجوہات ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ انھیں خود محسوس نہیں ہو پاتا۔ "ہر ایک فرد کی طرح" انھیں پھر بھی اپنے بارے میں کوئی تشویش نہیں ہوتی اور یہ فردا" فردا" ایک دوسرے کے ساتھ خوشیاں محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔ ایک سادہ لوح انسان اپنی خوبیوں کے باوجود "وہ اپنے آپ کو دوسروں کی طرح محسوس کرتا ہے" اسے پھر بھی اس پر کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود وہ تصور یہی کرتا ہے کہ دوسرے افراد کے ساتھ مل کر خوشی کے جذبے کا اظہار کرتا ہے اور اپنی خوبیوں کا خود اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی ذات سے سوال کرتا ہے کہ مجھ میں یہ یا کوئی اور صلاحیت موجود ہے؟ اسی سوچ و بچار کے ادھیڑ بن میں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اس میں کوئی خوبی یا صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ ایسا آدمی محسوس کرے گا کہ وہ ایک عامی اور درمیانے درجے کا انسان ہے۔ یہ بات وہ اپنی ذات میں ہی محسوس کرتا ہے۔ "عوام" کو نہیں کہتا۔

جب کوئی شخص اقلیتوں پر گفتگو کرتا ہے تو اکثر ان پر نکتہ چینی ہی کرتا ہے اور ان کے ذرائع ابلاغ کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ مقصد اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ بتائے کہ میں اس بارے میں باخبر ہوں حالانکہ منتخب شدہ فرد سر پھرا اور بدخو نہیں ہوتا وہ صرف دوسروں کے مقابلے میں اپنی ذات کو برتر سمجھتا ہے۔ جو شخص اپنی ذات کے لیے دوسروں سے وہ مطالبہ کرے جو دوسروں کی شدید ضرورت کے وقت خود ان کا مطالبہ پورا نہ کر سکے' وہ انسان بلاشبہ اپنے آپ کو دوسرے افراد سے جدا رکھتا ہے۔ نوع انسانی کی دو بنیادیں قسمیں ہیں۔ اول: جو اپنی ذات کے لیے بھاری مطالبات رکھتے ہیں اور فرائض کی انجام دہی میں مشکلات بڑھتی جاتی ہیں۔ دوسرے وہ جو خود اپنے لیے تو کوئی خصوصی مطالبہ نہیں رکھتے مگر ان کے لیے زندہ رہنا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جبکہ اس کی موجودگی پہلے جیسی ہوتی ہے۔ ایسا اس لیے کرتا ہے کہ اپنی ذات پر کوئی پابندی لگائے بغیر تکمیل کے مراحل طے کرنے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے وہ صرف پیراکی خول کی طرح ہوتا ہے جو صرف لہروں پر تیرتا ہے۔ اس کے اس رویے سے راسخ العقیدہ بدھ مت یاد آ گیا ہے۔ جس کے دو مذہب ہوتے' ایک زیادہ مشکل اور سخت اور دوسرا آسان اور ہلکا۔ یعنی ایک مہایانہ "ایک عظیم ذریعہ اور عظیم راستہ" اور دوسرا ہمایانہ "کم تر

راستہ" اور "کم تر ذریعہ" اب ہمیں اپنی کم از کم یا زیادہ سے زیادہ ضروریات اور مشکلات کے مد نظر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کونسا راستہ اپنی زندگی کے لیے منتخب کرنا ہے۔ پہلا یا دوسرا۔

معاشرتی عوام اور مخصوص اقلیتیں سماجی طور پر طبقات کی تقسیم بندی میں شامل نہیں ہوتیں۔ اسی طرح مردوں کے طبقات نچلے اور اعلیٰ طبقے کی علیحدگی کے مطابق نہیں ہوتے۔ یہ ایک عام فہم بات ہے کہ اعلیٰ طبقہ کی موجودگی میں اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ مرد حضرات برتر اور عظیم راستہ اختیار کرتے ہیں جبکہ عام طور پر نچلا طبقہ منفی اہلیت کے لوگوں کے ساتھ سمجھوتا کرتا ہے۔ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو معاشرے کے دونوں طبقات میں "عوام" اور "اصلی اقلیت" مل جاتی ہے۔ وقت کی بالادستی میں جب ہم عوام کے عامیانہ روایتی اور رسمی انتخاب کے اندر جھانک کر دیکھتے ہیں تو یوں دانشورانہ زندگی جس کو پاکیزہ روح کی ضرورت ہے اور جعلی دانشور کی ترقی، ناخواندگی، نااہلی اور اس کی ذہنی نیت کے باعث اسے غیر مستند قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح امراء کے باقی بچنے والے مرد و زن سمیت گروہوں کو بھی مستند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے برعکس آج ہم میں سے کام کاج کرنے والے مرد و زن کو دریافت کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھیں ہم پہلے ہی عوام کا نام دے چکے ہیں۔ یہی لوگ یا عوام شرافت، نظم و ضبط اور ذہانت کا پیکر ہوتے ہیں۔

پھر یوں ہوا کہ معاشرے میں مختلف قسم کے کام کاج، سرگرمیاں اور روزمرہ کے معمولات کا سلسلہ چل نکلا۔ مگر ان تمام سرگرمیوں کے پیچھے ایک محرک احساس تھا۔ مثلاً" حکومت کے معمولات اور عوامی مفاد، فیصلے، صاف ستھرے کردار اور جمالیاتی ذوق کو عوام کے حق میں استعمال کرنے سے عوام کو خصوصی طور پر اطمینان اور سکون نصیب ہوا۔ حکومت کے ان اچھے کاموں اور فیصلوں سے عوام لطف اندوز ہونے لگے۔ جبکہ ماضی میں ایسی سرگرمیوں اور فیصلوں کو مستند اقلیتیں سرانجام دیتی تھیں یا بذات خود مستند اقلیتیں دعویدار تھیں مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عوام نے بھی اپنے حق ملکیت کو واضح انداز میں استعمال نہیں کیا تھا جس سے خود ساختہ اور مستند اقلیتیں اپنے اوپر عوام کا حق حکمرانی محسوس کرتیں۔ ایسی صورت حال میں انھوں نے محسوس کیا اور سوچا کہ ان پر اپنا حق ملکیت جتانے اور منوانے کے لیے مداخلت کرنے سے پہلے ان جیسی مستند خصوصیات اور اہلیت ثابت کرنا ہو گی۔ صرف عوام، عوام کے ورد سے بات آگے نہیں بڑھے گی۔ انھیں خود آگے بڑھنا ہو گا۔ اپنی منزل حاصل کرنا ہو گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر ایک مضبوط اور توانا معاشرتی نظام میں اپنا مقام اور مرتبہ تسلیم کروایا۔

اب اگر ہم اپنی ابتدا میں بیان کردہ حقیقتوں پر طائرانہ نظر دوڑائیں تو صاف نظر آئے گا

کہ عوام کا رویہ ایک پیمائی کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ وہ نشاندہی یہ ظاہر کرتی تھیں کہ عوام نے آئندہ اپنی معاشرتی زندگی میں ایک باوقار اور نمایاں کردار اور مقام پانے کا عہد کر رکھا ہے۔ مزید یہ کہ وہ اپنے تمام ذرائع استعمال کر کے اپنی ان مسرتوں کو حاصل کر لیں گے جن پر صدیوں سے چند افراد کی اجارہ داری مسلط ہے۔ اس سے واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر عوام کو کبھی مقام و مرتبہ نہیں دیا گیا۔ ان کی جہتوں میں خاصا بعد' دوری اور اختلاف تھا۔ ان کی وسعت قوت کو محدود رکھا گیا۔ جس کے باعث عوام کا ایک بڑا سیلابی ریلا کناروں سے باہر نکل کر مسلسل پھیلتا چلا گیا۔ اپنی خاص اور شفاف روش سے بڑھتا رہا جس کے نتیجے میں ہماری مشاہداتی نظر و فکر نے ایک نئی' عجوبہ صورت حال اور جدت فکر کا مشاہدہ کیا۔ عوام اول و آخر عوام ہی تو ہیں۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔ وہ ان اقلیتوں کو معاشرتی اسٹیج سے نیچے اتار رہے تھے۔

میرا پختہ ایمان ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد یہ بات محسوس کرتا ہو گا کہ آج کے لوگ کل کے لوگوں کی نسبت زیادہ تعداد میں زیادہ معیاری زندگی سے بھرپور لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ کیونکہ اب ان کے پاس خواہش اور ذرائع دونوں موجود ہیں۔ لہٰذا وہ مطمئن ہیں۔ اس حقیقت کا صرف ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ ہے کہ عوام نے خود یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم عوام بھی مخصوص اقلیتوں جیسی خوشیاں اور مسرتیں حاصل کر کے رہیں گے بلکہ انھوں نے یہ فیصلہ ہمارے عہد کی اہمیت اور عمومی خصوصیات کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔ اسی نسبت سے میں نے متوقع صورت حال پر نگاہ ڈالی ہے اور میرا پختہ یقین ہو چلا ہے کہ مستند سیاسی قوانین' اختراعات اور تمام جدت طرازیاں ماضی کے اس عمل کا عکس ہیں اور اس کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مجھے اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ آنے والے وقتوں میں عوام الناس کی ہی سیاسی حاکمیت' ہو گی اور یہی عوام آئندہ فرسودہ اور پرانی جمہوریت کو بڑی گرم جوشی سے بدل دیں گے۔ خوش دلی سے آزاد خیالی کو قانون بنائیں گے اور پھر ان اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے ان کی روشنی میں افراد اپنے لیے قانونی' اخلاقی اور مضبوط نظم و نسق کے پابند ہوں گے۔ مستقبل میں ان پر سختی سے عمل پیرا ہوں گے۔ اب وہ مخصوص اقلیتیں بھی اصولوں کی چھتر چھاؤں اور قانون کی حاکیت کے تحت اپنی ساری خوشیوں اور مسرتوں کے ساتھ زندہ رہ سکیں گی اور تمیز اور شائستگی سے پیش آنے کا سلیقہ اپنائیں گی۔ جمہوریت اور قانون اور قانون کے زیر سایہ زندہ رہنا سے مراد وفاقی زندگی ہوتی ہے۔ ہم آج کے دور میں کامیاب اور تیز تر جمہوریت کی گواہی دے رہے ہیں کہ اس میں عوام قانونی حد سے باہر رہ کر عمل کرتے ہیں۔ اپنی خواہشات' امنگوں اور مطالبات کو معاشی دباؤ کے تحت استعمال کرتے ہیں۔ حالات کی اس نئی صورت اور سیاسی جمہوری نقشے میں یہ تحویل کرنا کہ عوام جمہوریت کی نمو اور نشوونما سے بیزار ہو چکے ہیں۔ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اس نئی صورت حال میں یہ

بات بھی لغو ہے کہ انھوں نے اپنے اختیارات کا استعمال منتخب افراد کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ سوچ ہی بالکل لغو ہے۔ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ اس طرح صرف ماضی میں ہوا کرتا تھا۔ البتہ وہ بھی ایک جمہوریت کی شکل تھی۔ بالآخر عوام نے محسوس کر لیا کہ ان کی کوتاہیوں، غفلتوں کے باوجود اقلیتیں ان کو اور ان کے مسائل کو بہتر انداز میں سمجھے نہیں تھے۔ جیسے وہ خود اب محسوس کر رہے ہیں۔ لہٰذا اب عوام کا یہ پختہ یقین ہے کہ انھیں یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنی تمام جدتوں اور اختراعوں کو نافذ کریں اور عوامی خواہشات اور تصورات کو قانونی اور اخلاقی طور پر تحفظ فراہم کریں جو کیفوں اور ریستورانوں میں خلق کیے جاتے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ ہمارے عہد سے قبل عوام یا کثرت تعداد نے تاریخ کے کسی ادوار میں اس سے زیادہ براہ راست اپنے حق یا اختیار کے تحت انتظام کیا ہو۔ میں اسی وجہ سے اس کو تیز تر جمہوریت کہتا ہوں۔

کچھ ایسا ہی معاملہ عوام کے دوسرے رواجی طور طریقوں میں خاص طور پر دانشوروں میں وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ ممکن ہے میری سوچ اور مشاہدہ غلط ہو یا غلط نہ بھی ہو۔ اہل قلم جب کسی مضمون کو احاطہ تحریر میں لانے کے لیے قلم اٹھاتا ہے تو اولا" وہ نفس مضمون کا گہرا مطالعہ کرتا ہے۔ اسے یہ نظریہ اپنے ذہن میں رکھنا ہوتا ہے کہ عام قاری پہلے بالکل متفکر نہیں ہے اور نہ ہی اس مضمون کے حوالے سے کوئی سوچ رکھتا ہے اور نہ وہ اس کی تحریر سے کوئی سبق حاصل کرے گا اور نہ ہی وہ اس نقطہ نظر سے مضمون کا مطالعہ کرے گا لیکن اس کے باوجود دانشور اپنے فیصلے کا اعلان کر دیتا ہے جبکہ ایک عام قاری اس کے مرتبہ، مقام اور اہلیت سے اتفاق نہیں کرتا۔ بلکہ عام قاری بلا جھجک یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ بات یا یہ واقعہ تو پہلے ہی سے میرے دل و دماغ میں تھا۔ اگر وہ افراد جو عوام کو ان کے ہونے کا اطمینان دلا سکتے ہیں تو تعلیم یافتہ افراد تو ان کو پڑھا کر سمجھانے کی قابلیت بھی رکھتے ہیں تو پھر ایسی صورت میں ذاتی اور انفرادی غلطی تصور کی جائے گی نہ کہ عمرانی فساد۔

اس وقت کا خصوصی کمال یہ ہے کہ وہ عام لوگوں کے شعور خودی کو مطمئن کرتا ہے اور یقین دلاتا ہے کہ وہ اول و آخر عامی ہے۔ یہ یقین دہانی ہو جانے کے بعد وہ اپنا اختیار ہر جگہ ہر فرد پر اور جب چاہے نافذ کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور نافذ بھی کر لے گا۔ مثال کے طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکا کے عوام کہتے ہیں کہ "مختلف خواص کی وجہ سے غوامیت کا اظہار ہوتا ہے" عوام سے اختلاف رکھنے والوں کو عوام ہی اپنے پاؤں تلے روند دیتے ہیں۔ یا یوں سمجھ لیں کہ عوام کے مفادات کے برخلاف کام کرنے والوں کو عوام ہی ختم کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ کتنا ہی نفیس فرد ہو، تعلیم یافتہ ہو، منتخب شدہ ہو، عوام اسے زیر زمین دفنا دیتے ہیں جو فرد سب کی طرح نہ ہو منفرد ہو اور عوامی امنگوں کے مطابق نہ سوچتا ہو وہ خود ہی اپنے خاتمے کا خطرہ مول لیتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "ہر

کوئی" "ہر کوئی" نہیں ہوتا۔ "ہر کوئی" حسب قاعدہ عوام کے اتحاد کا مرکب ہوتا ہے۔ جبکہ عوام منتشر ہوتے ہیں اور اقلیتیں منتخب ہوتی ہیں اور "ہر کوئی" سے مراد صرف اور صرف عوام ہی ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے عہد کی ایک ہیبت ناک حقیقت ہے جسے ہم نے اس کے شرمناک غیر انسانی عمل اور کردار کو اور اس کے خدوخال کو صاف صاف کوئی پہلو چھپائے بغیر بیان کر دیا ہے۔

باب - ۲

تاریخی اہمیت میں اضافہ

وقت کے خوفناک منظر اور بدنظر رنگ دھوپ کی حقیقت کو بیان کر دیا ہے۔ نیز یہ کہ عوام کے اس عمل نے تہذیب اور ثقافت کی جدید تاریخ میں مکمل طور پر جگہ پا لی ہے کیونکہ اس کی ترقیاتی ذرائع میں کوئی اہم واقعہ یا عمل پیدا نہیں ہوا تھا۔ اگر ہم اس کی کوئی مثال بھی پیش کرنا چاہیں تو ہمیں جدید تاریخ کے عوامل، نتائج اور اپنی وسعت کے عناصر کو بھی سامنے رکھنا ہو گا اور وہ لازما" ہمارے نظریے سے ہم آہنگ ہو گا۔ ہمیں قدیم دور کے جذبات اور سوچوں کو کرید کر اس کے زوال کے اسباب دریافت کرنا ہوں گے۔ سلطنت "روما" کی تاریخ بھی عوامی سلطنت کے قیام کے لیے بغاوت کی تاریخ ہے جس نے بااختیار اور حکمران اقلیتوں کی قوت کو نیست و نابود کر دیا تھا اور ان کو ان کے مقام پر لانے کے لیے حکمرانی کا آئینہ دکھایا تھا۔ عوام کی اس "بغاوت" نے ایک عجیب صورت حال اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ "سنگلز" اسی منظر کو سامنے رکھ کر اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتا ہے۔ "یہ اسی طرح ضروری عمل تھا جسے ہمارے عہد میں شاندار اور بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرنا بہت ضروری ہے" ویسے بھی عوام کی تاریخ ایک عہد کی تاریخ ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ہم عوامی بربریت کے حالات سے گزر رہے ہیں۔ لہٰذا میں اس کی حکمرانی کو پھر ایک بار "وحشیانہ" ریاست کہتا ہوں۔ اس "دیو قامت" کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور اس کے اندر کا "شو" دیکھنے کے لیے خوشی خوشی اپنے ایک ہاتھ میں ٹکٹ لیے اور دوسرے ہاتھ میں قلم اٹھائے اپنے اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔ چنانچہ اب آپ اندر کا شو دیکھیں جسے میں نے اپنے خیال میں تسلی بخش، اطمینان بخش اور صحیح جان کر آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس میں اندرونی اور خارجی عوامل کے خطرناک حقیقت کے پہلوؤں کو بھی سمو دیا ہے کہ آپ بھی ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر سچائی اور حقیقت کا مشاہدہ کر سکیں۔ اگر میں ان اختلافی امور کو نہ چھیڑتا اور مضمون کا گلا دبا کر یہاں پر ہی چھوڑ دیتا تو قاری سر جھکا کر خاموشی

اختیار کر لیتا اور یہ سوچتا کہ یہ بغاوت فرضی ہے۔ تاریخی طور پر عارضی اور سطحی ہے اور مجھے بددماغ، کمینہ اور خوشامدی اور ضرورت کا بندہ کے خطابات سے نوازتا اور بڑی حد تک وہ مجھ سے نفرت کرتا۔ چنانچہ میرے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ جب لوگوں کو میرے اس نظریے کا پتہ چلا کہ میں ابھی تاریخ میں کی جانے والی اشرافیہ کی تشریح کی حمایت و تائید پر قائم ہوں کیونکہ میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ بنیادی طور پر انسانی معاشرہ اشرافیہ کا ہونا چاہیے یا اشرافیہ کا نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے جو کچھ کہا تھا یقین کامل کے ساتھ کہا تھا وہ یہ کہ انسانی معاشرہ خواہ وہ اشرفی ہو یا عوام کا۔ اپنے جوہر' روح اور حقیقت کے حوالے سے قائم و دائم رہے گا اور اس کی انتہا یہ ہو گی کہ سوسائٹی کی طبقاتی تقسیم کچھ اس طرح ہو گی۔ اس وقت جو اشرافیہ ہے اس کی بجائے جب یہ خود اشرافیہ ہو گی یعنی کثرت عوام ہی اشرافیہ ہو گی تو ایسی حالت میں اقلیتی اشرافیہ کو کثرت عوام اسے ختم کر دے گی۔ بلاشبہ میں اس وقت صرف سوسائٹی سے متعلق ہی بات کر رہا ہوں نہ کہ ریاست سے متعلق ایسی صورت میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ عوام کے جوش و خروش کے سامنے اشرافیہ کا رویہ کیا ہو گا اور یہ کہ متکبر اور مغرور چہروں والی اشرافیہ ٹھہر بھی سکے گی؟ آپ نے دیکھا کہ تاریخ کے جبر نے اشرافیہ کا خاتمہ کر دیا۔ وہ ہلاک ہو گئے۔ اس کے برعکس اشرافیہ کا وہی عنصر باقی بچا جو تاریخی جبر کے منظر کو کالی آندھی کی طرح چڑھائی کرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ صرف اشرافیہ کی تعظیم و تکریم تھی جسے سر قلم کرنے والی مشین کے حوالے کر دیا گیا اور عوامی دھارے کو قبول کر لیا۔ جیسے گلٹی کو نشتر قبول کرتا ہے اور جو اشرافیہ کے مشن کا شعور رکھتا ہے عوام کی چشم بینا اس کو آمادہ اور متحرک کر دیتی ہے۔ جس طرح سنگ تراش ماربل کی ہستی کو۔ سماجی اشرافیہ کو اس گروہ کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں ہوتی جو خود کو سوسائٹی پکارتی ہے۔

دنیا میں ہر چیز کی ایک صفت اور خوبی ہوتی ہے۔ اس کا ایک مشن ہوتا ہے جو چھوٹا اور محدود ہوتا ہے۔ دنیا وسیع ہے اور چھوٹے مشن کے ساتھ اصلی اشرافیہ کے قوی ہیکل کام سے مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس چھوٹی دنیا کی وسعتوں کے بارے میں بحث کرنے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ہمارا موضوع اب زیادہ وسعت اختیار کر گیا ہے اور اب نمایاں سوسائٹی یعنی وسیع مشن وقت کے دھاروں میں بہتا چلا جائے گا۔ میں نے یہ نتیجہ کس طرح اخذ کیا۔ چند نوجوان اور چند دوشیزائیں "میڈ ریڈیں" چھوٹے ستارے کی روشنی کا درجہ رکھتی تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں اس ناچ گھر میں ناچ کروں گی جس میں کم از کم آٹھ سو مہمانوں کو دعوت دی گئی ہو گی۔ اس سے پتہ چلا کہ عوام کے طرز زندگی نے جدید دور کے تمام شعبوں میں غلبہ پا لیا ہے اور اب چھوٹی بڑی دور نزدیک ہر جگہ پر اپنے تسلط کے اختیار کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوا کہ یہ چند مخصوص خوش باش لوگوں کے لیے نہیں ہے۔

میں برابر اپنے وقت کی وضاحت پر خوش ہوں جو عوام کی پوشیدہ صلاحیتوں سے گرد صاف نہیں کرتا اور نہ ہی اسے تسلیم کرتا ہے۔ جس کے خوف سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور ہر منظر اپنے معنوں کے حوالے سے ایک المیہ ہوتی ہے اور جو کوئی اپنے وقت کے خطرہ کو محسوس نہیں کرتا، اسے صرف چھو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ ہمارے وقت کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے سفر میں خطرے کے عنصر نے بغاوت کا جواز پیدا کر دیا ہے جو ناقابلِ تسخیر ہے۔ کیا یہ چیز وقت کے مطابق ہماری رہنمائی کرتی ہے؟ کیا یہ برائی یا اچھائی ہے؟ اس دیو قامت نے ہمارے قوی الجثہ شے کو دبایا ہوا ہے۔ مگر مختصر اور کائناتی تفتیش جو وقت کی قید میں محدود ہے بھی اور نہیں بھی۔ یعنی جدوجہد کر کے کامیابی کے محراب تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ حقیقت جس کو ہم جانچ پڑتال کے لیے پیش کر رہے ہیں، دو عنوانوں پر مشتمل ہے۔
اول: آج عوام اپنے ان اختیارات کو استعمال کر رہے ہیں جو اقلیتوں کے لیے محفوظ تھے اور مختص تھے۔ (دوم) یہ عوام اس موقع پر اقلیتوں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ ان کی اطاعت نہیں کرتے۔ عزت و احترام ختم ہو جاتا ہے۔ بلکہ ان کو برطرف کر کے انھیں باہر دھکیل دیتے ہیں۔

تو آیئے! ہم پہلے اپنے عنوان کا جائزہ لیں یعنی عوام مسرتوں سے لطف اندوز ہیں۔ اور یہ لوگ پہلے والے ہی طور طریقے استعمال کرتے ہیں جو منتخب اور مخصوص گروپوں نے ایجاد کر رکھے تھے اور پھر اپنی جبلت اور وقت کے حوالے سے اپنی حاجتوں کو محسوس کرتے ہیں اور ذوق لطافت کا احترام ماضی کی طرح کیا جانے لگا اور ان کے پیش نظر ماضی کے لوگوں کا ترکہ تھا۔ ۱۸۱۰ء میں (کمیٹی یونیگی کی یادداشتوں کے مطابق) پیرس کے نجی گھروں میں دس غسل خانے بھی نہیں ہوتے تھے۔ اسی نسبت سے اس وقت چند گنے چنے افراد ہی تیکنیکی طور پر مہارت رکھتے تھے۔ مگر اب عوام کو ان کے بارے میں ہر طرح کا علم ہے۔ بہت سارے فنی ماہرین اور ہنر مند موجود ہیں۔ اب میں موضوع کے مواد کے حوالے سے تکنیکی مواد پر گفتگو کرتا ہوں۔ مگر اس سے قبل اس وقت کے قوانین اور سوسائٹی کا ذکر ضروری ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں اقلیتی گروپوں نے جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہر ذی روح جو بھی دنیا میں آتا ہے، اس کے پاس کوئی نمایاں قابلیت بھی نہیں ہوتی۔ وہ جو کچھ بھی ہے اپنے بنیادی سیاسی حقوق رکھتا ہے۔ وہ دوسرے شہری کی حیثیت سے نام نہاد حقوق کا حامل ہوتا ہے۔ مگر اب میں دعوئی سے کہتا ہوں کہ وہی حقوق سب کے ہیں اور سب کے لیے ہیں جو اس عہد میں موجود لوگ استعمال کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ جو قبول اور مسترد کر دینے کے حقوق اور اختیار قابلِ مذمت جانے جاتے

تھے ابتدا میں یہ نظریہ اور مسئلہ چند افراد کے ہاتھ میں تھا۔ بعد میں اس پر عمل کرنے لگے اور ان کے نفاذ کا تقاضا اور اصرار کرنے لگے۔ پوری انیسویں صدی کے دوران عوام میں حقوق حاصل کرنے کا جذبہ ان کا آدرش بن گیا۔ لیکن یہ حقوق حاصل کرنے کا جذبہ ان کے اندر غیر محسوس تھا اور نہ ہی اپنے حقوق کو حاصل کرنے کا حق استعمال کرتے تھے۔ لیکن جمہوری قانون سازی میں انھیں احساس ہوا جیسے پرانی راج شاہی میں وہ اپنے آپ کو "عوام" ہی کہتے تھے اور اب بھی وہ "عوام" ہیں۔ وقت کے تقاضوں نے اور ان کے اپنے اندر کے فطری تقاضوں نے انھیں احساس دلایا اور یہ احساس لاشعوری طور پر تھا کہ وہ تو مقتدر اعلیٰ ہیں۔ آج یہ ان کا مثالی نظریہ ہر فرد کے دل کی دھڑکن بن چکا ہے۔ قانون سازی جو اعلیٰ عوامی زندگی کا قالب ہوتا ہے' کا دوسرا نام عوامی اکثریت ہے۔ اس کے خیالات رجعت پسندانہ ہوں یا جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں' میں اسے دوسرے دور میں پیش کرتا ہوں۔ وہ لوگ جب ان اداروں پر بلوے کرتے ہیں جن سے ان کے حقوق پاس ہوتے ہیں' میرے نزدیک جو اس صورت حال کو محسوس نہیں کرتا وہ کبھی حالات اور واقعات کی نزاکت کو سمجھ نہیں سکتا۔ جن واقعات اور حالات کا آغاز ہو چکا ہے' لوگوں اور غیر تعلیم یافتہ افراد کو از روئے نسل' قبیلہ اور گروہ کے ورثہ میں ملی ہوئی اس صورت حال کو ایک اوسط درجہ کا فرد اپنی منظوری آپ ہی حاصل کر چکا ہے۔ اس شہرت اور ناموری کو مثالی حقیقت سے منسوب کیا جاتا ہے۔ جمہوریت میں مساوات کے مطالبات نے مثالی اصولوں کو جبلی مسرت میں تبدیل کر دیا ہے۔

عام فرد کے حقوق کے اعلامیہ کے بعد تاریخ کے موجودہ حالات میں مثالی حقیقت کے یہ معنی ہوئے کہ ذی جس فرد کی باطنی غلام یا شی کی جگہ اس کے دل میں آقا کے پودے لگائے جائیں اور وہ پرورش پائیں۔ گویا اوسط درجہ کے آدمی کو محسوس کرنا چاہیے کہ وہ خود ہی خود کا حاکم ہے۔ اب اس کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ کیوں تیس سال قبل شکایات کا انبار کیوں لگاتے تھے؟ یا بچوں کی طرح کسی چیز کے حصول کے لیے روتے تھے۔ تم ایک عام آدمی کو اپنا حاکم اگر وہ خود کے لیے ایسا عمل کرتا ہے کہ جس سے ساری خوشیاں خود سمیٹنا چاہتا ہے اور دوسرے کی خدمت سے انکاری ہے صرف اپنی ذات کو تسلیم کرتا ہے تو بہت خوب حالانکہ یہی ساری چیز اپنے آقا کے لیے مخصوص کرتا تھا اور آج ہر فرد اس کا خواہش مند ہے اور اس میں یہ خصوصیات اور خوشیاں بدرجہ اتم موجود ہیں کہ آج کی موجودہ صورت حال کے حوالے سے دیکھیں تو ایک عام آدمی کی زندگی بھی ماضی کے اشرافیہ کے سانچے میں ڈھل چکی ہے یعنی آج کا عام فرد ماضی کے تمام افراد کی ماضی کی نمائندگی کی تاریخ ہے۔ جس طرح سطح سمندر کو جغرافیہ کہا جاتا ہے۔ آج کا عام فرد اور ماضی کی تعریف کی اشرافیہ کے سماج اور معاشرت میں کوئی فرق نظر نہ آئے گا۔ تاریخ کی سطح بھی اچانک اس طرح بلند ہو جاتی ہے جس طرح کوئی چیز زمین

کے نیچے سے مستعدی کے ساتھ سطح زمین پر آ جاتی ہے اور ہم اسے دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ایک بندش کے بعد بیدار ہو جاتے ہیں' پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی بھی بلند تر سطح کو چھو رہی ہے۔ آج کی زندگی میں ایک فرد راحت اور تسکین سے آگے بڑھتا ہے بلکہ اب تو وہ اپنی مرضی بھی مسلط کرتا ہے۔ حال و مستقبل میں ہر اچھی بری چیز کی جڑیں تاریخ کی سطح کو بلند کر دیتی ہیں۔ اب یہاں پر ایک نظری مشاہدہ ہے جو ماضی میں نہ تھا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آج کے عام آدمی کی زندگی کی سطح ماضی کی اقلیتوں کی طرح ہے اور یہ کہ وہ اپنی نمائندگی آپ کرتا ہے۔ یورپ کی تاریخ میں ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا ہے جبکہ امریکا میں یہی حقیقت فطری ہے اور "آئینی" حقیقت کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ ہمیں اس نکتہ نظر پر غور کرنا ہے کہ "فرد کا نفسیاتی طور پر خود کو اپنا آقا اور حاکم کا احساس کرنا کہ وہ ہر فرد کے ساتھ برابری کا روادار ہے" یورپ میں اکثریتی افراد نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے اور وہ کامیاب ہو گئے ہیں اور امریکا عملی طور پر ہمیشہ سے ہے۔ مگر اس فطری خصوصیت کا مظہر اٹھارویں صدی میں ہوتا ہے۔ پھر اتفاقی مطابقت اور انوکھا مشاہدہ یہ ہے کہ جب یورپ میں یہ نفسیاتی کیفیت آشکارا ہوئی عام فرد کی سطح زندگی بلند ہوئی۔ زندگی کے اخلاقیات اور طرز زندگی نے ایک نیا رخ لیا تو کہا گیا "یورپ امریکی طور طریقے اپنا رہا ہے" جن لوگوں نے یہ کہا وہ چیزوں کی چمک دمک سے دھوکا کھا گئے اور سمجھے کہ رسم و رواج اور فیشن میں تبدیلی سے یہ انقلاب آیا ہے جو حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ میں اس سے اختلاف کرتا ہوں۔ میں جوانمردی اور ہمت سے سمندر پار بھائیوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ نہ تو یورپ نے امریکی طور طریقے اپنائے نہ یورپی ان کے اثر میں آئے اور نہ ہی کسی جہت سے امریکی ہوئے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ صرف اتنا ہے کہ صداقت اور جوانمردی کی آمیزش ہو گئی ہے جو مروجہ اور عام ہونی چاہیے۔ البتہ اب اس کا آغاز ہو رہا ہے۔ زمانہ حال میں گل بوٹوں کا جوہر کھل نہیں رہا ہے کیونکہ تاحال وہ رونما نہیں ہو پائے اور جھوٹے خیالات کا ایک الاؤ ہے جس نے دونوں گروپوں کی مت مار دی ہے۔ یورپ میں عوام کی فتح و کامرانی ان کے اندرونی اسباب کی مرہون منت ہے (اس فطری عمل کو بغاوت نہ کہا جائے) کثرت افراد نے تعلیم و ترقی اور سوسائٹی میں اپنے مرتبہ و مقام کا حصول' معیشت کی ترقی اور اصلاح کے میدان میں یورپی عوام نے دو صدیاں صرف کر دی ہیں چونکہ دو صدیوں کی محنت کا نتیجہ امریکی زندگی کے ساتھ نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اس اتفاقی مطابقت سے یورپی اور امریکی عوام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یہ تاثر اچانک اور پہلی بار رونما ہوا۔ اس سے قبل یہ دونوں عوام کے لیے سربستہ راز تھے۔ درحقیقت یہ ایک الٹا "بہاؤ" ہے جو معاملے کو مشکوک بناتا ہے۔ خاص کر برابری کی سطح کو یورپ والوں نے مشکوک نظروں سے دیکھا ہے کیونکہ امریکی عوام کی سطح بلند تر ہے۔ یورپ کو اس کا ادراک

تھا اور اسی ادراک کے باعث شدت سے انھوں نے محسوس کیا۔ جس حقیقت نے اس خیال کو ہوا دی اور پختہ کیا اس حقیقت اور اسباب کا جائزہ لینا ضروری ہے یا پھر اسے چیلنج کی بجائے تسلیم کیا جائے۔ یہ کہ مستقبل امریکا کا ہے۔ جس چیز کی جڑیں زمین کے اندر مضبوط اور وسیع ہوں وہ طوفان اور جھکڑوں سے نہیں گرا کرتے۔ خیابان کی ہوا میں جڑیں نہیں ہوتیں کہ وہ قائم و دائم رہے۔ امریکا میں درمیانے درجے کی سطح زندگی کی بلندی کا احساس موجود ہے۔ جبکہ یورپ میں نچلے درجہ کی سطح کی بلندی کا تقابلی جائزہ منتخب اقلیتوں میں پایا جاتا ہے۔

ہم ایک مساوی سطح زندگی کے عہد میں رہ رہے ہیں۔ جس میں قسمت کی سطح مختلف سماجی طبقات میں ثقافتی سطح اور امتیازات کا ماحاصل ہے۔ جس میں ان کی تقسیم ہر دو معاشروں میں ہوتی ہے۔ یہی اصول براعظموں کی سطح زندگی کے تجزیہ میں کام آتا ہے۔ چونکہ یورپ پہلے نچلی سطح پر تھا اس نے فائدہ اٹھایا اور سطح بلند ہوئی اور یہی سطح عوامی بغاوت کے امکانات محالات کی دلیل ہے۔ یورپ کے بارے میں جو شنید ہے یورپ اس کے برعکس ہے۔ اس کا معاشرہ ایک بھونڈے پن کا اظہار ہے۔ نہیں پتا چلتا کہ یہ دلیل اور حوالہ کس کے بارے میں ہے۔ ریاستوں کے بارے میں یا یورپی ثقافت یا یورپ کی نہایت ہی اہم اور ضروری سرگرمیوں کے بارے میں ہے۔ یورپی کلچر کے بارے میں ہم نے پہلے بتا دیا ہے، ضرورت پڑی تو مزید بعد میں بتائیں گے۔ مگر جہاں تک اس کی اہمیت کا تعلق ہے صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ ہم مجموعی طور پر یکسانیت میں زندہ رہ رہے ہیں۔ البتہ میں اس کا رخ بدل کر اپنا نقطہ نظر پیش کرتا ہوں کہ آج کا عام اٹالین، جرمنی، ہسپانوی، شمالی امریکہ یا ارجنٹائنی تیس سال سے مختلف ہے۔ اس کی بودوباش اور طرز زندگی مختلف ہے۔

باب -۳

وقت کا ارتقاع

یہ ایک حقیقت ہے کہ جمہور کی حکمرانی تاریخ کی سطح کی بلندی مزید بلند کرتی ہے۔ نیز اور بلندی پر لے جانے کے لیے متحرک رہتی ہے اور یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کی آج کی درمیانے درجے کی سطح کی بلندی کی موجودگی نے اس کے گذشتہ کل سے آج برتر اور مزید بلندی کا سفر شروع کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی میں ارتقائی مد و جزر جاری رہتا ہے۔ اس نظریہ اور نقطہ پر گہرے ادراک کی ضرورت ہے کیونکہ اکثر لوگ ہمارے وقت کے ارتقاع کو دہرانے کی مشق کرتے رہتے ہیں۔ جو ایک احمقانہ سوچ ہے۔ یہاں پر ہمیں نہایت گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے کہ مذکورہ نقطہ اور نظریہ نے ہمارے عہد کی حیرت انگیز خصوصیات کو ہی سامنے کیوں رکھا اور انہیں خصوصیات کے ذرائع کو ایک مضبوط بنیاد قائم کرنے کی پیش کش کیوں کی؟

مثال کے طور پر اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں مسئلہ فلاں وقت کے ارتقاع کے لیے مناسب نہیں ہے۔ دراصل علم تاریخ کا یہی نظریہ پیچیدہ واقع ہوا ہے لیکن انسانی تاریخ میں ہی ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ انسانی تاریخ پکار اٹھتی ہے کہ "ہمارے وقت" کا ارتقاء ہمیشہ سچ اور حقیقت کو ثابت کرتا ہے۔ گویا کل کے مقابلہ میں آج زیادہ سچ ثابت ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نے اپنے ارتقاع کی سطح کو ہمیشہ رو بہ عروج اور ہموار رکھا ہے۔ "اخلاقی پستی" کا لفظ جو اپنے اندر گراوٹ اور زوال پذیری کے مفہوم کو سموئے ہوئے ہے۔ اس کے آغاز کے ساتھ ہی اس کا وجدان بھی ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے خود فرد ہی کم یا زیادہ احساس کے ساتھ واضح طور پر ادراک کر لیتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں جو بھی کیا وقت کے ساتھ کیا نسبت تھی یا تھی ہی نہیں اگر تھی تو کیا تھی اور کتنی تھی؟ اور اب کی صورت حال بھی محسوس کرتا ہے اور ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اپنی ذات کا احساس کرتے ہیں جس طرح کوئی شخص تباہ شدہ جہاز سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔ موجودہ وقت میں

مستعمل چیزوں کی حرکات و سکنات اور رفتار کا انحصار طاقت و توانائی پر ہے یہی چیز یا یہی سبب ہے۔ جو انسان کے قدیم طرز زندگی کے سانچہ میں بے چینی کا سبب بنتی ہے اور یہی بے چینی اس کی نبض اور عصر کی نبض کی رفتار کا درمیانی فرق یا فاصلہ ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص وقت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ اصل طور طریقوں سے ناطہ جوڑ لیتا ہے۔ خوشگوار زندگی گزارتا ہے کیونکہ ماضی اور حال کے اوقات کی سطح کے باہمی تعلقات سے وہ شعوری طور پر آگاہ ہوتا ہے۔ وہ تعلق کیا ہے؟

یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ فرد اپنے ماضی کے بارے میں کسی خاص عصر میں سوچتا ہے۔ یہ نظریہ اس لیے بھی درست نہیں ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا ماضی اس کی موجودہ سطح سے نیچے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ماضی آخر ماضی ہی ہوتا ہے اور اس نظریے کی مخالفت میں اتنا ہی سوچنا کافی ہے جیسے "جارج مانیک" نے خوبصورت الفاظ میں پیش کیا ہے۔ "جو وقت گزر جائے وہ اچھا ہوتا ہے" اس کے باوجود یہ نظریہ صداقت سے ذرا ہٹ کر ہے کیونکہ اس میں قنوطیت ہے۔ ہر کسی عصر نے خود کو ماضی کے مقابلہ میں نہ تو برتر جانا ہے اور نہ ہی کمتر سمجھتا ہے۔ مگر مفکروں اور تاریخ نویسوں نے اس حقیقت اور شہادت کے جائزہ کی اور تجزیہ کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ "جارج مانیک" کا نکتہ میرے نزدیک بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخی زمانوں نے اپنے وقت پر کوئی توجہ نہیں دی اور نہ ہی انھوں نے اپنے آپ کو پیشرو زمانوں پر برتر سمجھا۔ اس کے برعکس تاریک ماضی میں بھی لوگ اپنے سنہرے دور کے سنہرے خواب دیکھا کرتے تھے۔ جیسے "یونانیوں" نے سنہرے خواب دیکھے اور "رومیوں" نے ان کے خوابوں کی تعبیر کر دی اور اسی طرح آسٹریلوی آلکرمیکا کی مثال قابل غور ہے۔ یہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ وہ افراد جو اپنی نبض کی رفتار کو محسوس نہیں کرتے ان کی زندگی میں زور دار سوچنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور ان کے خون کا بہاؤ بھی تیز ہونے کے قابل نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے حال کے مقابلے میں ماضی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس طرح وہ اپنے ماضی کے حوالے سے غیر شعوری طور پر اپنی بھرپور زندگی گزارنے کا احساس پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح جب وہ اپنے ماضی کی عظیم قدر و منزلت کو ذہن میں لاتے ہیں تو وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ انھیں اپنے اچھے ماضی پر کوئی غلبہ یا اختیار حاصل نہ تھا۔ لیکن اس کے برعکس اگر اس میں اس اعلیٰ مقام کے درجے سے نیچے گر جانے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے موسم کا درجہ حرارت کبھی بڑھتا ہے کبھی گھٹتا ہے تو گویا وہ فہم و فراست اور ادراک رکھتا ہے۔ تو شاید ایسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کا ماضی کا عصر اس کے حال کے زمانہ سے برتر نہ تھا۔ کیونکہ اس عصر میں اس کو زیادہ توانائی اور طاقت حاصل ہوتی ہے۔ ۱۵۰ء سے لے کر اس عارضی زندگی کے سکڑنے تک وہ اپنی پوزیشن اور نبض کی رفتار میں کبھی

تیزی اور کبھی مندے کا رجحان محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت "روما" میں اس تصور نے کس طرح حقیقت کا روپ دھارا اس واقع کے رونما ہونے سے قبل ہوویس نے گایا تھا۔

ترجمہ: ہمارے باپ دادا پرداووں سے زیادہ پاجی اور نکمے تھے جنھوں نے ہمیں پیدا کیا اور جو ان سے بھی زیادہ نکمے ہیں اور ہم بھی ایک نسل کو جنم دیں گے جو ہم سے بھی زیادہ انحطاط پذیر ہوں گے۔

(اوڈز III-4)

اس کے دو صدی بعد سلطنت "روما" میں اٹلی نژاد مردوں کی تعداد کم پڑ گئی۔ انھوں نے جرأت مند اور جوانمرد کی اسامی پر کرنے کے لیے ایک ڈلماشی مرد کی خدمات کرائے پر حاصل کی تھیں اور اس کے بعد وہ کافی عرصہ تک رائن ڈینوب کے بربری باشندوں کی خدمات حاصل کر کے وقت گزارتے رہے۔ اٹلی کی آبادی میں شدید کمی آ گئی۔ عورتیں بانجھ ہو چکی تھیں۔

اب ہم تاریخ کے ایک دوسرے قرن کی طرف اپنا رخ کرتے ہیں۔ جس کے حیرت انگیز تصور سے آپ زیادہ لطف اندوز ہوں گے اور بظاہر آخری نقطہ کے خلاف نظر آتا ہے اور ہمارے عصر میں طلب آگہی کا تجسس بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ جس کی حد بندی اور وضاحت ضروری ہے کہ تیس سال قبل سیاست دان اپنے اپنے اجتماعات میں جوشیلی تقریریں کرنے کے عادی بن چکے تھے۔ ان کا وطیرہ بن گیا تھا کہ حکومت کی پالیسی اور ہر اقدام کی مخالفت کریں گے۔ حکومت کے ناروا سلوک و زیادتیوں پر پتھروں کی بارش کرتے تھے اور دلیلیں دیتے کہ حکومت کے تمام اقدامات اور کوششیں قبل از وقت ہیں اور یہ کہ حکومت نااہل ہے۔ آپ کو میں سچا اور حقیقی واقعہ سناتا ہوں اور یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہم نے گراجن کے اس نکتہ کو معلوم کر لیا ہے۔ جس کا ذکر اس نے پلینی کو لکھے جانے والے خط میں کیا تھا۔ اس نے اسے نصیحت کی تھی کہ گمنام اور مبہم الزامات کی بنیاد پر "نیس نوستری سائیکی ایسٹ عیسائیوں" کو سزائیں نہ دے۔ اس واقعہ کے علاوہ بھی تاریخ کے بے شمار عصروں میں اسے واقعات کے حوالے سے بہت سارے شواہد ملتے ہیں۔ جنھوں نے تاریخ کے صفحات پر اپنے اپنے عصروں میں کارناموں، عظمتوں، بلندیوں اور عظیم کارناموں کے نقوش چھوڑے ہیں اور رخصت ہو گئے ہیں۔ ان کے ان گہرے نقوش اور خیالات سے یہ مفہوم نکالا جاتا ہے کہ ان کا میر کارواں آگیا ہے اور ان کا رخت سفر باندھنے کا وقت آگیا اور اپنی دیرینہ تمناؤں کو پورا کر گئے کیونکہ ان کی امید کے سوتے جاگ اٹھے تھے اور ان کے "وقت کی شکم سیری" ہو چکی تھی کیونکہ یہ ایک تاریخی عمل ہے اور تاریخی زندگی کی پختہ کاری ہے۔ اس کے علاوہ آپ پوری عوام کی مثال لیں تیس سال قبل ان کا خیال

تھا بلکہ ان کا یقین اور ایمان تھا کہ انسانی زندگی جیسا کہ فی الواقع ہونی چاہیے تھی جس کے لیے ماضی کی کئی نسلوں نے تمنا کی تھی۔ اب ہم حاصل کر چکے ہیں یہ ان کا ایمان اور یقین ہو چکا تھا نیز جو ماضی کی تاریخ کے پاس تھا وہ انھوں نے مستقبل کی نسلوں کی امانت سمجھ کر ان کے سپرد کر دیا ہے۔ وہ اس طرح کہ تاریخ کے ہر زمانے میں اپنی ذات یعنی خود کا بھی احترام و تعظیم کرتے تھے اور عوام کی خواہشوں، تمناؤں اور عزت نفس کا خیال رکھتے تھے۔ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ ابتدائی ادوار میں بھی اور اس کے بعد بھی ایسے خیر خواہوں سے عوام نے فیضان حاصل کیا اور اسے جاری و ساری رکھا ہے۔ وہ اس وقت تک خود کو کمتر سمجھتے رہے جب تک باغوں میں پھول نہیں کھلے تھے۔ ان کی سطح بلندی کو دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے کہ اس ابتدائی عہد نے مجھ پر اصل حقیقت کا راز کھول دیا ہے اور اس وقت کے عوام کی زندگی مکاری اور فریبوں کے درمیان گھومتی تھی۔ جن کی حقیقتوں اور سچائیوں کو نہ ہی محسوس کرتے اور نہ ہی گوارہ کرتے اور وہ بیچارے اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے غیر مطمئن نظر آتے اور اپنے کو کمتر اور نصیبوں کے مارے عوام یہ سمجھتے کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ "اشتیاق اور حقیقت کے درمیان انھیں سکون نہ تھا۔ بالکل اسی طرح انیسوین صدی کے کلاسیکل عہد پر نظر ڈالیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ ان پر بھی ایک عصر آیا تھا کہ عمر رسیدہ لوگ بول اٹھے کہ ان کی خواہشوں کی تکمیل کا وقت آ گیا ہے۔ جس وقت میں حقیقت نے ان کو قبول کرنا تھا۔ تسلیم کرنا تھا اور اسے ان کے تابع کرنا تھا اور یوں ہم ارتقاع کی اس سطح پر پہنچ جاتے ہیں۔ جس کے بارے میں ہم نے پہلے سے ہی سوچ رکھا تھا اور پھر وہ لوگ یہ کہنے لگے کہ یہ بھی تو ہمارے دل میں تھا۔ یہ بھی ہماری تمنا اور خواہش تھی۔ ان کا یہ خیال اور مقصد ہمارے مستقبل کی غمازی کرے گا جو ہمارے مستقبل کا نقطہ عروج ہو گا اور یہ کہ "ابھی نہیں" اور "بالآخر" اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اپنے وقت کے بارے میں ہمارے بزرگوں کا بھی وہی خیال تھا جو ان کے آباؤ اجداد اپنے وقت سے متعلق رکھتے تھے۔ اور وہ اس صدی کے ایسے وقت کے بارے میں بھی رکھتے تھے اور ان کے اس اصولی خیال کو ہمیں بھولنا نہیں چاہیے۔ ہمارا وقت ہمارا وقت ہے جو تاریخ کے کئی ادوار کی پیروی کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ فرد جو زندگی کے ایک دوسرے کنارے پر رہائش پذیر ہے وہ ماضی کی تاریخ کے اس زمانہ میں کلی طور پر رہتا ہے جو ہر چیز کو کلی طور پر اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے تو یقیناً" وہ ہمارے عہد کو مغالطہ آمیز بصری تاثر سے دیکھے گا۔ یعنی زوال پذیری کی نظر سے دیکھے گا لیکن مجھ جیسا جس نے ساری عمر تاریخ کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے گزاری ہے اور وقت کی نبض کی رفتار محسوس کرنے والا ہے۔ خود کو ان گمراہ کن اور مغالطہ آمیز عکسی نظام سے کیسے دھوکے میں آ سکتا ہے۔ جس نے خیالات کی اساس اور بنیاد کئی زمانوں کے منبع سے حاصل کی ہو تو ایسے "وقتوں کی

افراط" کو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی شدید خواہش کو محسوس کرے' اپنی بے تابی اور بے چینی کو گھسیٹے۔ جو صدیوں سے ان کے چاہنے والوں کے دلوں میں چلی آ رہی ہے وہ ضروری ایک دن مطمئن ہو جاتا ہے اور گوہر مقصود پا لیتا ہے۔ درحقیقت یہ وقت کا کمال ہوتا ہے جو از خود مطمئن ہونے کا کمال پیدا کر لیتا ہے اور یہ تصور انیسویں صدی کے کلاسیکل دور میں نظر آتا ہے کہ وہ اپنی ذات سے کلی طور پر مطمئن ہے۔ مگر ہمارا احساس یہ کہتا ہے کہ جو چیزیں مطمئن نظر آتی تھیں اور اپنے گرد انھوں نے صدیوں پر محیط خود ساختہ دائرے بنا رکھے تھے وہ اپنی موت آپ مر گئے۔ مستند اور کامل اخلاقی اصول کو صرف اطمینان بخش کہہ دینے سے وہ زندہ اور قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی بات سروینٹس نے بہت کہی تھی کہ "سڑک سرائے سے ہمیشہ بہتر ہوتی ہے" جب عصر اپنی خواہشات اور مثالی خیال سے مطمئن ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے آگے کی خواہش نہیں رکھتا۔ اس کی تمناؤں کے وسیع سمندر اب خشک ہو چکے ہیں یعنی ہماری مصروف شکم سیری کی حقیقت اب ختم ہو چکی ہے یا ختم ہونے کو ہے۔ بلکہ خاتمہ ہو چکا ہے۔ اسی طرح تاریخی ادوار کی کئی صدیوں کی مثالیں موجود ہیں کہ انھوں نے اپنی ذات کے مطمئن ہونے کے باعث اپنی خواہشوں کی تجدید نو نہ کی اور وہ ختم ہو گئیں جس طرح کہ مگس نر عصرس کا سفر شروع کرنے کے بعد مر جاتا ہے۔

اس طرح ہم ایک اور حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں۔ کہ اس خود ساختہ کثرت نے ہمیشہ اپنے شعور کی گہرائیوں میں افسردگی اور رنجیدگی کو محسوس کیا اور یہ ان کی خواہش اور تمنا ان کے دلوں میں کافی عرصہ سے تصوراتی طور پر انگڑائیاں لیتی رہتی ہے۔ بالآخر انیسویں صدی میں غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس نے اس صدی کے تصور کو لفظ جدید ثقافت کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔ گویا اس صدی نے خود کو جدید ثقافت کا نام دے دیا ہے۔ یہ ایک کے موزوں اور شورش برپا کرنے والا نام ہے۔ مطلب یہ کہ اس صدی نے اپنی اپروچ پر تمام ٹیڑھے بے ڈھنگے ناموں کو خارج کر دیا۔ بڑی عاجزی اور شوق سے یہ لفظ ہمارے حال سے منطبق کرنے کی بھونڈی کوشش کی گئی یہ نام ایسے ہی ہے جیسے بے اعصاب تیر جو اپنے نشانہ پر فٹ نہیں بیٹھتا۔

کیا ہمیں اس مقام پر اپنے وقت اور اس وقت کے مابین اہم اختلاف کو بھلا نہیں دینا چاہیے۔ جو ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔ در حقیقت تاریخ کا یہ عصر خود کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا اس کے برعکس یہ اپنے فہم و ادراک کو غیر مبہم طور پر پیش نہیں کر سکا۔ جس طرح ماضی میں بھی کئی غیر معتبر وقت گزرے ہیں۔ جنھوں نے مستقبل کو ہمیشہ کے لیے یقین دہانی کرائی ہو۔ لیکن اس کی مخالفت کرنیوالوں کا خیال تھا کہ چند خود ساختہ "جدید ثقافت" کے دعویدار اور ماضی کے چند قرنوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ جو ہمیں قابل اعتماد نظر آتے ہیں۔ اور بصارت کے سکڑتے ہوئے عمل کو اٹھا کر باہر

پھینک دیتے ہیں اور اسی سوچ و فکر کے پر مسرت نقش و گمان سے متاثر ہو کر ہم تصور کرتے ہیں کہ ہم بچ نکلے ہیں۔ اور یہ کہ ان کے ساحرانہ ٹھپے کی حد بندی سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور یہ کہ ہم نے اس سے دوبارہ آزادی حاصل کر لی ہے۔ اور مزید یہ کہ ہم ان کی حقیقت کی دنیا کے ستاروں کے جھرمت سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ اور اس کی عمیق، بھیانک، لازوال اور غیر متوقع دنیا سے واپس آ چکے ہیں۔ یہاں ہر چیز، ہر کام ممکن ہے۔ اچھی اور بری تاریخ ماضی کی ثقافت کے حوالے سے ان کا نظریہ مایوس کن تھا۔ یعنی آج کے ثقافتی نظریہ کے بالکل متشابہ ہے۔ اور مسلسل اور تواتر سے آگے کو جا رہا ہے۔ یہ عقیدہ یہ خیال اور یہ نظریہ مستقبل کے لیے اس سڑک کے اس کنارے کی مانند ہے۔ جو ہمارے قدموں کے نیچے ہے یہ سڑک ایک لچکدار جیل خانہ کی مثل ہے۔ جو پھیلتی ہی جاتی ہے اور ہمیں رہائی دیتی۔ جب سلطنت کے ابتدائی دور میں بعض صوبائی سطح کے روشن خیال "لوسن یا سیکا" روم پہنچے تو انھوں نے عالی شان پر شکوہ اور سامراجی جو لازوال طاقت کی چغلی کھاتی تھیں۔ دیکھیں تو انھوں نے اس وقت اپنے دل کو سکڑتے اور بیٹھتے دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ اب اس دنیا میں اس سے بڑھ کر اور کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔ روم کی زندگی لازوال اور دائمی لگتی تھی۔ لیکن اسے کیا معلوم کہ یہاں بھی تباہی اور بربادی کا المیہ پیش آ سکتا تھا۔ یہاں سمندر کا غیر متحرک پانی عمارتوں کے اوپر پر سے گزر کر انھیں نیست و نابود کر دے گا۔ اس صوبائیت کی سوچ رکھنے والے حساس شخص نے ان کے اس ظاہری شان و شوکت کو کسی بڑے المیہ کا پیش خیمہ محسوس کیا تھا۔

اس جذباتی صورت حال کے باوجود ہمارے احساسات اس طرح کا اظہار نہیں کر رہے تھے جس طرح سکول کے بچے چھٹی کے بعد سکول سے نکلتے وقت غل غپاڑہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ بچے اس وقت ضرور شور کرتے ہیں۔ اس طرح سے تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ دنیا میں آنے والے کل میں کیا واقعہ بپا ہونے والا ہے۔ جس کے کارن ہمیں ایک پوشیدہ کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیں اس ممکن کل، محتاط فکر اور سوچ کا احساس دلاتا ہے اور جو ہمارے کل کے افق کے امکانی حالات و واقعات کے دروازے وا کرتا ہے جو ہماری مستند زندگی کی نوید سناتا ہے اور ہماری موجودگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یہ جائزہ ہمیں دوسرے پہلو سے بھی باخبر رکھتا ہے۔ جس کی صداقت یہ ہے کہ یہ تشخیص اور جائزہ دوام پذیر فریادوں کے افق کی راہوں کے برعکس ہے۔ جس کے بارے میں ہمارے معاصر ادیبوں اور لکھاریوں نے ان کے غموں، دکھوں اور مشکلات سے متعلق لاکھوں صفحات سیاہ کر دیے ہیں۔ اس کی موجودگی فریب ہے جو کثرت اسباب سے پیدا ہوئی ہے۔ مگر اسے میں کسی دوسرے وقت پر بیان کروں گا۔ یہاں پر میں ایک اہم نقطہ کو بیان کرتا ہوں جو اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص جو کسی ایک نظریہ کا فرض ہر آدمی میں قائم اور اٹل ہوتا ہے۔ میرے

نزدیک قصہ پارینہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے صرف تاریخ کے سیاسی اور ثقافتی پہلوؤں کو من و عن تسلیم کر لیا ہے اور وہ اپنی اسی ہٹ دھرمی پر قائم رہے گا اور وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ تاریخ کی بالائی سطح اس سے زیادہ بھی ہوتی ہے اور تاریخ کی حقیقت کے اور بھی گہرے اور ترجیحی پہلو ہوتے ہیں جو حیاتیاتی قوت کی حیات پذیری میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس سے فرد کو کائناتی طاقت اور توانائی حاصل ہوتی ہے نہ کہ بعینہ بلکہ مضبوط طاقت سے متعلق ہوتا ہے جو سمندر میں ہلچل پیدا کر کے درندہ صفت جانور کو رحم دل بنا دیتا ہے اور جس سے درختوں پر پھل کھلتے ہیں' ستاروں میں روشنی آتی ہے اور چمک دمک پیدا ہوتی ہے۔

اس قنوطیت کے جائزہ کو متوازی کرنے کے لیے میں ذیلی نقطہ تجویز کرتا ہوں کہ زوال پذیری اور لازوال پذیری دونوں ایک دوسرے کے مخالف نظریے ہیں مگر ان دونوں کے متبادل نظریات بھی ہیں۔ اسی طرح انحطاط پذیری بھی بلاشبہ اوپر نیچے کی حالت کو بیان کرنے والا ایک نظریہ ہے۔ مگر ہمارا تقابلی جائزہ اہم نقاط کے مختلف اختلافی اور تصوراتی خیال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ عوامی وکلاء کے نزدیک یہ دنیا زوال پذیر ہے اور عوامی وکلاء میں اس وقت حساس صورت حال سے پردہ ہٹا سکتے ہیں۔ دوسروں کا نکتہ نظر بھی ممکن ہے اہم اور قابل قبول ہو مگر میں ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ ان میں سے کوئی نظریہ بھی جانبداری کی تلوار سے بچ نہیں سکتا اور جو ہم اس مضمون میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ کوئی فرد بھی اپنی مرضی اس پر مسلط نہیں کر سکتا۔ یہی صرف ایک نقطہ نظر ہے جو فطرت اور انصاف پر مبنی ہے۔ جس کے ذریعہ دونوں کی زندگی کے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے اور یہ جائزہ لیا جائے گا کہ اگر یہ خود زوال پذیری محسوس کرتا ہے اور یہ کہ یہ نظریہ کہیں جذبوں اور عزم سے عاری تو نہیں' کمزور تو نہیں؟ اس کے باوجود ہم اس کے اندر کا جائزہ لیں گے تو ہم پر واضح ہو جائے گا اور زندگی خود محسوس کرے گی کہ آیا وہ زوال پذیر ہے یا نہیں؟ میرے نزدیک زندگی میں اپنا جائزہ آپ اور فیصلہ کن علامت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ ماضی کے کسی عصر نے ایک کی زندگی کو دوسرے کی زندگی پر فوقیت اور اہمیت نہیں دی اس لیے وہ صرف اپنی زندگی کی موجودگی کا احساس دے دیا کرتے ہیں۔ یہ نظریہ کوئی کائناتی نظریہ نہیں ہے۔ یہ وہی نظریہ ہے جس پر بحث کر کے آ رہا ہوں اور اس کے نتیجے میں میں نے یہ اخذ کیا ہے کہ ہمارا وقت اس صورت حال کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے تاریخ میں سنسنی خیزی اور بے مثل طور پر درج کیا جائے گا۔

گذشتہ صدی میں عوامی اجتماعات میں کی جانے والی بحث کے نتائج سے بظاہر ہم اس خاص نتیجے پر پہنچے ہیں۔ جہاں خواتین اور ان کے مطیع شعراء ایک دوسرے سے صرف یہی سوال کرتے ہیں کہ آپ تاریخ کے کس حصے میں زندگی گزارنا پسند فرمائیں گے تو ہر کوئی اپنی مرضی کے مطابق اپنی

ذات اور خوشگوار زندگی کو تاریخی حوالہ بنانے کے لیے تاریخ کی تصوراتی زندگی پر تحقیق کرے گا۔ جائزہ لے گا۔ پھر تاریخ کے کسی اچھے عصر کا جائزہ لے گا کہ وہ ماضی کے فلاں دور میں رہنا پسند کرے گا کیونکہ تاریخ کا وہ دور اسے اچھا لگتا ہے یا وہ خوشگوار زندگی گزارنے کے قابل تھا جس کا تصور وہ آج کر سکتا ہے۔ اس کا جواز وہ یہ پیش کرے گا کہ اس نے یہ فیصلہ خود کیا ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کثرت کا فیصلہ ہے۔ اس پر انیسویں صدی بھی خاموش ہے جو اب ماضی ہی بن چکی ہے اور جس کے کندھوں پر بیٹھ کر ہم ماضی کی زوال پذیری کو دیکھتے ہیں۔ لیکن ماضی کے ان بکھرے اور منتشر خیالات کے باوجود ماضی کے ان ادوار کو "کلاسیک" قرار دیا جاتا ہے مگر ہم اس کو "نشاۃ ثانیہ" کہتے ہیں۔ جس کی قدریں ہمارے آج کے لیے تیار کی گئی ہیں۔ بس یہی وجہ اور یہی جواز کافی ہے کہ ماضی کے ایسے کثرتی ادوار نے شک و شبہ کی گنجایش پیدا کر رکھی ہے۔ انھوں نے اپنی نظروں کو ماضی کے اندھے کنوئیں میں گاڑا ہوا ہے۔ جسے وہ خود کی بھرپور زندگی تسلیم کرتے ہیں۔

آج اگر یہی سوال کسی نمائندہ شخص سے پوچھا جائے تو وہ اس کا سنجیدگی سے کیا جواب دے گا؟ میرے خیال میں اس سوال پر کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔ چند افراد کو چھوڑ کر جس نے یہ نہ کہا ہو کہ "اس وقت سے ماضی کا وہ عصر زیادہ اچھا تھا جس میں لوگوں نے سکھ کی زندگی گزاری تھی" اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج کا فرد یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی آج کی زندگی اس کے ماضی کی زندگی سے کئی ہزار درجہ بہتر ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ماضی کے وقت کی کیفیت اصل انسانیت کے مقابلہ میں نہایت ہی تنگ نظر اور بہت ہی چھوٹی تھی۔ اسی طرح اس وجدان کو اگر آج کے احساس اور موجودگی کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ آج کے لوگ ان کی کائناتی فوقیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ باطل قرار دیتے ہیں۔ جنھوں نے اس پر پوری سوچ بچار کر کے اور احتیاط کر کے فیصلہ صادر نہیں کیا۔ اس چیز کی ابتدا کرتے ہوئے ہماری آج کی زندگی خود سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتی ہے کہ وہ ماضی کی زندگی سے کہیں زیادہ بہتر اور برتر زندگی ہے اور زیادہ وسیع و عریض ہے تو پھر یہ خود کا زوال پذیری کے ساتھ کیسے رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس معاملہ کچھ یوں ہے کہ وہ صرف اپنی بھرپور زندگی کے تعلق سے اس نے اپنے ماضی کے بارے میں قدر و قیمت کو ضائع یا فراموش کر دیا ہے۔ اسی بناء پر ہم پہلی بار آپ کو ایسے عہد سے ملاتے ہیں جو تمام قرنوں کو کلاسیک بنا دیتا ہے۔ جو "نہیں" میں یہ شناخت کرواتا ہے کہ ماضی کا یہ یا وہ دور امکان کی حد تک معیاری اور بے مثل ہے اور جس کے باعث اس کا ارتقائی سفر کسی وقفہ کے بغیر بھی جاری و ساری رہتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ ایک نئی صبح' ایک نئے دن کا آغاز' اور ایک بھرپور تاثر کی نوید دیتا ہے اور پھر جب ہم ماضی کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو یہی "نشاۃ ثانیہ" خود ہی ہم پر صوبائیت کی تنگ نظری اور بے ثمر جذبوں سے

آشنائی کراتی ہے۔ تو پھر وہ یہ لفظ "معمول یا عام" کیوں استعمال نہیں کرتی۔

کچھ عرصہ قبل میں نے اس صورت حال کا تجزیہ کے طور پر خلاصہ کچھ یوں پیش کیا۔
"ماضی اور حال کا ترک تعلق ہمارے وقت کی جنسی حقیقت ہے اور اس میں شک و شبہ کا سبب بھی ایک مبہم شکل میں موجود ہے جو ہمارے حال کی خصوصیات میں گھپلا پیدا کرنے میں معاون ہے۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں اس قطعہ ارضی پر تن تنہا چھوڑ دیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ مرنے والا تو مر گیا لیکن افسوس کہ بھرپور انداز میں نہیں مرا وہ اب کسی طرح ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ اس کا رسمی جذبہ بھی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے۔ اس کا اصول' نمونہ' قاعدہ اور معیار ہمارے کسی کام نہیں آ سکے۔ ہمیں اپنے تمام مسائل اور معاملات تمام واقعیت کے پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر خود کو حل کرنا چاہیے' خواہ وہ مسئلہ فنون لطیفہ' سائنس یا فلسفہ کا ہی کیوں نہ ہو۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے سارے یورپ نے اپنا ایک نقطہ قائم کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کے اس نظریے کا کوئی ہمزاد نہیں ہے جس طرح "پیڑ۔شلمل" نے اپنی پرچھائیں کو گم کر دیا ہے۔

تو ہمارے اس لفظ "وقت کا ارتقاع" میں کیا راز پوشیدہ ہے؟ کیا یہ وقت کی لبریزیت اور بھرپور ہونے کے تقاضے پورے نہیں کرتا؟ اس کے باوجود میں تمام عصروں کے وقتوں سے اور ان کی تمام معلوم لبریزی سے خود کو بدتر اور اعلیٰ سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس قومی تاثر نے جو ہم میں احساسات اور ضمیر کو بیدار کیا ہے اس کا اظہار کرنا بھی اتنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن ہمارے عہد کے وقت کی بڑی خوبی یہی تو ہے کہ اس نے قومی اثرات احساسات اور باضمیر جذبوں کو پیدا کیا اور یہ کہ دوسرے تمام اصولوں' نظریوں پر بھاری اور فوقیت رکھتا ہے اور اب اسی وقت نے از خود یہ بھی محسوس کر لیا ہے کہ یہ تو ابھی ابتدائے عشق ہے۔ آگے آگے دیکھیے انجام کیا ہو گا؟ اس کے بارے میں ہمارا تاثر کیا سامنے آتا ہے؟ یہی نان کہ ہمارے عہد کا وقت دوسرے زمانوں کے وقت پر فضیلت' فوقیت رکھتا ہے۔ اعلیٰ و ارفع ہے جو بلاشبہ مضبوط اور طاقتور ہے اور جو یکساں طور پر اپنے مقدر کا شاکی ہے۔ اس کے باوجود بھی اپنی مضبوطی پر فخر کرتا ہے اور نازاں ہے۔ نیز اس کے قہر سے خوفزدہ بھی ہے۔

باب - ۴

زندگی کی افزونی

جمہور کی حکمرانی اور اس سے ظاہر ہونے والے وقت کی بلندی اور سطح میں اضافہ اپنے طور پر مزید مکمل اور عام حقیقت کی علامتیں ہیں۔ یہ حقیقت اپنی برہنہ اور سادہ سچائی میں ہفت رنگی اور ناقابل یقین ہے۔ یوں لگتا ہے دنیا اچانک وسیع ہو گئی ہے اور اس دنیا میں اس کے ساتھ زندگی بھی پھیل گئی ہے۔ درحقیقت زندگی اپنے کردار میں عالمگیر ہو گئی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آج کے عام آدمی کے لیے اس کی زندگی میں سارا کرہ ارض شامل ہو گیا ہے۔ آج کا انسان عادتاً" ساری دنیا کے باشندے کے طور پر زندگی گزارتا ہے۔ ایک برس کچھ پہلے سیوائل میں رہنے والوں کو اخبارات کے ذریعے لمحہ بہ لمحہ یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ قطب شمالی کے قریب آباد چند افراد پر کیا گزر رہی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ اندلس کی تپتی سرزمین سے برفانی تودہ گزر رہا ہو۔ اب زمین کا کوئی قطعہ ارضی اپنی جغرافیائی حدود میں سربند نہیں بلکہ انسانی زندگی متعدد مقاصد کے لیے کرہ ارض کے دوسرے قطعات ارضی پر بھی اثرانداز ہو رہا ہے۔ اس مادی اصول کہ اشیاء کی موجودگی وہاں ہوتی ہے جہاں بھی ان کا اثر محسوس کیا جائے۔ آج کرہ ارض میں کسی بھی سکتے کو انتہائی موثر طریقے ہر جگہ موجود ہونے کی صفت سے تیقن قرار دے سکتے ہیں۔

دور کی قربت اور غائب کی شعوری نے ہر ایک فرد کی زندگی کے افق کو بے پناہ وسعت دے دی ہے اور دنیا' وقت کے نقطہ نظر سے بہت وسیع ہو گئی ہے۔ ماقبل تاریخ اور آثار قدیمہ کے علوم نے ایسے تاریخی دور دریافت کئے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسی تہذیبیں اور سلطنتیں جن کا نام بھی کبھی نہیں سنا گیا۔ ہمارے علم میں نئے براعظموں کی طرح شامل کر دی گئی ہیں اوراق مصور اور قلم کے ذریعے کائنات کے یہ دور دراز کے قصے عوام کی نظروں کے سامنے آ گئے ہیں۔ لیکن دنیا کی یہ زمانی و امکانی توسیع اپنے لیے کسی خاص بات کا اظہار نہیں کرتی۔ مادی' زماں' مکاں' کائنات کے

قطعی احمقانہ پہلو ہیں۔ لہٰذا ہمارے ہم عصروں میں محض تیز رفتاری کی پرستش' بے تحاشا عادت کے جواز میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں اس سے کافی زیادہ دلائل موجود ہیں۔ رفتار جو مکان اور وقت سے مل کر بنتی ہے وہ بھی اپنے اجزائے ترکیبی سے کم احمقانہ نہیں لیکن یہ ان کی نفی کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ انسان کا حیاتی وقت محدود ہے وہ فانی ہے۔ اسے تاخیر اور فاصلے کو تسخیر کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک غیر فانی وجود کے لیے موٹر کار کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

ایک حماقت پر دوسری حماقت ہی سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ ابنِ آدم کے لیے کائناتی مکان و زمان کی تسخیر' عزت کا سوال تھا حالانکہ زمان و مکان بے معنی ہیں اور اس حقیقت پر تعجب کرنے کی کوئی منطقی گنجائش نہیں ہے کہ ہم تیز رفتاری سے مکان کو قتل کرتے اور زمان کا گلہ گھونٹنے کا کام لیتے ہیں اور تیز رفتاری کو حرزجان بنا کر یگانہ مسرت حاصل کرتے ہیں۔ انھیں ختم کر کے انھیں زندگی دیتے ہیں ہم ان سے اہم مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ہم پہلے کی نسبت بہت زیادہ مقامات پر موجود ہو سکتے ہیں۔ زیادہ آمدورفت کا مزہ لے سکتے ہیں۔ کم حیاتی وقت میں زیادہ کائناتی وقت استعمال کر سکتے ہیں لیکن بالاخر ہماری دنیا کی بے پناہ وسعت کی اصل اہمیت اس کے حدوداربعہ کی نہیں بلکہ اس بات میں ہے دنیا میں اب بہت زیادہ چیزیں ہیں۔ ہر چیز ایسی کہ اس کی خواہش ہو' کرنے کو جی چاہے' مٹانے کو جی چاہے' اس سے ملنے کو' مزا لینے کو جی چاہے یا جو بدمزہ کرے ہر طرح سے جو کسی سرگرمی پر آمادہ کرے۔ ہماری کسی بھی عام سرگرمی پر نظر ڈالیے مثلاً" خریداری کو لیجیے اور فرض کیجیے کہ یکساں مالی حیثیت کے دو افراد ہیں ایک ہمارے دور کا' اور ایک اٹھارویں صدی کا۔ اب ان اشیا کا تصور کیجیے جو ان دونوں کی خریداری کے لیے موجود ہیں۔ فرق دیکھیے اور حیران رہ جایئے۔ آج کے خریدار کے لیے اشیاء کی وسعت لامحدود ہے۔ مشکل سے ہی کوئی چیز ایسی ہو گئی جس کا خیال کیا جا سکے اور خواہش کی جائے اور وہ بازار میں موجود نہ ہو۔ یہ بھی کہ کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں بازار میں دستیاب ہر شے کے متعلق سوچ سکے اور خرید سکے۔ مجھے بتایا گیا کہ اٹھارویں صدی عیسوی کا شخص آج کے دور سے یکساں مالی وسائل کے مالک کے مقابلہ میں زیادہ سامان خرید سکتا تھا۔ ایسا نہیں ہے۔ آج بہت زیادہ چیزیں خریدی جا سکتی ہیں اس لیے کہ تھوک پیداوار نے اشیاء کی قیمتیں کم کر دی ہیں۔ لیکن بہرحال ایسا بھی ہے تو اس کا میرے نکتہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں اس کو بہرحال مدد ملتی ہے۔ خریداری کی سرگرمی کسی خاص چیز کے انتخاب پر ختم ہوتی ہے لیکن اس میں انتخاب کرنے کا عمل شامل ہوتا ہے اور اس کے لیے بازار میں انتخاب کے لیے انواع کے سامان خریداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی اپنی خریداری کے "باب" میں بنیادی طور پر خریداری کے امکانات کے استعمال کا نام ہے۔ جب لوگ زندگی کی بات کرتے ہیں تو وہ کچھ باتیں

فراموش کر دیتے ہیں مثلاً" یہ کہ ہمارا وجود بنیادی طور پر اور ہر لمحہ ہمارے لیے امکانات کے شعور سے عبارت ہے یہ باتیں میرے لیے انتہائی اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر ہر لمحہ ہمارے لیے صرف ایک بات کے علاوہ کچھ ممکن نہ ہو تو اسے یہ نام دینا بے معنی ہو گا یہ تو خالص ضرورت رہ جائے گی۔ ملاحظہ کیجیے ان عجیب و غریب حقائق کو کہ ہمارے وجود کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کے سامنے متعدد واقع ہوتے ہیں جو اپنے تنوع سے مل کر امکانات بن جاتے ہیں اور جن میں سے ہمیں اپنی پسند کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ یہ کہنے کا مطلب کہ ہم زندہ ہیں' یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو واضح امکانات کے ماحول میں پاتے ہیں اس کا ماحول کو ہم عام طور پر اپنے حالات کہتے ہیں۔ زندگی کا مطلب اس "ماحول" میں اپنے میں اور اپنے ارد گرد کی دنیا میں بسر کرنا ہوتا ہے۔ دنیا ہماری حیاتی امکانات کا حاصل جمع ہے۔ یہ ہمارے وجود سے علیحدہ یا باہر کی چیز نہیں یہ دراصل احاطہ ہے۔

یہ ہماری حیاتی امکانی قوت اور ہمارے اصل جوہر کی نمائندہ ہے۔ اس لیے ہمیں دنیا نظر آتی ہے۔ اس بیکراں دنیا میں اپنی ہستی زرہ خاک کی مانند کم تر۔ یہ دنیا یا ہمارا امکانی وجود ہمیشہ ہمارے مقدر اور حقیقی وجود سے عظیم تر ہوتا ہے۔ کہیں اس وقت میں انسانی زندگی کے حاصل ہونے والے زیادہ امکانات کی وسعت کو واضح کرنا چاہتا تھا۔ اب انسانی زندگی کے سامنے امکانات کا جو تنوع ہے وہ پہلے کبھی نہ تھا۔ اب دانش انسانی کے سامنے "خیالات" کے بہت سے راستے ہیں' بہت زیادہ مسائل ہیں' زیادہ بنیادی معلومات ہیں' سائنسی علوم ہیں' نقطہ ہائے نظر ہیں' ماقبل تاریخ کی زندگی میں پیشوں کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں۔ چرواہا' شکاری' جنگجو یا سردار اب پیشوں کی فہرست ناقابل پیمایش حد تک طویل ہو گئی ہیں۔

یہی صورت حال سامان نشاط کی ہے۔ یہ عجیب و غریب کیفیت بھی انتہائی اہم ہے۔ ہرچند کہ زندگی میں لذتوں کی فہرست اور دوسرے امور زندگی کی نسبت بہت مختصر ہے۔ بہرحال اس صدی کے دوران شہروں میں جو ماڈرن زندگی کے نمائندہ ہیں۔ متوسط طبقہ کے فرد کے لیے تفریح کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں۔ بہرحال حیاتی قوت امکانی کا اضافہ بھی محدود نہیں رہا یہ بھی زیادہ خودی طور پر پر اسرار سمت میں بڑھا ہے۔ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ کھیلوں میں ماضی کی نسبت غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ ان باتوں پر تعجب کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس تاثیر کو ضرور نوٹ کرنا چاہیے کہ ہمارے دور میں انسانی وجود کو پہلے کی نسبت بہت اعلیٰ و ارفع صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ سائنس کے شعبہ میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ صرف ایک عشرے میں کائناتی افق میں ناقابل یقین حد تک توسیع ہوئی ہے۔ آئن شائن کی طبیعات اسقدر بیکراں وسعت میں حرکت کرتی ہے کہ اس سے نیوٹن کی قدیم طبیعات بہت چھوٹی نظر آتی ہے۔ یہ وسیع العریض اضافہ سائنسی یا ضابطگی میں گہرے اضافہ کے سبب

ہوا ہے۔ آئن سٹائن کی طبیعیات کے چھا جانے کا سبب یہ تھا کہ اس نے ان چھوٹے چھوٹے اختلافات اور تضادات کے گہرے مشاہدے پر زور دیا جن کو پہلے نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ ایٹم جو کل تک دنیا کی انتہائی حد تھی آج پھل پھول کر خود پورا نظام شمسی کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ان تمام باتوں سے میرا مقصد کلچر کی تکمیل کی اہمیت کا حوالہ دینا نہیں۔ اس وقت مجھے اس موضوع میں کوئی دلچسپی نہیں لیکن جہاں تک اس میں مضمر موضوعی قوت نمو میں اضافہ کا تعلق ہے۔ میں اس حقیقت پر زور نہیں دے رہا کہ آئن سٹائن کی طبیعیات نیوٹن کی طبیعیات کی نسبت زیادہ درست ہے بلکہ یہ کہ آئن سٹائن' نیوٹن کی نسبت زیادہ درستگی اور روح آزادی کا حامل ہے۔

۱۔ نیوٹن کی دنیا بے پایاں تھی لیکن یہ بیکرانی قدامت کا معاملہ نہیں تھا بلکہ ایک خالی خولی' عمومیت' قیاسی' کھوکھلی اور یوٹوپیا کی طرح۔ آئن سٹائن کی دنیا محدود ہے لیکن تمام جز و کل میں بھرپور اور ٹھوس ہے۔ نیتجتاً" یہ دنیا اشیاء سے بھری اور نسبتاً" زیادہ اثرانگیز ہے۔

۲۔ روح آزاری' ذہنی قوت روایات سے جڑے ہوئے خیالات کو علیحدہ کرنے کی صلاحیت کو کہا جاتا ہے۔ خیالات کو جوڑنے' انھیں علیحدہ کرنے سے بہت آسان ہوتا ہے۔ جیسے کوئیلر (Kohler) نے بن مانس کی ذہانت کی دریافت میں کیا ہے۔ انسانی شعور میں خیالات کی علیحدگی جو صلاحیت اب ہے وہ پہلے کبھی نہ تھی۔

آج کا مکہ باز جس قدر زور آور ضربات لگا سکتے ہیں پہلے کبھی نہیں لگائی گئیں۔ جس طرح سینما اور مصور رسالے عام آدمی کو دور دراز مقامات دکھاتے ہیں اور اخبارات ذہنی کمالات کی نئی نئی خبریں پہنچاتے ہیں' دکانوں میں سجی ہوئی ایجادات اس ذہنی ترقی کی تصدیق کرتی ہیں۔ ان تمام باتوں سے ذہن انسانی کو قوت کے حیرت انگیز امکانات کا شدید احساس ہوتا ہے۔ بہرحال میری گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ انسانی زندگی پچھلے وقتوں کی نسبت بہتر ہے۔ میں نے حقیقی وجود کے معیار کی بہتری کی بات نہیں کی بلکہ زندگی تعدادی پیش رفت اور قوت امکانی میں اضافے کی بات کی ہے۔ میرا یقین ہے کہ اس طرح مین آج کے انسان کے ضمیر کی حقیقی عکاسی کر رہا ہوں اور اس کا حیاتی لب و لہجہ بتا رہا ہوں جو اس کے پہلے وقتوں کی نسبت بہت زیادہ قوت امکانی کا حامل ہے۔ ایسی قوت امکانی کا احساس جس کے مقابلہ میں پچھلے وقتوں کے انسان کی قوت امکانی بونی نظر آتی ہے۔ یہ تفصیلی جائزہ انحطاط کے منشور پر بات کرنے کے لیے ضروری تھا بالخصوص اس مغرب کے انحطاط پر نالہ و شیون کے متعلق جس

نے گذشتہ عشرے سے ماحول کو دھواں دھواں کر رکھا ہے۔

جس دلیل سے میں نے آغاز کیا تھا ذرا اسے یاد کیجیے میرے لیے تو وہ بہت سادہ اور آسان ہے۔ انحطاط کی وضاحت اور اس کے اسباب کی نشاندہی کیے بغیر انحطاط کی بات کرنا بے فائدہ ہے۔ کیا ایسا قنوطی اصطلاح سے مراد کلچر کا انحطاط ہے؟ کیا یورپی کلچر انحطاط پذیر ہے؟ یا صرف یورپ کی قومی تنظیمیں انحطاط پذیر ہیں؟ آگے چلیے کیا اس طرح ہمیں مغرب کو انحطاط پذیر کہنے کا حق پہنچتا ہے؟ بالکل نہیں۔ کیونکہ ثانوی تاریخی اجزاء کلچر اور قومیتوں کا انحطاط جزوی انحطاط سے زیادہ نہیں۔ خالص انحطاط صرف قوت حیات کا کمزور پڑنا اور ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب وہ محسوس ہو۔

میں نے اس عام طور پر نظرانداز کیے جانے والے جس مقابلہ کا جان بوجھ کر تاخیر سے کیا ہے وہ ہے ہر دور کا اپنی حیاتی قوت کی سطح کا تجربہ اور احساس۔ کچھ صدیاں دوسری صدیوں میں اپنے سنہری وقت کی عظمت کی بلندیوں سے نیچے گر جانے کا احساس رکھتی ہیں اور میں نے اس سادہ حقیقت پر اپنے مشاہدے کا اختتام کیا کہ ہمارا دور اس عجیب مفروضے سے سرشار ہے کہ یہ ماضی کے ہر دور سے برتر ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہمارے دور نے ہر کلاسیکی اور دوسرے دور کو تسلیم کرنے سے انکار کر کے ماضی کی تمام چیزوں سے تعلق توڑ لیا ہے۔ اس مشاہدے پر نظر رکھے بغیر ہمارے دور کو سمجھنا مشکل ہے کہ یہی اس کا اصل مسئلہ ہے۔ اگر یہ خود کو انحطاط شدہ محسوس کرتا تو دوسرے ادوار کو خود سے برتر سمجھتا یعنی ان کی تعریف کرتا اور ان کے اصولوں کو اختیار کرتا۔ تب ہمارے دور کے پاس بھی واضح اور سختی سے گرفت میں رکھے جانے والے آئیڈیل ہونا چاہییے وہ ان کے حصول میں کامیابی کی صلاحیت سے عاری ہوتا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔

ہم ایسے دور میں زندہ ہیں جس میں انسان کو تخلیق کی بے پناہ صلاحیت رکھنے کی صلاحیتوں پر اعتماد ہے لیکن جسے یہ علم نہیں کہ کیا تخلیق کرے؟ تمام اشیاء کے مالک و مختار اپنے وجود کا مالک و مختار نہیں ہے وہ اپنی ہی فراوانی میں گم ہو گیا ہے۔ وسائل کی فراوانی، علم کی فراوانی کے باوجود دنیا اسی طرح رینگ رہی ہے جس طرح بدترین حالت میں رینگتی تھی۔ اس لیے جدید انسانی روح میں قوت اور عدم تحفظ کے امتزاج نے گھر کر لیا ہے۔ اس کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا ہے جو لوئی XV کی کم سنی کے دوران میں مقرر شدہ ایجنٹ کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ ہر جوہر قابل کا مالک ہے لیکن کسی بھی صلاحیت کو استعمال کرنے کے جوہر قابل سے محروم ہے۔

چودھویں صدی عیسوی کے لیے بہت سی چیزیں اب ممکن نہیں مثلاً" ترقی میں اس کا پختہ یقین آج چونکہ ہمیں ہر چیز ممکن نظر آتی ہے۔ اس لیے ہم بدترین صورت حال کے امکان کو بھی

محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تنزل' بربریت' انحطاط بات ممکن ہے۔ انحطا کے اسباب کی تشخیص میں بنیادی سبب کی صورت نکلنا ہے۔ یہ نہیں کہ ہم انحطاط شدہ ہی بلکہ ہر امکان کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہونے کے سبب ہم انحطاط کو بھی امکانات سے خارج نہیں کر سکتے۔ یہ اپنے طور پر کوئی بری علامت نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایک بار پھر عدم تحفظ سے تعلق استوار کر رہے ہیں اور یہ تعلق زندگی کی تمام تر صورتوں کے لیے لازمی ہے کہ تشویش ہر لمحہ مصیبت زدگی کے ساتھ لطف بھی دیتی ہے۔ اگر ہمیں اس دھڑکتی ہوئی توانا داخلی کیفیت سے پوری طرح لطف اٹھانے کا ہنر آتا ہو۔ عموماً ہمیں اس نبض کی دھڑکن سے جو ننھے میٹھے دل کے لمحہ خلوص کو جنم دیتی ہے' خوف آتا ہے اور ہم اپنی تقدیر کے بنیادی ڈرامے کو عادتوں' روزمرہ موضوعات اور ہر طرح کے خواب نشہ آور ادویات میں ڈبو کر اپنے احساس کو سلا دیتے ہیں۔

یہ بڑی زبردست بات ہے کہ گذشتہ تین صدیوں میں ہمیں اس بے خبری کا احساس ہو رہا ہے کہ کل کیا ہو گا؟ اور ہم اس پر حیران! ہر وہ شخص جو اپنے موجود کے متعلق سنجیدہ رویہ اختیار کرتا ہے اور خود کو اس کے لیے مکمل طور پر ذمہ دار سمجھتا ہے۔ ایک خاص قسم کے عدم تحفظ کا احساس کرے گا جو اسے ہر لمحہ چوکنا رکھے گا۔ روم کی فوج میں پہرے داروں کو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کھڑا رہنے کا حکم تھا کہ وہ غنودگی میں مبتلا نہ ہو اور ہمہ وقت چاق و چوبند رہیں۔ اس انداز میں فائدے تھے۔ رات کی خاموشی میں مکمل خاموشی رکھنے کا حکم تھا تاکہ مستقبل کے خفیہ قدموں کی آہٹ بھی سنی جا سکے۔ فراوانی کے ادوار کا تحفظ جیساکہ پچھلی صدی تھی' نظر کا دھوکا ہے جس سے مستقبل کی تمام جہتیں کائنات کے میکانکی نظام کے سپرد کر کے نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ ترقی پسند' لبرل ازم اور مارکسی سوشلزم دونوں نے قیاس کر لیا ہے کہ ان کے نزدیک جو بہترین مستقبل ہے اس کا حصول ستاروں کی چال کی طرح یقینی ہے۔ اس خیال نے ان کے ضمیر کو تھپکیاں دے کر سلا دیا۔ انھوں نے اپنی چوکسی ترک کر دی اور مہارت و جہد مسلسل چھوڑ دی۔ زندگی ان کی گرفت سے نکل گئی اور آج سرکش ہو کر بغیر کسی مقررہ منزل' سوچوں کے رحم و کرم پر تیرتی پھرتی ہے۔ ترقی پسند مستقبل پرستی کا نقاب اوڑھے ہوئے ہیں اور اب مستقبل سے کوئی تعلق نہیں رکھتے وہ اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ مستقبل میں ان کے لیے نہ کوئی حیران کن بات ہے نہ کوئی راز ہے نہ مہم جوئی ہے نہ کوئی نئی بات ہے۔ انھیں یقین ہے کہ دنیا سیدھے سبھاؤ چلتی رہے گی۔ نہ رخ تبدیل کرے گی' نہ واپس لوٹے گی۔ وہ مستقبل کے متعلق کسی تشویش میں مبتلا نہیں اور صرف حال میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کیا ہمیں اس بات پر حیران ہونا چاہیے کہ آج کی دنیا مقصد سے خالی ہے نہ اس کے پاس توقعات ہیں نہ نصب العین' کسی نے اس موضوع پر غور ہی نہیں کیا۔ راہنمائی کرنے والی اقلیتی گروپوں کی یہ بے وفائی ہی

ہے جو جمہور کی بغاوت کے سکے کی پشت پر کنداں ملتی ہے۔

بہرحال اب وقت آگیا ہے اس آخری صورت حال پر غور کرنے کی جانب واپس آئیں۔ جمہور کی فتح کی پیش کردہ خوشگوار صورت حال کی اہمیت بتانے کے بعد مناسب ہو گا کہ دوسری اور بہت زیادہ خطرناک ڈھلوان سے نیچے اترا جائے۔

باب - ۵

ایک شماریاتی حقیقت

یہ مضمون اپنے دور، اپنے حقیقی وجود کی تشخیص دریافت کرنے کی کوشش ہے۔ ہم اس کے پہلے جزو کی نشاندہی کر چکے ہیں جس کا خلاصہ اس طرح ہے کہ امکانات کے پروگرام کی صورت میں ہماری زندگی ماضی کے تمام معلوم ادوار کی زندگی سے زیادہ شاندار، مرصع اور اعلیٰ ہے لیکن اسی حقیقت کے سبب کہ اس کی وسعت بہت زیادہ ہے یہ روایات کے عطا کردہ ذرائع، اصولوں، طریقوں اور آئیڈیلز کی حدود سے باہر نکل گئی ہے۔ سابقہ وجود کی نسبت یہ زندگی زیادہ بھرپور ہے اور اسی لیے زیادہ مسائل انگیز ہے۔ ماضی سے اسے کوئی راہنمائی نہیں ملتی۔ (نوٹ: ہم دیکھیں کہ بہرحال اگر ماضی سے مثبت مشورے ملتے تو صنعتی رہنمائی ضرور ہوتی ہے۔ ماضی ہمیں یہ تو ہنر بتائے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے لیکن یہ ضرور بتاتا ہے کہ ہم کن چیزوں سے پرہیز کریں) اسے اپنی تقدیر خود دریافت کرنی ہو گی۔

لیکن اب ہمیں تشخیص مکمل کرنی چاہیے۔ زندگی جس کا بنیادی مطلب یہ ہے کہ ہمارے لیے کیا ہیئت اختیار کرنا ممکن ہے۔ امکانات میں سے اپنے لیے انتخاب کرنا بھی ہے کہ ہم کیا بنیں گے۔ ہمارے حالات یعنی یہ امکانات ہماری زندگی کے اس حصے کی تشکیل کرتے ہیں جو ہمیں ملتی ہے یا ہم پر مسلط کی جاتی ہے۔ اس سے تو چیز تشکیل پاتی ہے جسے ہم دنیا کہتے ہیں۔ زندگی اپنی دنیا کا انتخاب خود نہیں کرتی یہ تو جب شروع ہوتی ہے تو خود کو ایک پہلے سے طے شدہ اور ناقابل تغیر موجود دنیا میں پاتی ہے۔ ہماری دنیا تقدیر کا وہ حصہ ہے جس سے ہماری زندگی مرتب ہوئی ہے لیکن یہ حیاتی تقدیر کسی قسم کا میکانیکی نظام نہیں۔ ہم عالم وجود میں اس طرح نہیں داغے جاتے جس طرح توپ سے گولہ جس کے سفر کا زاویہ، راستہ پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے۔

دنیا میں آتے وقت ہمیں جو تقدیر ملتی ہے وہ ہمیشہ یہ دنیا ہوئی۔ اصل حقیقت اس کے برعکس پر مشتمل ہے۔ ہم پر ایک زاویہ سفر مسلط کرنے کی بجائے ہمارے سامنے متعدد راستے رکھ دیئے

ہیں اور نتیجتاً" ہم راستے کا انتخاب خود کرنے پر مجبور ہیں۔ زندہ رہنا اس مقدر کو محسوس کرنا ہے کہ ہم اپنی اس آزادی کا انتخاب کرنے پر مجبور ہیں کہ ہمیں اس دنیا میں کیا بننا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی ہمارے فیصلہ کرنے کے عمل کو آرام کرنے کی اجازت نہیں۔ انتہائی مایوسی میں بھی جب ہم خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں کہ جو ہونا ہے ہو تو ہم کوئی فیصلہ نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

اس لیے یہ کہنا کہ زندگی میں حالات فیصلہ کرتے ہیں' غلط ہے۔ اس کے برعکس حالات "نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن" کے مصداق کا معاملہ ہے جو ہر دم تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور ان کی موجودگی میں ہمیں اپنا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ فیصلہ کن عنصر ہمارا کردار ہوتا ہے۔ یہ سارا کچھ ہماری اجتماعی زندگی پر بھی لاگو ہے۔ اجتماعی زندگی میں بھی اولاً" امکانات کے افق ہیں اور پھر ایک ارادہ ہے جو اجتماعی وجود کی مؤثر شکل کا انتخاب کرتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے۔ اس ارادہ کی تخلیق معاشرے کے کردار سے ہوتی ہے یعنی ان افراد سے جو معاشرے پر حاوی ہوتے ہیں' ہمارے دور میں جمہور آدم حاوی ہے اور وہی فیصلہ کرتا ہے۔ یہ کہنے سے ایسا تو جمہوریت میں جب عام رائے دہی کے حق کا استعمال ہوا تو ہوا' کام نہیں چلے گا۔ عام رائے دہی کے حق کے تحت عوام کی اکثریت فیصلہ نہیں کرتی۔ ان کا کام ایک اقلیتی گروپ یا دوسرے اقلیتی گروپ کے فیصلے کی حمایت کرنے تک محدود ہوتا ہے۔ یہ اقلیتی گروپ اپنا پروگرام پیش کرتے ہیں۔ درحقیقت اجتماعی زندگی کے اپنے اپنے پروگرام عوام کو ان فیصلوں کو قبول کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔

آج کل بڑی مختلف باتیں ہو رہی ہیں۔ جن ملکوں میں جمہور کی فتح بہت پیش قدمی کر چکی ہے جیسے بحر روم کے ساحلی ملک ہیں' ہمیں یہ صورت حال دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ سیاسی طور پر ان کی زندگی ہر روز نئی طرز کی ہوتی ہے۔ یہ صورت حال عجیب و غریب ہے۔ تمام تر اختیارات عوام کے نمائندے کے پاس ہیں۔ یہ اسی قدر طاقتور ہیں کہ انھوں نے تمام حزب اختلاف کا نام و نشان مٹا دیا ہے۔ ان کے پاس اس قدر ناقابل شکست قوت ہے کہ تاریخ عالم میں کسی حکومت کے پاس اتنی طاقت نہ تھی۔ اس کے باوجود حکومت کے پاس ایک وقت کے کھانے سے زیادہ نہیں اور وہ مستقبل کے حل کے لیے بے باکی سے خود کو پیش نہیں کرتی نہ ہی مستقبل کا کوئی واضح اعلان کرتی ہے اور نہ ہی ایسے ادارے کے طور پر سامنے آتی ہے جو ارتقاء کے قابل نظر آئے۔ مختصراً" یہ کہ اس کے پاس کوئی حیاتی لائحہ عمل یا زندگی کا منصوبہ نہیں۔ اسے نہ راستے کی خبر ہے نہ منزل کی۔ جب ایسی حکومت اپنا جواز پیش کرنے کی کوشش کرتی ہے تو مستقبل کا قطعی تذکرہ نہیں کرتی اس کے برعکس یہ حال کو بھی نظرانداز کر دیتی ہے اور پورے خلوص سے کہتی ہے "میں حکومت کی ایک غیر معمولی شکل ہوں جسے حالات نے مسلط کر دیا ہے۔ اس لیے اس حکومت کی سرگرمی وقتی مشکلات سے دامن چرانے تک

محدود ہو جاتی ہے نہ یہ مسائل کو حل کرنے کی بجائے ان سے وقتی فرار اختیار کرنے کے لیے ہر طریقہ استعمال کرتی ہے اور اس طرح آنے والے وقت کے لیے مشکلات اور مسائل کا گورکھ دھندا اکٹھا کرتی ہے۔ عوامی طاقت جب جمہور براہ راست استعمال کرتے ہیں تو مطلق العنانی ہوتی ہے۔ عوام کا آدمی وہ ہوتا ہے جس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہوتا اور بس چلے چلا جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ بے پناہ امکانات اور اپنے بے پناہ اختیارات کے باوجود کوئی تعمیری کام نہیں کرتا اور ہمارے دور میں اسی قسم کا آدمی فیصلہ کرتا ہے۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ ہم اس کے کردار کا تجزیہ کریں۔

اس تجزیہ کی کلید اس وقت ملے گی جب ہم اس مضمون کے آغاز کی طرف پلٹ کر سوال کریں۔ یہ سارا جم غفیر کہاں سے آیا ہے جس نے تاریخ کے سٹیج کو کھچا کھچ بھر دیا ہے؟ چند برس ہوئے ممتاز ماہر اقتصادیات ورنر سامبرٹ نے ایک نہایت سادہ حقیقت پر زور دیا تھا۔ یہ انتہائی سادہ حقیقت آج کے یورپ کے منظر کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے اور اگر کافی نہیں تو کم از کم ہمیں بصیرت کے راستے پر ڈالنے کا کام تو کر ہی دیتی ہے۔ یہ حقیقت یوں بیان کی گئی ہے " چھٹی صدی عیسوی جب سے یورپ کی تاریخ شروع ہوئی ہے بارہ صدیاں طے کر کے اٹھارویں صدی تک یورپ کی آبادی اٹھارہ کروڑ باشندوں سے تجاوز نہیں کر سکی۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۹۱۴ء تک ایک صدی سے کچھ زائد وقت میں یورپ کی آبادی بڑھ کر ۴۶ کروڑ ہو گئی ہے۔ اعداد و شمار کا یہ تقابل گزشتہ صدی کی نسل آفرینی اور بار آوری کی خصوصیات کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں رہنے دیتا۔ تین نسلوں میں انسانی زندگی کا ایک ایسا دھارا پیدا ہوا ہے کہ اس نے ایک تاریخی علاقہ کو لبالب کر دیا ہے۔ میں یہ بات پھر دہراؤں گا کہ یہ حقیقت ہمیں جمہور کی فتح اور اس کے تمام مضمرات و اعلانات کا احساس دلانے کے لیے کافی ہونا چاہیے اور میں نے وجود کی سطح بلند ہونے کی جو نشاندہی کی ہے اسے اس کے سب سے ٹھوس عناصر میں شامل کر لینا چاہیے۔ لیکن یہ حقیقت ثابت کرتی ہے کہ ہمارا وہ تو صیفی رویہ جو ہم امریکا جیسے نئے ملکوں کی وسعت پر زور دے کر اختیار کرتے ہیں کس قدر بے بنیاد ہے۔ ہم اس ملک میں اضافہ پر حیران ہیں جو ایک صدی میں دس کروڑ کی آبادی تک پہنچ گیا ہے لیکن اصل حیران کن بات تو یورپ کی بے پناہ زرخیزی' مردم خیزی ہے۔ یورپ کو امریکا کے رنگ میں رنگنے کے غلط خیال کو درست کرنے کے لیے یہ ایک اور دلیل ہے۔ آبادی میں تیزی سے اضافہ کرنے کی خصوصیت پر بھی امریکا کی اجارہ داری نہیں۔ گزشتہ صدی کے دوران یورپ کی آبادی میں امریکا کی نسبت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ امریکہ کی آبادی یورپ کی زیادہ آبادی ہی سے تشکیل پائی تھی۔

ہر چند کہ سومبرٹ ورنر کی تصدیق شدہ حقیقت خاطر خواہ طور پر مشہور نہیں ہوا۔ یورپ میں آبادی میں اضافہ کا خیال اس قدر پھیلا کہ اس پر غیر ضروری اصرار کیا گیا۔ جبکہ بالا اعداد و شمار

میں آبادی کا جو اضافہ ظاہر ہوتا ہے مجھے اس میں زیادہ دلچسپی نہیں۔میرے لیے چھٹی صدی سے اٹھارویں صدی کے دوران آبادی میں اضافہ کی کم رفتاری کے مقابلے میں گزشتہ صدی کے دوران آبادی میں اضافہ کی تیز رفتاری اصل دلچسپی کا سبب ہے۔ یہی اس وقت ہمارے لیے اہمیت کا حامل نکتہ ہے۔ آبادی میں اضافہ کی تیز رفتاری کے عمل نے اس تیزی سے تاریخی منظر پر انسانی جم غفیر کے ڈھیر لگا دیئے ہیں کہ انھیں روایتی تہذیب سے متصف کرنا مشکل ہے۔ درحقیقت موجودہ دور کا عام یورپی گزشتہ صدی کے یورپی کی نسبت زیادہ مضبوط اور صحت مند روح کا مالک ہے لیکن بہت زیادہ سادہ ہے اسی لیے کئی بار وہ ایسے غیر ترقی یافتہ انسان ہونے کا تاثر چھوڑتا ہے جو اچانک بہت قدیم تہذیب میں نمودار ہوا ہو۔ گزشتہ صدی کے ذریعہ افتخار مدرسوں سے عوام کو جدید زندگی کی تکنیک سے زائد کسی بات کی تعلیم دینا غیر ممکن تھا۔ انھیں زندگی گزارنے کے آلات تو دیے گئے لیکن تاریخی فرائض کی ادائیگی کا کوئی احساس نہیں دیا گیا۔ انھیں جلدی میں جدید آلات کی طاقت اور اس پر ناز کا ٹیکہ تو لگا دیا گیا لیکن ان کو جدید زندگی سے نابلد رکھا گیا۔ اسی لیے نئی نسلیں دنیا کی باگ سنبھالنے کے لیے اس احساس کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ دنیا کی اس جنت پر کسی کے قدموں کے نشان نہیں کوئی روایتی یا کوئی اور پیچیدہ مسائل نہیں۔

سابقہ صدی کو تاریخ میں عظیم انبوہ کثیر آزاد چھوڑ دینے کا اعزاز جاتا ہے اور یہ حقیقت اس صدی کو انصاف کے ساتھ پرکھنے کا نظریہ عطا کرتی ہے۔ اس صدی میں کوئی انتہائی نادر اور غیر معمولی بات ہو گی کہ اس دوران اس کی آب و ہوا میں ایسی زبردست انسانی فصل بخشی۔ ماضی کے دیگر ادوار کو جن اصولوں نے تحریک دی، ان کو ترجیح دینے کا رویہ اس وقت تک بیکار اور مضحکہ خیز ہو گا جب تک اس شاندار حقیقت کو تسلیم کرنے کا ثبوت نہ دیا گیا ہو اور اس حقیقت کو ہضم نہ کر لیا جائے۔ تمام تر تاریخ ایک عظیم لیبارٹری ہے جس میں انسان کی نشوونما کے لیے اجتماعی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید فارمولا حاصل کرنے کی غرض سے تمام ممکنہ تجربات کیے گئے ہیں۔ اب ہم اس حقیقت کے روبرو ہیں کہ انسانیت کے بیج کو دو اصولوں یعنی لبرل ڈیموکریسی (آزاد جمہوریت) اور (فنی علم) تکنیکی علم کی آغوش ربوبیت میں دینے یورپ میں صرف ایک صدی کے دوران یہ صنف تگنی ہو گئی ہے۔ اگر ہم اپنی عقل استعمال کرنے سے انکار نہ کریں تو یہ ہمہ گیر حقیقت ہمیں مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اولاً" فنی معلومات پر مبنی آزاد جمہوریت معاشرتی زندگی کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ ثانیاً" اگرچہ اس اعلیٰ طریق زندگی سے برتر زندگی کا تصور کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں بھی فنی معلومات اور آزاد جمہوریت کے اصولوں کو شامل کرنا ضروری ہو گا اور ثالثاً" انیسویں صدی کی زندگی سے کم تر صورت کی زندگی اختیار کرنا خودکشی کے مترادف ہو گا۔

ہم ایک بار اس صورتِ حال کو اس کے مطلوبہ تقاضوں کے مطابق صفائی اور وضاحت سے تسلیم کر لیں تو پھر ہمیں انیسویں صدی کے خلاف اٹھنا چاہیے۔ اگر یہ ظاہر ہو کہ اس میں کوئی چیز غیر معمولی اور نادر ہے تو اس نے کچھ طبعی خرابیوں' جبلی خامیوں سے اس وقت نقصان اٹھایا ہو گا جب افراد کے ایک طبقے کو یعنی جمہور کے آدمی کو بغاوت کا علم سربلند کرنے کے لیے اٹھایا ہو گا۔ یہ وہ لوگ ہیں انھیں اصولوں کو خطرے میں ڈال رہے ہیں جن سے ان کو زندگی ملی ہے۔ اگر اس نوع کا انسان یورپ کی قسمت کا مالک رہتا ہے تو براعظم یورپ کو دور بربریت میں واپس لے جانے کے لیے صرف تیس برس کافی ہوں گے۔ قانون سازی اور صنعتکاری کی تکنیک اسی سہولت کے ساتھ حرف غلط کی طرح غائب ہو جائیں گی۔ جس طرح اکثریت سے کاروباری راز غائب ہو گئے ہیں۔ آئن سٹائن کے رفیق کار اور ان کے کام کو آگے بڑھانے والے جدید دور کے عظیم ترین ماہرین طبیعات میں شمار ہونے والے ہرمن رائل دوران گفتگو یہ کہنے کے عادی ہیں کہ اگر دس یا بارہ خاص نشان زدہ اشخاص اچانک مرجاتے ہیں تو یہ قطعی یقینی بات ہے کہ طبیعات کی تمام ترقی انسانیت کے لیے ہمیشہ ہمیشہ گم ہو جائے گی۔ طبیعیات کی تھیوری کی خیالی پیچیدگی کے ساتھ ذہن انسانی کو مربوط کرنے کے عمل کو صدیاں درکار ہوتی ہیں کوئی حادثہ ایسے عظیم انسانی امکانات کا خاتمہ کر سکتا ہے جن کی بنیاد پر مستقبل کی تکنیکی ترقی کا انحصار ہے۔ تمام تر زندگی سکڑ جائے گی۔ امکانات کی فراوانی عملی کمیابی قابل رحم نامردی اور حقیقی انحطاط میں تبدیل ہو جائے گی۔ جمہور کی بغاوت وہی چیز ہے مرا تھیناؤ بربروں کے حملہ کا نام دیا تھا۔ اس لیے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جمہور کے آدمی کی امکانی قوتوں کو اس کی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے ساتھ پوری طرح سمجھ جائے۔

عوامی آدمی کی سرجری کا آغاز

عوامی آدمی کی عوام کی سیاسی اور غیر سیاسی زندگی پر گہری چھاپ ہوتی ہے۔ اس کی پسند اور نا پسند کیا ہیں اور وہ کیسے وجود میں آیا ہے؟ بہتر ہوتا کہ دونوں سوالوں کا جواب ایک ساتھ دیا جاتا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو روشنی دیتے ہیں۔ آج کا انسان جو یورپ کی قیادت کرنے کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے، اس آدمی سے مختلف ہے جس نے انیسویں صدی کے دوران رہنمائی کی تھی لیکن جو حال کے آدمی کی محنت کا پھل ہے۔ ۱۸۲۰ء، ۱۸۵۰ء اور ۱۸۸۰ء سالوں کا کوئی صاحب ادراک دلچسپی رکھنے والا آج کل کی تاریخی صورت حال کی وضع قطع کی ترجیحی جوازیت کے ساتھ پیش نہیں کر سکتا تھا اور درحقیقت اب وقوع پذیری سے متعلق کوئی کام نہیں ہو رہا جبکہ اس کی شدت کی پیش بینی سو سال قبل نہیں کی گئی تھی۔ "ہیگل" نے اپنے کشفی دستور کے مطابق رقم کیا ہے۔ "عوام الناس پیش قدمی کر رہے ہیں" اور گوئٹے کے فلسفہ کی رو سے "بعض روحانی شخصیات کو چھوڑ کر ہمارا عہد جو ایک انقلابی عہد ہے عام تباہی پھیلائے گا؟ اور آینگنے ڈن کی چٹان پر کھڑے ہو کر "نطشے" کہتا ہے۔ "میں آدمیت کے مد و جزر کا ایک بے قرار طوفان دیکھ رہا ہوں" تاریخ خود کو دہراتی ہے اور یہ کہنا غلط ہے کہ تاریخ کی پیش بینی نہیں کی جا سکتی۔ اگر کوئی مستقبل کی پیش گوئی نہیں کر سکتا تو پھر ماضی اور حال میں کی جانے والی پیش بینی کے معنوں کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ تاثر کہ مورخ مستقبل کے حقائق کا کاشف نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف تاریخ کے فلسفہ کا خلاصہ اور لب لباب کی پیش گوئی رقم کرتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مورخ کے لیے مستقبل کے عام نظام سے متعلق پیش گوئی کرنا ممکن ہوتا ہے۔ کم از کم ماضی و حال کی تاریخی حقیقتوں کے معنی ہم یہ سمجھتے ہیں۔ علیٰ ہذالقیاس اگر آپ اپنے عہد کے بارے میں پرکھنا چاہتے ہوں تو پھر آپ اس کے زمانی و مکانی فاصلوں کے بصری جائزے پر ضرور نگاہ ڈالیں۔ کتنا فاصلہ ہے؟ اس کا آسان جواب یہ ہے۔ حتیٰ کہ کلوپٹرا کے چہرے کے خدوخال تک غور و فکر کرنا ہو گا۔ اس

کے ناک، کان اور دیگر نقوش کا جائزہ لینا ہو گا۔

انیسویں صدی میں عوام الناس کے وہ کیا عوامل تھے جو عوامی آدمی کے نزول کا باعث ہے اور عوام الناس کی زندگی میں کیسے اضافہ ہوا؟ میں اس کے ایک ہمہ گیر مسالہ کی بے قراری اور بے چینی سے اس کا آغاز کرتا ہوں کہ اس متوسط آدمی کو اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کا خاطر خواہ موقع ہی میسر نہیں آیا۔ جس کے باعث اس مسئلہ کو حل کرنے کے قابل نہ ہوا۔ لہٰذا اس کی زندگی میں مال و زر کی افراط میں کمی ہوتی گئی اور مسلسل رفتہ رفتہ کم ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ اس فرد کی زندگی اجیرن بن گئی۔ اس کے برعکس ذرمیانے درجے کے طبقات کے اقتصادی وسائل روز بروز وسیع و فراخ ہوتے گئے۔ عیش و عشرت اور تعیش نے اس کی زندگی کی ترجیحات اور معیاروں میں خاطرخواہ اضافہ کیا۔ ہر دن اس کی معاشی اور اقتصادی حالت کو تحفظ فراہم کرتا۔ دوسروں کی مرضی اپنے پر ٹھونسے جانے سے آزاد ہو گیا۔ جبکہ اس سے پہلے وہ مقدر کے لکھے پر شاکر رہتا تھا اور نصیبے پر اکتفا کرتا تھا۔ مگر اب ان طبقات نے اس عاجزی اور سپاس گزاری کو اپنے استحقاق میں تبدیل کر لیا اور اب یہ اسے کسی کا احسان نہیں سمجھتے۔(بقول غالب۔

احسان ناخدا اٹھائے مری بلا
لنگر کو چھوڑ دوں، کشتی کو توڑ دوں)

۱۹۰۰ء سے لے کر اس کارکن نے اپنا حق تسلیم کرانے کی مہم کو یقینی بنانے کا آغاز کر دیا تھا لیکن اس کے سرے تک پہنچنے کے لیے بے حد جدوجہد کرنا پڑی۔ بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ماضی کی انوکھی سوسائٹی اور ریاستی ڈھانچہ نے اس درمیانی درجہ کے طبقہ کے مفادات کے لیے کچھ نہیں کیا اور نہ ہی اس کی مجبوریوں پر اس کی توجہ اور دھیان ہے۔ چنانچہ اس نے اب اپنی بے چینی، بے قراری اور دکھ درد اور اپنی اقتصادی حالت کو تحفظ اور سنبھالا دینے کے لیے اپنی اپنی طبعی طمانیت کے عوامی راج سے مشروط کر دیا ہے کیونکہ ماضی میں ان کی زندگی یکساں طور پر اور غیر قانونی طور پر گزر رہی تھی۔ اس لیے انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے متشددانہ اور خطرناک حد تک نیا تجربہ کرنا چاہا۔ انھوں نے اقتصادی حالات، آرام اور عوامی راج کی خاطر ہر حربہ اور تجربہ کیا۔ اب ان کی عام زندگی کی مثال اس سفر سے دی جا سکتی ہے کہ ایک عام آدمی ریل کے آرام دہ ڈبوں میں سفر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اب انھیں کسی تشدد کا خوف نہیں کہ وہ ان کی زندگی کو بے سکون کر دے گا۔ چنانچہ اس طرح کی بے مثال صورت حال اور آزاد خیالی ایسی روحوں میں داخل ہو چکی ہے کہ جیتی جاگتی انسانی حیات کی موجودگی کے احساس نے ان میں معاملہ فہمی، زود فہمی اور بذلہ سنجی کے سارے دروں کو وا کر

دیا ہے۔ جس پر ہمارا یہ مقولہ صادق آتا ہے۔ "بے کراں وسعت گراں مایہ سرمایہ" میری اس تفصیل کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس "نئے آدمی" (طبقہ) کو اس کے اپنے ابتدائی اور فیصلہ کن پہلوؤں نے تمام بندشوں سے آزاد کر دیا ہے کیونکہ اس نے حقیقت اور اس کی اہمیت کو اپنی فہم فراست کے ساتھ فوری طور پر محسوس کر لیا ہے۔ یاد رہے کہ اس قسم کی آزادی کا وجود ماضی میں نہ تھا یعنی (آزاد ہستی) عام آدمی اس آزادی سے محروم تھا اور اس آزادی کا فقدان تھا۔ دوسری طرف ان کی روحانی، طبعی اور معاشی زندگی ایک سخت اور کڑے اور بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ پیدائش ہی سے ان کی ہستی کو بے شمار رکاوٹوں کے گرداب میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ جس کی اذیتوں کے زیر بار وہ زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ یعنی وہ ذلتوں کے مارے لوگوں کی طرح زندگی گزارتا تھا۔ وہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ ان کا تابع مہمل اور مطیع تھا۔ وہ ان کی پرانی اور بوسیدہ عمارتوں میں زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ وہ مجبور و مقہور ہو کر وقت گزارتا تھا لیکن ان کے اخلاقی، مدنی اور ملکی حالات پر نظر ڈالیں تو ہمیں ایک اور منظر دکھائی دیتا ہے کہ ان کی اقتصادی اور معاشرتی صورت حال میں زبردست تفاوت اور تفریق تھی۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر متوسط آدمی کی سماجی زندگی میں کوئی رکاوٹ حائل نہ تھی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے بلکہ مفہوم یہ ہے کہ جہاں تک عوامی زندگی کا تعلق ہے کہ اسے پیدائش (ابتدا) سے لے کر آنے والی زندگی میں اس کو کسی قسم کی رکاوٹوں اور بندشوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور ایسی کوئی مقتدرہ بھی موجود نہ تھی جو اس کی ہست و بود کو پابند سلاسل کرتی۔ یہاں پھر وہی میرا مذکورہ مقولہ صادق آتا ہے "بے کراں وسعت گراں بہا سرمایہ ہوتا ہے" جہاں شاہی جائیداد اور نہ "سماجی امتیازات" نہ ذاتیں موجود ہوں اور نہ ہی سول امتیازات اور مراعات رکھ رکھاؤ موجود ہو تو ایسی صورت میں عام فہم بات ہے کہ قانون کی نظر میں سبؑ برابر ہوتے ہیں۔

تاریخ کے کسی حصہ میں بھی ہمیں کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی عہد میں بھی اس متوسط طبقہ کو ہماری متذکرہ نشاندہی کے علاوہ زندہ دلی سے زندگی گزارنے کا موقع میسر ہوا ہو۔ خواہ یہ متوسط آدمی دور دراز جنگلوں میں رہتا ہو یا اپنے محلات کی خولیوں میں کسی نے بھی اس کے دکھوں اور زخموں کو دور کرنے پر دھیان نہیں دیا۔ ہم اس وقت در حقیقت انسانی جوہر کی بنیادی جدت طرازیوں کا سامنا کر رہے ہیں جو اس کو انیسویں صدی نے ذہن نشین کرائی تھیں۔ انسان زندگی کے لیے ایک نئی پیش رفت کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ یعنی طبعی اور سماجی حیثیت کے لحاظ سے دو نئے اقدام وجود میں لائے گئے ہیں۔ اس عمل میں اس دنیا کو جدید بنانے میں تین اصول کار فرما ہوئے ہیں۔ (۱) آزاد جمہوریت (۲) سائنسی تجربات (۳) صنعتی فنیات۔ آخرالذکر دونوں نکات اصول کو صرف ایک لفظ "فیناتی ازم" کا نام دیتا ہوں۔ ان میں سے کوئی اصول بھی انیسویں صدی نے ایجاد نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس اصول کی کڑیاں

گزشتہ دو صدیوں تک جا کر ملتی ہیں یعنی یہ اصول ماضی کی دو صدیوں سے کارفرما ہیں۔ انیسویں صدی کا کمال انھیں دریافت کرنا نہیں بلکہ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے ان اصولوں کو ہمارے دلنشیں کروا دیا ہے۔ اب اس حقیقت کا کوئی انکار نہیں کرتا لیکن میرے نزدیک اس حقیقت کو بطور استعارہ سمجھنا کافی نہیں ہے۔ اس کے اٹل اور حقیقتوں پر مبنی اور ٹھوس نتائج کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

انیسویں صدی کی نذر و نیاز کا یہ جوہر انقلابی اور احسن اقدام تھا۔ اس کے اس پہلو کی پردہ سکرین کی ناکہ بندی کے تناظر میں دیکھنا نہیں چاہیے کیونکہ یہ محض اتفاقات ہیں زمانے کے بلکہ حقیقت یہ ابھر کر سامنے آئی ہے کہ اس پہلو نے متوسط طبقہ کو عظیم سماجی مقام و مرتبہ پر پہنچا دیا ہے اور اس کو زندگی کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے اور زندگی کی محرومیوں کے خلاف علم بلند کرنے کا درس دیا ہے۔ اور جاگتے رہنے کا احساس دلایا ہے۔ اس لیے کہ عوام الناس اب جانتی ہے کہ ماضی کی زندگی میں ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے رہے ہیں۔ اس انیسویں صدی نے اس عظیم عوام الناس کو بیدار کر کے اور ہلا کر رکھ دیا ہے یعنی عوام الناس کی عوامی ہست و بود کو انقلابی بنا دیا ہے۔ انقلاب کسی سابقہ نظام کے خلاف بغاوت نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک زندگی اور حیاتیاتی نمو کا حصہ ہوتی ہے جو پہلے والے روایتی نظام کو مسترد کرتی ہے۔ اس لیے ہم کوئی مبالغہ آرائی نہیں کر رہے۔ انیسویں صدی میں پیدا ہونے والا آدم زاد اس عوامی زندگی کے وجود کو یکسانیت میں لانے میں کامیاب ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا آدمی ہے جو تمام دوسرے لوگوں میں اپنی ایک منفرد اور جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ بیشک یہ آدمی اٹھارویں صدی کے آدمی سے خاصا مختلف ہے لیکن یہ ایک ہی روپ میں دو رنگوں والی تصویر ہے۔ بلکہ ان دونوں کے اصلی عنصر ملتے جلتے ہیں۔ ہمیں یہ اس وقت آشکارا ہوا جب اس "نیا آدمی" نے سابقہ آدمی کے بالمقابل آئینہ دیکھنا شروع کیا۔ گویا اس سے تصادم کرنا شروع کیا ہے کیونکہ ہم نے دیکھا کہ تاریخ کے تمام عصروں میں "عام" کو مخصی اصولوں کے تحت محدود' فرائض کی انجام دہی اور سہارے کا پابند کیا جاتا تھا اور اب میں ایک جملہ میں بحث کو سمیٹتا ہوں کہ "اسے شدید دباؤ کے زیر اثر زندگی گزارنا ہوتا تھا" اگر تم اسے کوئی نام بھی دو گے تو ظلم و ستم کا نام ہی دو گے۔ اسے عدالتی قانون اور سماجی شعور کے طور پر سمجھنا از بس ضروری ہے۔ مگر اسے کائناتی نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ سو سال پہلے بھی اس آدمی میں کوئی کمی موجود نہ تھی کیونکہ موخرالذکر نے سو سال پہلے بھی سائنسی فنیات' طبعی اور انتظامی امور میں بیش بہا توسیع و بسیط کا کام شروع کر دیا تھا۔ جبکہ ماضی میں بھی مضبوط بادشاہوں اور امیر زادوں کی موجودگی اس دنیا میں غربت' مشکل اور خطرہ لاحق ہوتا تھا۔

تاہم اگر ماضی میں کوئی ایک امیر زادہ اپنی برادری یا ساتھیوں کے حوالے سے کتنا ہی امیر ہوتا وہ

اس دنیا میں اپنی کلیت کے باعث غریب ہی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے کروفر، امارات کا شہرہ اور زندگی کی ضروریات کا دائرہ بڑا محدود ہوتا تھا۔ آج کے متوسط آدمی کی زندگی ماضی کے امیر اور طاقتور شاہ سے کہیں زیادہ آسودہ حال ہے۔ اس کو کسی کا ڈر نہ خطرہ۔ یہ اس سے زیادہ امیر ترین ہے۔ اس کی زندگی میں دولت کی ریل پیل ہے۔ اس کی دنیا میں جدید ترین مواصلاتی نظام ہے۔ ریلوے، پختہ سڑکیں، ٹیلی گراف، ٹیلی فون، جدید ہوٹل، ذاتی تحفظات اوز جدید علم ادویات ہے۔ اس عدم تفاوت سے اس کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔

یہ دنیا جس نے اس "نیا آدمی" کو پیدائش ہی سے اپنے حصار میں لیا ہوا ہے۔ یہ دنیا اسے خود کی زندگی کو کسی ایک فیشن میں زندگی گزارنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی اور نہ اس کے پاس کوئی ایسی ویٹو پاور ہے کہ وہ اس کے حقوق پر کسی قسم کی قدغن لگائے۔ البتہ اس کے برخلاف یہ دنیا اس کے میلان ہوس پرستی کی بھوک میں غیر معینہ مدت تک کے لیے اضافہ کر سکتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل سے یہ نیا آدمی کامل نمونہ اور فنی مہارت کو لے کر ہمارے سامنے ابھرتا ہے۔ یہ صفت دراصل اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس نیا آدمی نے بس اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس نے آئندہ نسلوں کو پورے اعتماد کے ساتھ یقین دلایا ہے کہ وہ اس سے زیادہ امیر، کشادہ دل، اور فنیاتی علوم میں مثالی نمونہ کے وارث ہوں گے۔ کیونکہ وہ خود میں لاانتہائی اور بلا تحریک قوت میں اضافہ کرنے کی وجہ سے لطف اندوز ہوا ہے۔ حتیٰ کہ آج تک اس کے اس مضبوط ایمان میں دراڑیں ڈالنے والی علامات کے باوجود بعض لوگ شبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ اگلے پانچ سالوں میں موٹر کاریں زیادہ آرام دہ اور سستی ہوں گی انھیں اس پر اس قدر یقین کامل ہے۔ جس طرح کوئی یہ بات یقین سے کہہ دے کہ صبح سورج مشرق سے طلوع ہو گا۔ یہ واضح اور نمایاں استعارہ ہے کیونکہ اس متوسط آدمی کو جو آج کے جس مہذب تر اور فنیاتی معاشرے میں رہتا ہے پورا یقین بلکہ ایمان ہے کہ یہ ساری ایجادات اور ترقی قدرت کی پیداوار ہے اور کبھی یہ سوچا نہیں کہ یہ اعلیٰ اور باصلاحیت لوگوں کی ذاتی کوششوں کے نتیجہ میں دریافت ہوئی ہیں کہ جس نے اس جدید دنیا کی تخلیق کا قیاس کیا تھا۔ اس کے باوصف وہ اب بھی انسانی جوہروں سے فراہم کردہ سہولتوں اور آرام و آسایش کے میدان میں ترقی کرنے کی ضرورت سمجھتا ہے اور تھوڑی بہت ناکامی کو پورا کر کے اس کے شاندار محلوں کو گرانے کا بھی سبب بنے گا۔

اس نے ہمیں آج کے عوامی آدمی کے نفسیاتی چارٹ کا درشن کروایا ہے۔ جو یہ ہیں۔
(اول) اس کی نفسیاتی خواہشات اور (دوسرا) اس کی شخصیت کی توسیع و بسیط کا رویہ۔ اس کے بنیادی

طبعی ناسپاس گزاری کے عمل نے اس کی ہست و بود کو آرام و سکون فراہم کرنے کو ممکن بنا دیا ہے۔ ان دونوں خوبیوں کے اشتراک سے بگڑے تگڑے بچوں کے نفسیاتی علاج کا طریقہ بھی ایجاد کر لیا ہے۔ درحقیقت اس کو ورثہ میں حاصل شدہ نفسیاتی طریقہ علاج استعمال کرنے سے ہماری چشم بینا نے آج کے عوام کی روحوں کو سمجھنے' پرکھنے اور مشاہدہ کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ درحقیقت جانشینی کا یہ ترکہ ایک فراخ ذی روح کو مل گیا ہے اور فیاض ماضی بھی۔ خیالات اور مستعدی کے حوالے سے دونوں سخی ہیں۔ ان دونوں فیاض خوبیوں نے ایک نئی عوام الناس کے گرد و پیش ماحول اور دنیا کو مکدر کر دیا ہے۔ خراب کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہم و گمان پر کوئی تالا نہ لگایا جائے اور ہر کسی کو یہ تاثر دیا جائے کہ ہر چیز اس کے سپرد کر دی گئی ہے اور یہ کہ اب اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے۔ یہ نوزائدہ بچہ جو اس دور میں حقیقت کا اظہار کرتا ہے اس کو اپنی حدود کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی تمام خارجی بندشوں کے سبب کو منتقل کر دیا ہے۔ اب یہ سب ایک دوسرے سے مزاحمت کرتے ہیں۔ دراصل اسے یقین ہے کہ صرف وہی ذات ہے جو وجود رکھتی ہے۔ یا جو موجود رہتی ہے اور جو دوسروں کو تسلیم کرنے نہ کرنے کا عادی بنا دیتی ہے اور وہ خاص طور پر ان کو اپنے سے برتر ماننے سے انکار کرتا ہے۔ دوسرے کی برتری یا اعلیٰ ہونے کا احساس اس میں اس وقت پیدا ہو گا جب کوئی دوسرا زیادہ طاقتور اسے چند خواہشات ترک کر دینے پر مجبور کر دے اور یہ اس کی مزاحمت کا پابند اور مجبور ہو جائے اور جب تک عملی استعداد کے نظم و نسق کو اچھی طرح سمجھ نہ لے کہ "یہ میرا انجام اور یہی میرا آغاز ہے کہ کوئی اور بھی مجھ سے زیادہ طاقتور ہے۔ اس دنیا میں دو قسم کے لوگ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک میں خود اور دوسرا میرے سے طاقتور مجھ سے برتر "ماضی کے عصروں میں ہر عام آدمی کو اسی بنیادی عنصر کا ہر روز درس دیا کرتا تھا۔ کیونکہ اس دنیا کا انتظام و انصرام متکبرانہ طور پر منظم کیا گیا تھا۔ جس میں عظیم انقلاب اور بنیادی تبدیلیاں اکثر آتی رہی تھیں اور اس میں کبھی یقینی صورت حال اور کثرت مستحکم نہیں رہی تھی۔ لیکن نیا آدمی نے اپنے خوش آئند مستقبل کا سوراخ پا لیا ہے جو وہم و گمان سے اٹا پڑا ہے اور مزید یہ کہ مستقبل نہایت ہی مستحکم اور شاندار ہو گا۔ جس میں ہر چیز ریڈی میڈ ملے گی اور ماضی کی طرح کوششوں سے یہ نیا عوام آزاد ہو گا۔ اسی طرح جیسے ہم اپنی پشت موڑے بغیر اپنی پشت پر ہی سورج کی روشنی کو دیکھ سکتے ہیں۔ کوئی بھی بنی نوع انسان اس "ہوا" کا بھی شکر گزار نہیں ہے جس ہوا سے وہ سانس لیتا ہے۔ کیونکہ کسی شخص نے اس ہوا کو پیدا نہیں کیا تھا کیونکہ اس کا تعلق انتہائی کامل "ہوا" سے ہے' جس سے اس کا وجود (ہست و بود) وابستہ ہے۔ جس سے متعلق ہم "قدرتی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ قدرت لازوال اور لافانی ہوتی ہے اور یہ بگڑے تگڑے عوام الناس اس پر یقین کرنے کے لیے شعور نہیں رکھتے اور یہ چیز مادی و سماجی

تنظیموں کے ذہنوں میں سرایت کر گئی ہے۔ ایسے ہی جیسے ہوا کی سرشت میں "سرائیت ہو جانا" داخل کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں کا ماخذ ایک ہی ہے۔ جب سے یہ ناکام دکھائی نہیں دیتے اور یہ اسی طرح کامل ہیں جس طرح قدرت کی مجوزہ اشیاء میں ایک قدرتی نظام ہوتا ہے۔

یوں میرے مقالہ کا موضوع یہ ہے کہ انیسویں صدی نے جو دوسری تنظیموں کو کامل نمونے عطا کیے۔ ان کے اسباب کے ذرائع کے واسطے سے عوام نے اس سے استفادہ کرنے پر غور کیا جو خود وجود میں نہیں آئی بلکہ اس نے اس کو قدرتی نظام کے طور پر قبول کیا ہے۔ اس طرح عوام نے بھی ایک ناخوشگوار صورت حال کی وضاحت کی ہے۔ انھیں صرف اپنی خوشحالی سے غرض ہے۔ اسی لیے وہ یکساں طور پر اپنی آسودگی کے کارن خود کو جدا کرتے ہیں۔ جیسے وہ مدنیت کے اجتماعی مفادات، عجیب و غریب ایجادات اور تعمیر ملت کے جذبے اور خلوص پر نگاہ نہیں ڈالتے جو عظیم کوشش اور عاقبت اندیشی سے قائم کی جا سکتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا کردار محدود ہے اس لیے وہ محدود حق اور محدود مفادات حاصل کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جب کہ یہ ان کے قدرتی حقوق ہیں۔ غذائی قلت کی کمی کے باعث پریشانی کے عالم میں عوام الناس رزق کی تلاش میں اپنے گھروں سے نکلتے ہیں۔ وہ عموماً" عزم کیے ہوتے ہیں کہ بیکریوں کو نقصان یا تباہ و برباد کر دیں گے۔ ان کے اس رویہ کو آپ ایک استعارہ کے طور پر دیکھیں اور غور کریں کہ جس مدنیت اور تہذیب کی معاونت سے اس مقام پر پہنچا ہے عوام نے اس کے خلاف کیسے سلوک اور رویہ کا اظہار کیا ہے۔

باب ۔ ۷

طبقۂ امراء کی زندگی اور عوامی زندگی

ہم ایک بار پھر اس سوال سے آغاز کرتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور دنیا ہمیں کیا ہونے کی دعوتِ فکر دیتی ہے۔ نیز دنیا ہماری روح پر کیا نقوش مرتب کرتی ہے اور ہماری زندگی اپنے گردوپیش کے ماحول سے کیا اثرات قبول کرتی ہے اور یہ دنیا اپنے گردوپیش کے ماحول سے ہمارے کردار کی تعمیر اور اس کے خدوخال کے بناؤ سنوار میں اور ہمارے طرز زندگی کو کون سے نظم و نسق میں ترتیب دیتی ہے۔ فطری طور پر ہماری زندگی اور ہمارے ماحولیاتی اثرات کا گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ زندگی کا تعلق ماحول کے سوا کسی اور سے نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں کے تعلق سے جو عمومی پہلو جو اس سے ہم حاصل کرتے ہیں وہی ہماری زندگی کا دستور العمل ہوتا ہے۔ اسی لیے میں آپ کو اس نکتہ پر غور و فکر اور توجہ دینے کی دعوت دیتا ہوں اور آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہماری آج کی دنیا نے ہمیں تاریخ کے انتہا پسندانہ رویوں اور نئی جہتوں سے متعارف کروایا ہے۔ جبکہ ماضی کے عصروں نے عوام الناس کی زندگی کا نقشہ کچھ اس طرح پیش کیا تھا اور مفہوم بھی کچھ اس طرح سے ہوتا تھا کہ ان کی زندگی خطرات، مشکلات، ناکام آرزوؤں اور حسرتوں کا مجموعہ ہوتی تھی۔ پابندیوں بھرا صندوقچہ ہوتی تھی اور اب ماضی کے مقابلہ میں نئی دنیا نے ہمیں عملی طور پر لازوال گمان، امکانات، تحفظات اور خود مختاری اور آزادی عطا کر کے ہماری زندگی کو ان نعمتوں کا مرقع بنا دیا ہے۔ ان بنیادی اور مستقل امکانات اور تحفظات کو سامنے رکھ کر ہم ایک عام آدمی کے شعور، سوچ اور فہم کی تعمیر کا ڈھانچہ بناتے ہیں جبکہ ماضی میں عوام کے عقل و شعور کا احاطہ ہمارے طریقہ کار اور فکر و سوچ کے بالکل الٹ کیا جاتا تھا۔ کیونکہ ہماری فکر کے مطابق دوسرے لفظوں میں انسان کی اندر کی آواز اس کے اندرونی گمان یعنی ابتدائی سوچ کے ڈھانچہ پر مہر ثبت کر دیتی ہے اور یہی آواز جو پے در پے اور یقینی طور پر فرد کی اتھاہ گہرائیوں میں ہوتی ہے الفاظ اور

زبان اس کی ترجمان ہوتے ہیں یا یوں سمجھیے کہ یہ آواز بذات خود الفاظ اور زبان کی ترجمان ہوتی ہے اور یہ آواز ہی ذمہ داری سے زندگی کی وضاحت اور صراحت کرتی ہے جو اس وقت کی معاشرتی اخلاق و اقدار کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایسی صورت حال میں اچانک کسی رسمی خیال اور روایتی جذبہ دل نے انگڑائی لی اور جذبات سے کھیل گیا اور یوں للکار دیا "اگر وہ زندہ ہے تو وہ خود کو محدود اور مقہور بھی محسوس کرتا ہے۔ اس لیے وہ اس گمان اور خیال میں گم ہو جاتا ہے کہ کس جہان نے اسے مجبوری اور مقہوری کی زنجیروں میں قید کر دیا ہے؟ اس جذبہ کے ساتھ ہی جہان نو کی تازہ اور بالکل نئی آواز اس کے اس جذباتی انداز کی سوچ کو اچک لیتی ہے اور پکارتی ہے "زندہ رہنے پر کوئی بندش کی قید نہیں ہونی چاہیے" تمھارے پاس کیا کچھ نہیں ہے۔ جب سب کچھ ہے تو اس کے مخالف آواز بلند کرنے کے لیے قدرے خاموشی اور توانائی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہو جاؤ۔ کیونکہ عمل سے زندگی بنتی ہے اور عمل سے ہی انسان کے لیے ناممکن چیز ممکن بن جاتی ہے۔ اور نہ ہی خطرناک ہوتی ہے اور نہ ہی اصولی طور پر ایک فرد دوسرے پر اعلیٰ و برتر ہے۔ بنی نوع انسان کے اس ابتدائی اور بنیادی تجربہ نے زندگی گزارنے کے اصولوں میں ترمیم اور تبدیلیوں میں بھرپور کردار ادا کیا ہے اور معاونت کی ہے۔ کیونکہ عوامی آدمی کی شکست و ریخت ڈھانچہ کی تعمیری نقش و نگاری اور ثابت قدمی کے باعث ہی یہ تبدیلی آئی ہے۔ آخرالذکر پہلو اور رویہ خود سے متعلق سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ مادی بندشوں، پابندیوں، اعلیٰ سماجی اور طاقتور معاشرتی قوتوں سے خود کو پنجہ آزمائی اور نبرد آزمائی کرنے کے لیے تیار کرتا ہے اور اس وقت وہ مقابلہ کے لیے اس کے سامنے کھڑا ہے۔ ایسی صورت حال کی موجودگی میں اگر وہ اپنی صورت حال کو سدھارنے اور بہتر بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس نے مشیت ایزدی کے لوازم اور کارندوں کو اپنے موافق کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور وہ کامیاب ہو جائے گا اور اگر وہ اس میں ناکام ہوتا ہے تو اسے معلوم ہے کہ اس کی قیمت کیا ادا کرنا ہوگی۔ یہ سوال دونوں صورتوں میں اس کی زندگی کے کردار اور امتیازی نشان کو متشکل قرار دیتا ہے۔

لیکن کمال یہ ہے کہ یہ جدید انسان (عوام الناس) بغیر کسی سبب کے اور مکمل آزادی سے اس تعلق اور کیفیت کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور خارجی قوت بھی پابندیاں قبول کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس پر کوئی حکم مسلط کر سکتی ہے۔ کہ وہ خود کو محدود کرے۔ اس سے قبل وہ ہمیشہ اپنے سے برتر حکام کی طرف اشارہ کر دیتا تھا۔ اب سے کچھ عرصہ قبل چینی کسان کی صرف یہی سوچ تھی کہ میری وجودیت کی فلاح و بہبود اور ذاتی حسنِ سیرت کا انحصار شہنشاہ سلامت پر ہے۔ وہی ہمارا مالک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اول و آخر اس کی زندگی کا انحصار اور تعلق اسی حاکم اعلیٰ یا ارفع ذات سے ہوتا ہے جس کو وہ قبول کرتا ہے اور اس پر انحصار کرتا ہے لیکن جس آدمی کا

جائزہ ہمارا یہاں مقصود ہے وہ اپنی ذات کے سوا کسی بھی خارجی قوت اور خارجی حاکم کی اطاعت کا عادی نہیں ہے۔ وہ جہاں بھی ہے جیسا بھی ہے وہ صرف اپنی ہستی اور وجود سے مطمئن ہے۔ اسے ناکامی کے خوف کی پروا نہیں وہ قدرتی اور خود رو چیزوں کو دیکھتا ہے۔ زندہ حیاتی والی اور ہر جاندار چیز پر وہ اپنی عمیق نظر ڈالتا ہے اور انھیں دیکھ کر، سوچ وچار اور تصدیق و یقین کر کے اپنے دل کو اپنے وجود پر دل کی گہرائیوں سے سوچنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر اچھی چیز کو حاصل کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اب یہ نیا آدمی اپنے خیالات، رجحانات، ذوق و میلان اور ذائقے اور ترجیحات وغیرہ کو اعلیٰ فطرتی اور قدرتی چیزوں کے حصول کے لیے غور و فکر پر لگا دیتا ہے اور دن رات فکر کرتا ہے۔ وہ غور بھی کیوں نہ کرے یہ اس کی جبلت اور فطرت میں ہے۔ ماضی کی تاریخ عوامی زندگی میں عوامی جدوجہد کے مراحل کی شاہد ہے جو کوئی چیز اور خارجی قوت اس دوسرے درجے کے آدمی کی سوچوں پر پہرے بٹھا نہیں سکتا۔ کیونکہ اس پر لگائی گئی لامحدود بندشیں، کوئی شے ایجاد کرنے اور جو اس کو اپنی زندگی بھرپور طریقے سے گزارنے کے توثیقی عمل اور اس کے اپنے دلی اطمینان کے دعوئ کو روکتی ہو اور اس کی اپنی شخصیت کو مسخ کرتی ہو تو یہ عوامی آدمی ان سب باطل قوتوں اور باطل حاکمیت کے خلاف برسرپیکار ہو جاتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ہم ان جھوٹے حاکموں، قوتوں اور جھوٹے خداؤں کو نہیں مانتے۔ اس صورت حال میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا یہ آدمی اپنے خلاف کی گئی سازشوں کا قلع قمع کرنے پر آمادہ نہیں ہوا ہے؟

عوامی آدمی کی خود داری اور اس کی ذات نے اسے خارجی حاکمیت تسلیم کرنے سے روک دیا ہے اور گرد و پیش کی پر تشدد فضاؤں کا بھی اس نے مقابلہ کر لیا ہے۔ جس طرح اس کا خارجی ماحول آج بھی اس ہمیشہ زندہ رہنے والے آدمی کو مجبور نہیں کر سکتا کیونکہ یہ عوامی آدمی ہمیشہ سے اپنی ذات سے مخلص رہتا ہے۔ دوسرے سے رحم کی اپیل نہیں کرتا۔ صرف اور صرف خود کی ہست و بود ہی کو حاکم مانتا ہے۔ اس کے باوجود وہ یہ بھی جانتا ہے کہ منتخب اور معقول شخص اپنی زندگی کی لگن اور شوق سے مجبور ہو کر اپنے سے بالا اور معیاری آدمی کو رحم کی اپیل کرتا ہے اور اسے اپنی خدمات مفت فراہم کرتا ہے۔ تو اب آیئے ہم اس معقول آدمی کا جس کا ہم نے تقابلی جائزہ لیا تھا اس کو دوبارہ یاد کرتے ہیں۔ میرے نزدیک اول الذکر وہ آدمی ہے جو اپنی ذات سے کئی مطالبات کرتا ہے اور آخر الذکر وہ ہوتا ہے جو اپنی ذات کے لیے یعنی خود کے لیے کوئی فرمائش نہیں رکھتا کیونکہ وہ اس بات پر مطمئن ہے کہ وہ خود کیا ہے؟

یہ آدمی عقلی اور شعوری طور پر عوام کا ہوتا ہے جو کسی مصیبت یا کسی گھمبیر مسئلہ پیش آنے

سے نہیں گھبراتا بلکہ خوش اور مطمئن رہتا ہے اور اس کے برعکس معقول آدمی وہ ہوتا ہے جو اپنی گذشتہ کوشش کی مذمت کرتا ہے اور نادم نہیں ہوتا وہ صرف اپنے کو قابل آدمی جانتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ جو مجھ سے بڑا ہے اور قابل تر ہے۔ اس کی کوشش پر بھروسا کرتا ہے اور اس پر اعتماد کرتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس وہ اکثر خیال کرتا ہے کہ بس وہی ایک معقول آدمی ہے نہ کہ عوامی جو جبری محکومی کے حلقہ بگوش میں رہتا ہے' اس کی زندگی بے مزہ اور بے لذت ہے۔ وہ اس وقت تک برتر اور معیاری نہیں ہو سکتا جب تک اس اعلیٰ و ارفع کی خدمت گزاری نہیں کرتا رہتا۔ اس لیے وہ نظریہ خدمت گزاری کو جبر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا لیکن جب کبھی اتفاقیہ اور حادثاتی طور پر اس کے نظریہ ضرورت میں کمی واقع ہو جاتی ہے تو وہ بے چین اور مضطرب ہو جاتا ہے اور جب وہ محنت اور توجہ سے کوئی نئی چیز اور معیاری ایجاد کر لیتا ہے تو وہ خود پر جبر کر کے اطمینان بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اسی کا نام ہے نظم و نسق والی زندگی اور شریف النفس آدمی کی زندگی کی تعریف یہی ہے اور اسی زندگی کو اشرافیہ کی زندگی کہتے ہیں کہ آخر کار وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور مطلب براری کے لیے ہم سے رجوع کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ہم پر احسان کرتا ہے۔ ایسا وہ اپنا استحقاق سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ یہ شریف النفس انسان احسان کرتا ہے اور کسی کی مرضی اور زیر اثر رہنے والے آدمی کو عام آدمی کہتے ہیں۔ گوئٹے کے نزدیک اشرافیہ قانون سازی کرتی ہے۔ حکم کا نفاذ کرتی ہے۔ اس کا یہ استحقاق بخشش میں نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اس کی مفتوحہ ہوتی ہے۔ دراصل وہ مراعات یافتہ ضرور ہوتا ہے اور ان رعائتوں کو وہ کسی وقت بھی دوبارہ بزور فتح کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس پر کوئی اعتراض نہ کرے اور یہ دوبارہ فتح کرنا ضروری ہو۔ دوبارہ مفتوحہ بنانے کی یہ کوشش استحقاق نہیں بلکہ عملی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ معیار انھوں نے اپنی محنت سے قائم کیا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عام حقوق کی ذیل میں درج ذیل حقوق ہوتے ہیں جن سے ہر شہری اور عام آدمی ان سے متمتع ہوتا ہے۔ انفعالی جائیداد (نفسیاتی) اور دوسرے کی چیز سے مناسب اور موزوں فائدہ اٹھانے والا اور قدرت کا فیاضانہ تحفہ (جسے ہر آدمی اپنے سامنے پاتا ہے۔ جو ہر کوشش کا جواب ہوتی ہے اور اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا) سے فائدہ اٹھانے والا ہوتا ہے اور پاگلوں کی طرح اسے اس کا خبط ہوتا ہے۔ اسی میں اسے زندہ رہنا ضروری ہوتا ہے۔ اسی لیے میں اسے ذاتی حق کی طرح شخصی حق قرار دیتا ہوں۔ آپ میری اشرافیہ کی تنزلی اور انحطاط کے حوالے سے لفظی بحث سے ناراض نہ ہوں کیونکہ اس لفظ اشرافیہ سے آپ بہت متاثر ہیں کیونکہ اشرافیہ موروثی اور نسل در نسل پہنچتی ہے اور سینہ

گزٹ کے حوالے سے نسلاً" بعد نسلٍ سفر کرتی ہے۔ لہٰذا اس لفظ کا مفہوم اشرافی خون لینا زیادہ بہتر ہے۔ اسی طریق سے یہی اشرافی خون عام آدمی کے جسم و جان میں بطور جامد اور غیر متحرک خون کے سرایت کر کے شامل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عام آدمی کاہلی اور مایوسی کی زندگی گزارتا ہے لیکن اس کے تیز ترین حساس شعور نے اس لفظ اشرافیہ کے تولیدی مادہ کو خود میں منتقل کر کے اپنے جسم و جان کو متحرک کر دیا۔ اشرافیہ کا مفہوم فہم العام ہے۔ یعنی "نامی گرامی" یہ وہی آدمی ہے جس نے خود کو مشہور کیا اور غالب آ کر عوام الناس کو گمنامی کے جنگل سے آزاد کرایا۔ گویا یہی خون اس میں انتقال کر کے اس کی شہرت کا باعث بنا ہے۔

اس کا مطلب یہ نکلا کہ اشرافیہ اس کی اعلیٰ ترین اور بھرپور کوشش کے نتیجہ کے برابر ہوتی ہے۔ اب یہی اشرافیہ یا اس کا بیٹا اب شہرت میں اپنا استثنائی حق محفوظ رکھتا ہے۔ بیٹے کو باپ کی مشہوری کا ورثہ ملتا ہے۔ نیز بیٹا اپنے باپ کا پرتو ہوتا ہے۔ دراصل موروثی اشرافیہ کا ایک بلاواسطہ امتیازی نشان ہوتا ہے۔ جو آئینہ کی طرح شفاف اور چاند کی مانند روشن اشرافیہ ہوتی ہے اور اسے کسی مردے سے اخذ کیا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس زندگی کی نعمت ہوتی ہے جس میں مستند قوت عمل پیدا کرتا ہے۔ پھر اس میں تحریک پیدا کر کے اور کوشش کر کے اپنے اسلاف تک پہنچ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنی حیاتی کوشش کی سطح کو بلند کر کے اشرافیہ کی سپاس گزاری کرتا ہے۔ حقیقی اشرافیہ اپنے آپ پر ذمہ داریاں خود ہی عائد کرتا ہے۔ جس کو موروثی امیرزادے ورثہ میں پاتے ہیں لیکن جو اس کی جانشینی کے عمل سے پہلے ہی اپنے اسلاف سے لے کر اپنے بعد میں آنے والوں کے ہاتھوں چند متضادات کے ساتھ منتقل کر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ جانشینی میں چینی لوگ زیادہ الٹ پلٹ کر عمل کی ترسیل کرتے ہیں اور ان کے خیال میں یہ باپ نہیں ہوتا جو بیٹے کو مشہور اور ممتاز کرتا ہے۔ لیکن بیٹا اس کارخیز میں باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کی مثال آپ یوں سمجھیے کہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہو کر اپنی ذاتی کوششوں سے اپنے اسلاف سے متعلق ایک ذخیرہ الفاظ فراہم کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ پس اس طرح جب وہ اشرافیہ ہونے کی مستند سندیں عطا کرتا ہے اور انھیں گوش گزار کرتا ہے کہ آپ کو میں اپنے عالی مرتبت اور عالی ظرف اشرافیہ کی نسل سے گریجویشن عطا کر رہا ہوں اور جنھیں میں عزت و اعزازات دے رہا ہوں وہ انھیں میں سے ہیں جو اپنے والدین کی طرح ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں وہ گریجویٹس بھی شامل ہیں جو اس کی اپنی پانچویں اور دسویں پشت کے اشرافیہ کی ناموری کے وسیلے سے یہ اعزاز حاصل کر رہے ہیں۔ اسلاف اپنے اصلی آدمی کے طفیل زندہ رہتے ہیں جن کی اشرافیہ فعال اور موثر ہوتی ہے وہ صرف ایک لفظ "تھی" "نس" ہے۔

ماضی میں لفظ اشرافیہ کو حسی ماخذ سے حاصل کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ جس سے وراثت کا مسئلہ خارج ہو جاتا تھا۔ لیکن اب اس مسئلہ کی حقیقت یہاں معلوم کرنے کا وقت بھی نہیں۔ جیساکہ "اشرافی خون" یا "اشرافی نسل" کو اکثر تاریخ میں بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بحث یہیں ختم کر دیتے ہیں۔

اشرافیہ کا رسمی ظہور سلطنت "روما" کے بعد ہوتا نظر آتا ہے۔ اشرافیہ کی موروثی حیثیت کی اخلاقی پستیوں پر تنقید اور مخالفت بھی اس کے بعد شروع ہوتی ہے۔ میں اشرافی اور عام زندگی کو ہم معنی اور ہم مشرب ہی سمجھتا ہوں جو ہر کسی پر مسلط کر دی جاتی ہے اور اس کا سلسلہ نسب کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں تاریخ کے زمان و مکان کو عبور کر جاتا ہے۔ اور عالم بالا سے جڑ جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے گویا یہ ان کی ہی ذمہ داری تھی اس طرح اشرافیہ زندگی کے خلاف کاہلوں نے جدوجہد شروع کر دی۔ ان کی اس کوشش اور جدوجہد نے اشرافی زندگی کو کمزور کر دیا ہے، جیسے وہ ٹیک لگا کر جامد ہو گئی ہے۔ جس سے یہ استمراری جمود کے چکر میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ اب یہ اس وقت تک باہر نہیں نکل سکتی جب تک اسے کوئی خارجی قوت زبردستی اسے کھینچ کر باہر نہ نکالے گی۔ بس ہم اس اصطلاح کو نیا آدمی اور عوام الناس کی اصطلاح میں موسوم کرتے ہیں۔ یہ اس کی کثرتِ تعداد کے باعث نہیں بلکہ اس کے آرام و سکون کے لیے یہ نام رکھ دیا ہے۔

جوں جوں زندگی پروان چڑھتی ہے اور ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے۔ یہ زیادہ محسوس کرنے لگتی ہے کہ آدم زادوں کی یہ کثرت تعداد (مرد و زن) کسی دوسری کوشش کے ناقابل ہونے سے ان پر بالکل اثر انداز نہیں ہو سکتی لیکن اگر ان کی حساس کوشش پر جبریت اور تشدد سے کسی قانون کا نفاذ کیا جائے تو وہ اس کے خارجی ردعمل کے طور پر اس کی ہر کوشش اور عمل کو ماننے پر تیار ہو جائیں گے۔ بدیں وجہ ہمیں چند لوگوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ وہ از خود مادہ تولید کے قابل تھے اور خوش باش تھے۔ مگر ان کو تنہا کر کے یادگاری اور ملامت قدیم بنا دیا گیا ہے۔ کم از کم ہمارا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ یہ خاص، نامور اور منتخب شدہ (ارتقائی) لوگ تھے جو بظاہر زندہ نظر آتے ہیں مگر حقیقت کا جوہر اور اصل ردعمل نہیں ہیں۔ جن کے لیے زندگی استمراری جدوجہد کرتی اور ان کی مسلسل اور لگاتار تربیت حاصل کرنے کی راہ متعین کرتی ہے۔ تربیت کرنے والے یہ عابد، زاہد اور جوگی ہوتے اس جملہ معترضہ پر آپ کو حیران نہیں ہونا چاہیے۔ اصل عوامی آدمی کی تعریف بیان کر دینے سے پہلے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون "رسم منشائے ربانی" چلا رہا ہے اور وہ لوگ کون ہیں؟ جو افضل کو برطرف کرتے ہیں۔ اب اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ انتہائی اور اصلی اقسام سے اس کا تقابلی جائزہ لیا جائے جو اس میں مخلوط ہیں وہ یہ ہیں۔ معمولی عوام (جمہور) شہرت یافتہ

یا جدوجہد کرنے والے عوام۔

اب ہم نے جذبے، خیال اور تحریک کی قوت کو ذہن نشین کر لیا ہے۔ اور یہی اس گتھلک کو کھولنے کی چابی ہے۔ اس لیے ہم اب تیزی سے آگے بڑھتے ہیں کہ بنی نوع انسان کے نفسیاتی توازن اور تقابل کو آج کے حال پر مسلط کیا گیا ہے۔ جو اس کی پیروی کرتا ہے۔ وہ اس کا پھل اور ماحاصل وصول کرتا ہے جو مابعد واقعہ حاصل ہوتا ہے اور ایک محاصل اس کا مریخ ہے جو اس کے نظام کا بیج یا اساس ہے جس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

انیسویں صدی نے جس طرح اس دنیا کو استوار کر کے منظم کیا ہے اور جس طرح اس صدی نے اپنی قوتِ بازو کے عمل سے اس نئے آدمی کو جنم دیا ہے تو ان آدم زادوں نے خوفناک بھوک و ننگ اور تمام طاقتور ذرائع اور واسطوں سے خود کو مطمئن کر کے اپنے اندر سمو لیا ہے اور خود اطمینانی کے ذرائع یہ ہیں۔ معیشت عام آدمی کی ذہنی اور جسمانی صحت و صفائی (ایسی مثال ماضی کی تاریخ میں نہیں ملتی) تکنیکی حصول اور مدنیت (جس سے میری مراد یہ ہے کہ شاندار کمیت کا جزوی علم اور عملی استعداد کار جو آج کے عوام کے تسلط ہے اور جس کا ماضی کے عوام کے پاس نہ ہونے کے برابر تھا) جب ان تمام صفتوں اور قوتوں کو یک جان اور یک زبان کر دیا تو اس کے بعد انیسویں صدی نے اس کی خود اطمینانی کے لیے اسے بے لگام کر دیا تھا اور عوام الناس کو جن کی سرشت میں پیروی کرنا ودیعت کیا ہوتا ہے چھٹی کر کے خود خلوت گزیں ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم آج ایک مضبوط اور طاقتور عوام کی حیثیت میں زندگی گزار رہے ہیں جو ماضی کے کسی عصر اور عوام سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے لیکن اس کے روایتی قسم کے اختلاف کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ یہ اپنے ساحرانہ حصار میں خود بخود پھر یہ کسی چیز یا فرد کو معاف نہیں کرتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہ خود کفیل ہے اور تربیت ناپذیری کے عمل میں داخل ہو جاتی ہے۔ یورپ میں خاص طور پر اور دنیا میں عمومی طور پر اگر عوامی یلغار کی یہی صورت حال رہی تو اس کے نتائج نمایاں طور پر سامنے آئیں گے جو ہر ایک کے لیے لائق توجہ ہیں اور کسی کو یہ احساس نہیں ہے کہ یہ عوامی یلغار کس ڈگر یا سمت کا رخ اختیار کرے گی۔ اس کے لیے جب وہ طاقتور اور مضبوط ہیں تو ضرور تباہی کا سیلاب لائیں گے۔ براعظم یورپ کو اس وقت اس مصیبت کا سامنا کرنے کی گھڑی آ پہنچی ہے جس وجہ سے یہ فوری ضرورت پیش آ گئی ہے کہ اس فوری مسئلے کو حل کرنے کے لیے اعلیٰ اقلیتوں کی سمتوں اور رخوں کو نظر عنایت سے دیکھیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی ان کی خوب اندیشی اور دور اندیشی ناکام ہو جائے گی کیونکہ رہبانیت اور سرکشی کا بنیادی طور پر نتیجہ ہیجان خیزی کی طرف دھکیل رہا ہے اور وہ اس میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ کیونکہ وہ پیدائشی طور پر اپنی زندگی سے باہر کسی بھی شعبہ میں توجہ دینے پر ناکام ہو گئے ہیں۔ اپنی بشری حقیقت

اور تقاضا کے تحت کسی نہ کسی کی پیروی کریں گے مگر اس وقت وہ اس کو پورا کرنے کے قابل نہ ہوں گے۔ سننا بھی چاہیں گے تو سن نہ پائیں گے۔ جب پتہ چلے گا کہ وہ تو بہرے ہو گئے ہیں۔

اس کے علاوہ کسی تخیل کو ذہن میں لانا فریب نظر ہو گا لیکن پھر بھی آج کے عوامی آدمی کے معیار اور استعداد کار کا ماضی کے کسی دوسرے عصر سے موازنہ کیا جائے تو یہی عوامی آدمی ان سے افضل نظر آتا ہے۔ اس میں اتنی اہلیت اور قابلیت ہے کہ وہ اپنی تہذیب کی ساخت اور برداشت کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو جائے گا' میں اسی لیے اسے مصنوعی عمل قرار دیتا ہوں نہ کہ ترقی۔۔ کیونکہ اسے موجودہ مصنوعی تہذیبی عمل کو تحفظ دینے میں خاصی دقت ہو گی اور پیچیدگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ویسے بھی یہ عمل عیارانہ اور مکارانہ ہے۔ اس کا یہ عمل غیر موزونیت اور بدبختی کا راستہ دکھاتا ہے کہ عوامی آدمی نے تہذیب کی ساری مشینری کے استعمال اور دریافت سے متعلق بہت کچھ سیکھ لیا ہے اور جان لیا ہے لیکن پھر بھی یہ تہذیب کے بنیادی اور حقیقی اصولوں سے انحراف کرتا ہے۔ جس کے باعث یہ جہالت کے صحرا میں سرگرداں ہے۔

میں اپنے تمام قاریوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے اس نکتہ کو سمجھا اور اس نکتہ تک پہنچنے میں میری پیروی کی اور جنھوں نے ان حقائق کو کوئی اہمیت نہیں دی جن کو میں نے ایک خاص انداز میں معنی خیزی عطا کی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے عوامی زندگی کی ان تمام سرگرمیوں پر خصوصی توجہ اور اہمیت دی ہے جو صاحب استعداد' رویت پذیر اور احساس پذیری کے قابل ہیں اور ان سرگرمیوں پر بھی توجہ دی جو ناقابل احساس پذیری نادیدنی اور ناقص ہیں۔

پس! اگر وہ زیادہ گہرائی اور تربیت ناپذیری کا وہ فیصلہ شعوری اور عقلی بنیاد پر نہ کرتے جس کے نتیجہ میں ہم نے آخرالذکر کا جائزہ لیا ہے اور جو آج کے مضمون کا مقالہ خصوصی اسی لیے ہے اور جو حتمی وضاحت کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے تو ان کی سیاسی سرکشی میں زیادہ شدت نہ آئی۔

جمہور ہر معاملے میں کیوں مداخلت کرتے ہیں
اور
وہ کیوں سراسر تشدد کے ذریعے دخل اندازی کرتے ہیں

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کسی چیز کا ظہور میں آنا یا وقوع پذیر ہونا تناقض کا مظہر ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ اس کی اصل حقیقت میں قدرتی امر پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک متوسط آدمی کے دنیا میں داخل ہونے سے پہلے روح اس کے خود میں مقید ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے میں اس متوسط آدمی کی روح کو مغلوب کر دینا چاہتا ہوں کہ جو بغاوت اور سرکشی کا عنصر عوام الناس میں پیدائش سے قبل موجود تھا گویا بغاوت اسے ودیعت کی گئی ہے۔ اب جب اس کی سرکشی کو اکسایا گیا تو اس نے آج پھر عوام الناس کو گوناگوں مسائل اور مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میرے قاری مختلف انداز سے سوچتے ہیں۔ یہ بھی قدرتی امر ہوتا ہے جو اس قضیے کو مثبت اور بہتر نتیجہ خیز بناتے ہیں۔ بہت زیادہ تقویت پہنچاتا ہے۔ اس لیے کہ ممکن ہے میری سوچ میں مغالطے کی آمیزش ہو مگر یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ اس پیچیدہ اور لاینحل مسئلہ پر کوئی بھی اختلاف الرائے رکھنے والا اور میرے نظریہ سے اختلاف کرنے والا پانچ منٹ سے زیادہ گفتگو نہیں کر سکا۔ سوال یہ ہے کہ وہ میری طرح کیوں سوچیں؟ جب کہ وہ اس مسئلہ پر اختلاف الرائے کا پورا حق رکھتے ہیں۔ ماضی میں بھی صرف اپنے اطمینان کے لیے اس خیال پر نظریہ کو رد کر دیتے ہیں۔ رد کرنے کے لیے سہارا یہ لیتے ہیں کہ وہ اس نامعقول آدمی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے جسے میں نے ابھی ابھی "باغی عوام" کے نام سے پکارا ہے، حالانکہ میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ساحری طور طریقے سے اور ٹھیک ٹھاک انداز میں اس کی روح کو مغلوب کر کے ختم کر دیا جائے۔ یہ بھی ایک ساحرانہ تعمیری فکر کا ایک خاص کیس سمجھنا ہو گا۔ ہر فرد اس سلسلہ میں کئی سوالات کا ذخیرہ ذہن میں بٹھائے

ہوئے ہے۔ وہ اپنے انگلی خیالات سے مطمئن ہے اور ذہنی طور پر ان کو مکمل سمجھتا ہے اور یوں محسوس کرتاہے کہ ان خیالات کے علاوہ دنیا میں اور کوئی سوال یا مسئلہ نہیں ہے اور اپنی ذات سے باہر کسی چیز کے وجود سے انکاری ہے اگر کوئی مسئلہ یا سوال ہوتا بھی ہے تو وہ اپنے ذہنی حصار میں بند کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اسی کا نام ”عمل خود محویت“ ہے۔

عوامی آدمی خود کو مکمل انسان سمجھتا ہے۔ جب کہ منتخب شدہ آدمی اپنے خود کو نسب کی عینک سے دیکھتا ہے۔ اپنے کھوکھلے پن اور شیخی بگھارنے کی ضرورت اور خوشی محسوس کرتا ہے جبکہ اس عین ذات اس کے مکمل ہونے پر یقین نہیں کرتی۔ یہ آدمی ہوشیار اور چالاک نہیں ہوتا مگر اپنی افادیت اور نسبی حوالے سے جاگ اٹھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی عین ذات کو بناوٹ، فرضی اور مشکوک کرداروں کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ بدیں وجہ یہ نکھٹو آدمی بروقت دوسروں کی مدد کرنے پر تیار رہتا ہے اور اپنے نظریئے کو مکمل کرنے کے لیے ان سے تائید حاصل کرنے کے درپے رہتا ہے اور اپنی ہست و بود منوانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ آپ اسے یوں سمجھنے کی کوشش کریں کہ وہ اسی طرح اس روگی ریاست کے اندھے، بہرے کنویں کے نازنخروں سے اپنے خود کے ”شریف روح“ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جو مکمل اور کھری اور حقیقی سچائی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس آج کا متوسط آدمی اور ہمارے اس نئے آدمی کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ اپنی کثرت تعداد پر بھی شبہ کرے۔ اسے یہ خود اعتمادی حضرت آدم کی بہشت سے ملی ہوتی ہے۔ اس کی اس روح کو دریافت کرنے میں رکاوٹ ساحری کے حصاری تجربات سے حاصل شدہ لوازم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ دوسرے شخص سے اپنا موازنہ کرتا ہے۔ اس کے موازنہ کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے خود سے باہر آتا ہے اور اپنی عین ذات کو کسی پڑوسی میں منتقل کر دیتا ہے۔ گویا یہ ترک سکونت اختیار کرنے کے قابل ہے۔

حالانکہ یہ فریب کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ ہم ذات کی اس قسم سے اختلاف کرتے ہیں کیونکہ یہ تفاوت اور بے وقوفی عقل مند آدمی میں ازل سے پائی جاتی ہے۔ آخرالذکر کو اس کی اپنی دل ربائی بھی اسے ایک احمق کی طرح نچلے درجہ میں دھکیل دیتی ہے۔ اب وہ اپنی نادانی سے شرمندہ ہو کر اپنی دل ربائی کے حصار سے باہر آنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی یہی کوشش عدم اعتدالی کے نام سے موسوم ہے۔ مگر احمق تو ہوتا ہی وہ ہے جو اپنے خود پر شک و شبہ نہیں کرتا۔ ہر ایک سے اپنے آپ کو زیرک سمجھتا ہے۔ اپنی ہی خود فریبی سے اطمینان و سکون پاتا ہے اور اس کا یہی فعل اور سوچ اسے نادانی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ جس طرح کیڑے مکوڑوں کو ان کے اپنے روزن سے باہر نکالنا مشکل ہوتا ہے ایسے ہی اس احمق کو اس کی نادانی کے کنویں سے باہر نکالنا ناممکن ہوتا ہے۔ جب تک اسے

تھوڑی دیر کے لیے کسی دوسری جگہ منتقل نہ کر دیں' اس طرح اس کی کوری بصارت اور غبی ذہن کو دوسری طرف کسی منظرِ نوحہ گری میں مصروف کر دیں۔ اس لیے کہ بے وقوف ہمیشہ بے وقوف ہی رہتا ہے۔ استقامت اور استقلال سے محروم ہوتا ہے۔ اسی لیے ایک بار "انٹونی فرانس" نے کہا تھا کہ "احمق" جھوٹے اور عیار' مکار اور چکر باز سے زیادہ بدتر ہوتا ہے۔ بہ نسبت جھوٹے اور عیار کے۔ جبکہ جھوٹا اور عیار کبھی کسی وقت آرام بھی کرتا ہے اور احمق کبھی آرام نہیں کرتا۔

میں نے اکثر دیکھا ہے اور کئی بار خود سے سوال کیا ہے کہ کئی لوگ اپنی زندگی کے سارے عہد میں اپنے پڑوسیوں کی نادانی کے باعث تصادم کی صورت میں اکثر اذیت میں رہتے ہیں لیکن اس ہیبت ناک اذیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس لیے میں نے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی ہے۔

عوامی آدمی کے احمق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن آج معاملہ برعکس ہے۔ یہ آدمی زیادہ ہوشیار اور چالاک ہوتا ہے۔ ماضی کے کسی عصر کے آدمی سے کہیں زیادہ کشف' فراخی اور وسعت رکھتا ہے۔ لیکن اس کی عقل اور ادراک کس کام کا۔ درحقیقت وہ جو کچھ بھی غیر واضح اور گول مول محسوس کرتا ہے وہ اس کے اندر کے قیدی کی آواز ہوتی ہے جو اسے باہر نکال کر رہا کرنے سے خود ہی روک دیتی ہے اور ہمیشہ کی طرح وہ سینہ گزٹ' بدگمانی' بکھرے خیالات اور یا پھر ان سادہ لفظوں پر غور کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں حادثاتی طور پر داخل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ بڑی ہوشیاری سے اور عیاری سے وضاحت کرتا ہے۔ جنھیں وہ ہر جگہ ان کا نفاذ کرنے پر تیار بیٹھا ہے۔ اسی بات کا ذکر میں نے اس کتاب کے پہلے باب میں کر دیا تھا کہ ایسے ہی خیالات کے خدوخال کا نفاذ ہمارے طرز معاشرت پر کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ہمارے عہد کی اہم ضرورت بھی ہے اور یہ آدمی اپنی خود پر یقین رکھتا ہے کہ وہ اعلیٰ ترین ہے۔ یہ کہ وہ جس کے حقوق کا نفاذ چاہتا ہے یا پھر ایک عامیانہ پن کو ایک حق کے طور پر استعمال کرنے کا دعویدار ہے۔ آج کے جدید عہد میں یہی ذہین' عوامی اور بازاری آدمی حکومت کرتا ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے جو اس کے جدید ہونے کی دلالت کرتا ہے اور جسے ماضی میں کبھی کسی نے قبول کرنے اور جذب کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ ماضی کی یورپی تاریخ سے موجودہ زمانے تک کم از کم اسے عامیانہ اور بازاری قسم کے آدمی پر ایسے خیالات کی بنا پر کبھی یقین نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا اعتقاد صرف روائتی تجربات' کہاوتیں' طور طریق اور چال چلن پر ہوتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی "ریاضیاتی" رائے کا نہیں سوچا تھا کہ یہ مسئلہ یوں بھی ہوتا ہے۔ اسے کس طرح حل کرنا ہے اور

ان کو کیسے حل کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ مثال کے طور پر اس بازاری آدمی نے کبھی سیاست اور ادب پر حساب کے حوالے سے نظر نہیں ڈالی تھی کہ سیاست داں اس سے متعلق اچھے یا برے کیا منصوبے بناتے ہیں۔ کیا اس نے اسے عطیہ سمجھا ہے؟ یا کیا اس نے اس کی دستگیری کی ہے؟ لیکن اس کے اس فعل کو ایک صدائے باز گشت تک محدود کر دیا گیا ہے اور سوچتا ہوں کہ اس کی تخلیقی سرگرمیاں دوسروں کے مقابلہ میں مثبت تھیں یا منفی تھیں، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے اس کے خیالات کو رد کیا ہو یا اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔ حتیٰ کہ اس کے خیالات و نظریات کے خلاف منصف یا عدالتی جج نے فیصلہ سنایا ہو کیونکہ وہ اس کے تمام عدالتی اختیارات اور فیصلوں سے خود کو برتر اور طاقتور سمجھتا تھا۔ اسی طرح عوامی زندگی کے دوسرے شعبوں فنون لطیفہ اور دیگر کاروبار حیات میں اسے مکمل حکومتی اختیارات حاصل ہونے کی بنا پر وہ کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ اسے یہ حق حد بندی پیدائشی اور نسبی طور پر ملا ہوا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ غیر سند یافتہ ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود اگر کوئی اس کی دخل اندازی برداشت نہ کرے گا یا کوئی اس کے اختیارات میں دخل اندازی کرتا تو وہ اسے موثر طور پر روک دیتا کیونکہ اسے یہ حق وراثت میں ملا ہوا تھا۔ اس کے اس فعل کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ایک عامی فرد اپنے آپ کو اس سے الگ تھلگ کر لیتا۔ عوامی زندگی کی کسی سرگرمی کے بارے میں خیال تک نہ کرتا جو اس کے بڑے حصے کے خدوخال اور کردار نگاری کا بڑا اصول ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس آج کا متوسط آدمی خوداپنے اصول اور نظریہ کا ریاضیاتی طور پر سوچتا ہے اور فکر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا متوسط آدمی کائنات کے تمام واقعات جو وقوع ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں اور جو آئندہ ہوں گے ان کے بارے میں اب کلی اور حتمی خیالات اور نظریات کا حساب کتاب رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے اپنی قوت سامعہ کو کہیں گم کر دیا تھا یا اس نے اس سرمایہ کو اپنے ذہن کے کسی گوشے میں کہیں قید کر لیا تھا وہ دوسروں کی قوت سامعہ پر کیوں کان دھرے جبکہ اس کی اپنی قوت سامعہ کے تمام لوازمات موجود ہیں؟ دوسروں کی قوت سامعہ کو استعمال کرنے کا اب کوئی جواز نہیں ہے جبکہ اس کی اپنی فہم و فراست، بصری اور حتمی فیصلے کرنے کی تمام قوتیں اس کے خود کے پاس موجود ہیں۔ عوامی زندگی میں اب اس سے کوئی سوال نہیں کرتا کہ وہ اس میں مداخلت کرے یا نہ کرے۔ جبکہ یہ اسی طرح یعنی پہلے کی طرح اندھے بہرے کے طور پر لمحہ موجود میں رہتا ہے اور جو اب اپنے فیصلے اور مشوروں کا نفاذ خود کرتا ہے۔

کیا یہ مناسب صورت حال نہیں؟ کیا یہ انتہائی ترقی کرنے کا امتیاز نہیں ہے؟ کہ وہ عوام کی خاطر خود جانکاری کرتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اب جوان اور روشن خیال ہو چکا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اس لیے کہ متوسط درجے کے آدمی کے خیالات و نظریات غیر مستند ہوتے ہیں۔ اس

لیے اس کی ثقافت پر بھی اس کا قبضہ ہوتا ہے۔ اس کے خیال سطحی ہوتے ہیں جن پر وہ حقیقت کا خوب رنگ چڑھاتا ہے۔ جو بھی ایسے خیالوں اور خوابوں کی خواہش کرتا ہے اسے چاہیے کہ سب سے پہلے سچائی اور صداقت کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے اور اسے اس کھیل کے تمام مجوزہ قوانین اور اصولوں کو تسلیم کرنا ہو گا اور ان کا نفاذ کرنا ہو گا۔ نظریات اور خیالات کی گردان کرتے رہنے سے اسے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ اسے حاکم بالا سے باقاعدہ اجازت لینا ہو گی۔ تسلسل کے ساتھ ساتھ ایک معیار مقرر کیا جاتا ہے۔ جس کے خلاف اپیل اور بحث کرنا بھی شامل ہوتا ہے اور یہ وہی معیاری اصول و ضوابط ہیں جن پر ثقافتی قدریں تکیہ کرتی ہیں۔ مجھے ان کی ہیئت و صورت سے بحث نہیں کرنا۔ مجھے کہنا صرف یہ ہے کہ جہاں کوئی معیار نہیں وہاں کوئی کلچر نہیں ہوتا اسی لیے میں اب اپنے ساتھیوں کی توجہ چاہتا ہوں کہ جہاں کلچر نہیں ہوتا وہاں قوانین کے نفاذ کے ضابطے اور اصول نہیں ہوتے کہ جن کے خلاف اپیل دائر کی جا سکے۔جہاں کلچر نہیں ہو گا وہاں عقلی دلائل اور موقف تسلیم نہیں کیا جاتا ہے کہ جنس کی بنا پر اس قضیہ کا حوالہ(۱) دیا جائے اور جہاں کلچر نہیں ہوتا وہاں اقتصادی تعلقات میں باضابطہ طور پر کوئی اصول کارفرما نہیں ہوتا کہ اس کے مفاد کا تحفظ کیا جائے جہاں کلچر نہیں ہوتا وہاں شعبہ فنون لطیفہ کے جمالیاتی ذوق میں اختلاف پر نہ کوئی اپنے موقف میں دلیل دیتا ہے اور نہ کوئی اس کی تائید و حمایت کرتا ہے۔

۱- اگر کوئی فرد کسی بحث میں سچائی اور صداقت کے ساتھ ہم سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ اگر وہ صداقت پانے کی خواہش بھی نہیں رکھتا تو پھر وہ بے عقل اور وحشی فرد ہوتا ہے۔ اس وقت درحقیقت ہماری صورت حال بھی اسی عوامی آدمی کی طرح ہے جو لکھنے بولنے اور لیکچر دینے کے موقع پر عقلی طور پر وحشی بن جاتا ہے۔

جب یہ سب کچھ موجود نہ ہو تو پھر کلچر نہیں ہوتا بلکہ میں اسے ناہمواریت' بے مقصدیت کے باعث جان بوجھ کر بربریت کہوں گا تو آیئے! ہم اپنے خود کو دھوکا دہی سے باہر نکالیں کہ عوام نے ترقی پسندانہ نظریات کے زیر اثر ترقی پسندانہ بغاوت اور یلغار کا آغاز کر دیا ہے جو مسافر بھی ہجرت کر کے کسی اور وحشی ملک میں پہنچتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہاں حکمرانی کرنے کا کوئی اصول نہیں اور جہاں کسی قضیئے یا مقدمہ میں اپیل کرنا ممکن ہو۔ یہ میں خاص طور پر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس وحشی ملک میں وحشی معیار بھی نہیں ہوتے۔ معیاروں کی غیر موجودگی میں بربریت کی حکومت ہوتی ہے۔ جہاں پر آپ اپیل کر سکتے ہیں۔

کلچر کے دکھائے جانے والے عام درجوں کو معیاروں کے پیمانے اور کیمرے کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ جہاں درستگی کی بہت کم گنجایش ہوگی تو وہاں قوانین کی موجودگی ہی کلی طور پر حکمران ہوگی اور جہاں ان کی کثرت تعداد ہوتی ہے تو پھر وہ ان تمام سرگرمیوں کی تفاصیل میں زبردستی دخل اندازی کرتے ہیں۔

میں نے ہسپانیہ کے فکری کلچر کو اختصار سے پیش کر دیا ہے۔ اس کو نہ کم اور نہ زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے بلکہ اس کو اپنی ذاتی، بشری ذمہ داری، آگاہی اور پوری ذاتی سچائی کے ساتھ آراستہ کر دیا ہے۔ اسی طرح جیسے اکثر ادیب، لکھاری اور مقرر اپنی تخلیقات کو آراستہ کرتے ہیں۔ یہی غلط اور صحیح ساعت کا طریقہ اختیار کرنے کی آورش دیتا ہے۔ سچائی کسی کی رسائی میں نہیں ہوتی لیکن اس کے اندرونی تحفظات کی کمی بیشی کے باعث جو بنیادی ضروریات کے لیے فیصلہ درست کرتی ہے۔ ہم ملکی پادری کی طرف دیکھتے ہیں جو میںچن کے نظریات اور عقائد کو رد کرتے ہیں لیکن یہ دیکھنے اور سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ میںچن کے عقائد اور نظریات کیا تھے۔

یورپ میں گزشتہ چند سالوں میں عجیب و غریب واقعات رونما ہو چکے ہیں جنھیں ہر کوئی اپنی مشاہداتی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ ان عجیب چیزوں اور واقعات سے ملتی جلتی مثال دینے کے لیے میں یہاں صرف سیاسی تحریکات کا ذکر کرتا ہوں۔ مثال کے طور پر انجمن سازی، مزدور یونین کا قیام اور فسطائیت ہمیں ان انوکھے واقعات کو صرف اس انداز سے نہیں دیکھنا چاہیے کہ وہ صرف انوکھے اور عجیب ہیں یا یہ کہ وہ انتہائی جدید ہیں۔ یورپ میں اس جدت پر جوش و جذبہ موجود ہے اور یہ جوش و جذبہ ایک فطری امر ہے کہ اس نے غیر مستحکم یورپ میں ایک ہلچل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مطلب یہ کہ بے مثال شیفتگی اور عوام کا جوش و جذبہ قابل دید ہے۔ کیونکہ ان انجمنوں کے قیام نے یورپ پر انتہائی خوشگوار اور بہتر اثرات مرتب کیے ہیں جن کے سراغ کا تعلق ہمیں ماضی کی تاریخ سے جڑتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی اجنبیت کے عنصر کی حقیقت کو اس کے نرالے اور انوکھے پن سے منسوب نہ کیا جائے بلکہ اس اجنبیت سے پیدا ہونے والے غیر معمولی اثرات کی حقیقت کے آئینہ میں دیکھنا چاہیے۔ انجمن سازی اور فسطائیت کے زیر اثر یورپ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ آدم زادہ اپنی ہستی کی وجہ یا صداقت پر کوئی دلیل نہیں دیتا۔ لیکن بڑی سادگی سے اپنی آراء کو خود میں تحلیل کر کے ان کا نفاذ کر دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی نئی چیز ایجاد ہوئی ہے۔ "کہ حق کو معقول نہیں چاہیے اور جوازیت کو نامعقول نہیں چاہیے"۔ (یہ حوالہ ڈان کو مکروٹ کے معروف مقالہ سے ماخوذ ہے۔ مترجم)

یہاں میں عوام کی ایک اور نئی فکری تفریح کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں کہ عوام نے یہ سوچے بغیر کہ ان میں کوئی اہلیت ہے یا نہیں اور انھوں نے سوسائٹی پر حکمرانی کا فیصلہ سنا دیا ہے۔ ان کے اس فیصلے نے ان کے خام سیاسی چال چلن اور ان کی نئی سیاسی افتاد طبع نے پر اعتماد طرز معاشرت پر حکمرانی کرنے کا انکشاف کیا ہے۔ لیکن اس کی چابی ان کے عقلی اور فکری ساحری ازم کے پاس موجود ہے اس لیے کہ اس متوسط فرد کے دماغ میں "خیالات" کا ایک جم غفیر موجزن ہے۔ مگر وہ فکری استعداد کے شعبہ میں کمی محسوس کرتا ہے اور اسے ان نایاب خیالات کا کوئی علم نہیں کہ وہ نایاب خیالات کس فضا میں کہاں بستے ہیں؟ لیکن پھر بھی وہ ان خیالات اور آراء کو پانے کی تلاش میں سرگرداں ہے اور اپنے غیر مقبول اور بے رغبت خیالوں کے باوجود اس خاص صورت حال اور پہلے مفروضہ(جو اس کے خیالات اور آراء کی تہوں میں قید ہے)کو تسلیم کرتا ہے اور ان کا نفاذ چاہتا ہے۔ یوں اس کے خیالات مال و متاع کے سوا بھوکے ننگے ہوتے ہیں۔ ان میں ایسی ہی تاثیر ہوتی ہے جیسے حسن و عشق میں موسیقی کی تاثیر' خیال کو ذہن میں لانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے حاصل کرنے کا جواز تلاش کرتا ہے۔ اس وجہ سے اسے یقین ہو جاتا ہے کہ معقولیت نام کی کوئی شے نہیں ہوتی کہ جس میں قابل فہم صداقت کی دنیا موجود ہے کہ جس پر وہ کوئی رائے قائم کرنا چاہتا ہے اور یہی وہ رائے جو اپنے مقتدر اعلیٰ کو اپیل دائر کرنے' اس کے قوانین و ضوابط اور فیصلوں کو خود تسلیم کرنے کے بعد اسے خود پیش کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ پر اعتماد ہوتا ہے کہ اس کا باہمی اشتراک اس کے ساتھ ملاقاتوں سے قائم رہ سکتا ہے کہ جس میں اس کے خیالات کی معقولیت کو زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ لیکن عوامی آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کہیں گم ہو کر رہ گیا ہے اگر اس نے مباحثہ کے اصول کو تسلیم کر لیا ہے تو وہ مقتدر اعلیٰ کے مجوزہ قوانین اور اصول و ضوابط کو تسلیم کرنے سے کیوں انکار کرتا ہے؟ اسی جدت اور عجیب و غریب چیز نے بحث کے عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے اور اس طرح وہ باہمی اشتراک کی تمام اقسام سے نفرت کا اظہار کر دیتا ہے جو اس بات کی دلالت ہے کہ وہ عام گفتگو سے لے کر پارلیمنٹ تک کی جانے والی بحث اور گفتگو کو تسلیم کرتا ہے۔ گویا اس عام زندگی کی بنیاد کلچر پر ہوتی ہے اور وہ اس سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ اور جو عام زندگی معیاروں کے اثرات سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ ایک بار پھر بربریت کی دنیا میں چلی جاتی ہے۔ تمام معمولات زندگی کچل دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کر کے براہ راست اس کا نفاذ کر دیتے ہیں۔ جس روح کے ساحرانہ پن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے یہ عوام اس (روح) کی زندگی کے سارے تناظر میں مداخلت کرنے پر مائل ہوتی ہے نیز تاکید کرتی ہے اس کا ساحرانہ پن عوام کو صرف ایک بات پر اکساتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں براہ راست مداخلت کریں۔

ہم نے جب اپنے عہد کے حسب و نسب کے ماخذ کی تجدید کا ذمہ اٹھایا ہے تو یہ ہمارا مشاہداتی انکشاف ہے کہ ہمارے پہلے مطالعہ کی مطابقت فرانس کے ان انجمن ساز گروپوں اور حقیقت پسندوں کے تقریباً" انیس صد موجدوں کی باضابطہ تحقیق و تجربات میں باہمی اشتراک اور گہری ہم آہنگی پائی جاتی ہے جو ان گم گشتہ گروپوں کے "براہ راست ایکشن" کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ چونکہ آدم زادہ فطرتاً" تشدد کے عمل کا استعانت پسند ہے بعض اوقات یہ استعانت ہمیں رغبت نہیں دلاتی لیکن کسی اور وقت یہی تشدد رسائی کا ذریعہ بن جاتا ہے جو ماضی میں بھی بعض اوقات حقوق انصاف کے تحفظ اور ان کے حصول کی خاطر رسائی کا ذریعہ بنتے رہے تھے۔ اس لیے کہ اسے معلوم ہے کہ یہ بھی اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ یہ قابل افسوس بات ہے کہ انسانی فطرت میں بعض اوقات تشدد کا میلان شدید ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کہ اس کا یہی تشدد کا عمل اس کے انصاف اور معقولیت کو زبردست خراج تحسین پیش کرنے کی دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے تشدد سے اس کے سوا اور کیا اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی معقولیت کو برافروختہ کیا ہے۔ ماہ گزشتہ میں ہونے والے واقعات میں کیے جانے والے تشدد کی مقدار در حقیقت اس کی قوت تھی۔ کسی حد تک اور طنزیہ طور پر ان کی اس پر تشدد حرکت کو اس کی احمقانہ روایت ہی سمجھنا چاہیے۔ جس نے اپنی معقولیت کے طور طریقوں کو کم کرنے یا قوت کے حوالے کرنے کا واضح طور پر اظہار کیا ہے۔ تہذیب صرف اس قوت کو کم کرنے یا روکنے کی کوشش کے سوا کچھ نہیں کر سکتی کہ یہ ماہ گزشتہ کے معیاری فعل کو تجدیدِ نو کی کوشش کا ماحصل قرار دے۔ اب ہم اس فوری خطرے کو واضح طور پر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ماہ گزشتہ میں تشدد کے حامیوں اور دعویداروں نے براہ راست ایکشن کر کے اس نظام کے کار پردازوں کے معیار کو الٹ پلٹا دیا تھا۔ مختصریوں سمجھیے کہ زبردستی کا باہمی اتحاد ہی معیاری تشدد ہوتا ہے کیونکہ اسی نے مثالی معیار کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس نے گزشتہ معیاروں کو منسوخ کر کے فتح حاصل کر لی ہے کیونکہ اس نے تمام متوسط اور ہمارے نظریات کے مابین فوقیت پر عمل درآمد کرانے کے عمل کو دبا دیا ہے۔ اسے ہی " میگنا کارٹا یا منشورِ آزادی" کہا جاتا ہے۔

اچھا ہوا کہ عوام اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر ماضی کو دوبارہ یاد کرنے پر تیار ہو گئی ہے اور یہ جاننے کی کوشش کرنے لگی ہے کہ ماضی کے کس حصے میں عوامی زندگی نے کیا رول ادا کیا تھا۔ چنانچہ پتہ چلا کہ ماضی میں بھی عوام نے براہ راست ایکشن جنم کی سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا گویا عوام کا یہ ایکشن بھی قدرتی امر کا ایک پرتو تھا۔ اسی دلیل اور حقیقت نے میرے اس مقالہ خصوصی کو مضبوطی اور استقلال بخشا ہے۔ عوام الناس کے زیرِ اثر اقتدار کی زندگی جب سرگرمی کا مظاہرہ کرتی ہے تو اس کی زندگی حادثاتی اور قلیل الوقوع مداخلت سے گزر کر عملی وجودیت میں داخل ہو جاتی ہے۔ ان

کے اس "براہ راست ایکشن" کو سرکاری سطح پر تسلیم کیا گیا ہے اور پہچان کر لی گئی ہے۔

ہماری ساری فرقہ وارانہ زندگی اسی حکومت کے زیر اثر رہتی ہے کہ جس کے عہد میں بلاواسطہ مقتدر (حکومت) سے اپیل کرنے کو کچل دیا جاتا ہے۔ سماجی تعلقات، اچھے عوامی سلوک، خیر خواہانہ روش اور بہتر اسلوب میں زیادہ دیر حکمرانی کی جا سکتی ہے۔ جیساکہ ادب میں "براہ راست ایکشن" کو توہین قرار دیا جاتا ہے، جنسی تعلقات پر لگائی جانے والی پابندیوں کو کم کیا جا سکتا ہے۔"

بندشیں، معیار، شائستگی، خوش اخلاقی، بلاواسطہ طور طریق، انصاف، اعتقاد اور ایمان! کیا چیز ہیں؟ انھیں کیوں ایجاد کیا گیا ہے اور یہ پیچیدگیاں، یہ پھندے کیوں خلق کیے ہیں؟ ان سب کا معنیٰ، خلاصہ اور مفہوم صرف ایک لفظ "تہذیب" میں پنہاں ہے جو ایک نامکمل تصور کی حالت میں ہر "شہری اور مدنی" میں موجود ہے۔ شہری اپنے خالص حسب نسب کے ماخذ کا انکشاف کرتا ہے۔ یہ اپنے تمام شعبوں کے تعاون اور اپنی کوشش سے شہر نو تعمیر کرتا ہے۔ گروپوں اور باہمی اشتراک اور عوامی زندگی کو ممکن بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہم نے تہذیب کے جن رائے دہندگان کو ابھی شمار کیا ہے یعنی آپ کی ملاقات بھی اس پرانے اور عام اساسی عنصر سے کرائی ہے۔ دراصل یہ تمام جدید سہولتیں ہر ترقی پسند فرد کی خواہش ہوتی ہیں۔ جس کی تکمیل کے لیے وہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔ اس طرح ان کی یہ خواہش، مرضی، نیت باہمی اشتراک کا مظہر ہوتی ہے۔ کہ وہ مشترک اور عامیانہ زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ آدم زاد قدرے غیر مہذب ہوتا ہے اور جس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ دوسروں کی زندگی کا حساب کتاب نہیں رکھتا۔ اس لیے تاریخ کے تمام جگ میں آدم زاد بے قاعدہ، ٹوٹ پھوٹ اور چھوٹے بڑے گروپوں میں نمو پاتا رہا ہے۔ اپنی اس تشکیل میں وہ آپس میں معاندانہ اور مخالفانہ رویے اختیار کرتے رہے ہیں۔ بکھرتے رہے پھیلتے رہے اور بالآخر وہ ایک ایک کر کے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا اور جدا جدا ہو کر الگ الگ بستیاں تعمیر کرتے چلے آ رہے ہیں۔

یہ وہ سیاسی نظریہ اور جبلی عقیدہ ہے جس نے مشترک زندگی گزارنے کی عظیم جدوجہد کی راہ ہمیں دکھائی ہے۔ یہ وہی نظریے ہیں جنھوں نے جدید اور آزاد جمہوریت کے نظریہ آبیاری کی اور پروان چڑھایا۔ یہ وہی آزاد جمہوریت کا نظریہ ہے۔ جس نے عوامی زندگی کو انتہائی عزم عطا کیا ہے کہ جو اپنے پڑوسیوں کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے بلکہ ان کی حفاظت بھی کرتا ہے اور ماضی کے بلاواسطہ ایکشن کی نفی بھی کرتا ہے۔ نظریہ آزاد خیالی میں سیاسی حقوق وہ اعلیٰ اصول ہے جس کے کارن عوامی مقتدر، تمام قوتوں کے باوجود خود پر بھی پابندیاں لگاتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ خود انحصاری کے تحت جدوجہد کرنے کی اجازت دیتی ہے اور یہ خیال نہیں کرتی کہ اس کے مخالفین اس کے خلاف کیا کرتے ہیں یہ "

خود جیو اور جینے دو" کے نادر اصول پر حکومت کرتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ریاستی حکومت اس کو زندگی زندہ دلی سے گزارنے کا حق دیتی ہے اور اس کو بھی جینے کا حق دیتے ہیں جو اس کی حکومت کی مخالفت یا رخنہ اندازی کرتے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اکثریت اپنے اقلیتی مخالفین کو کچل دیتی ہے اس طرح کا یہ عوامی مقتدر کام نہیں کرتی۔ یہی نظریہ آزاد خیالی کا اصل لبِ لباب ہے اور نچوڑ ہے۔ اے آزاد خیالی! تمھیں آج بھی یاد کرتے ہیں، کل بھی یاد کرتے رہیں گے۔ یہ فیاضی کی اعلیٰ و ارفع قسم ہے۔ یہ حق کھرا اور سچ ہے۔ اس کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ یہ اقلیتوں کو بھی بھرپور زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرتی رہتی ہے۔ گویا یہ ایک شریف آدمی کی شریفانہ چیخ اور پکار ہے۔ جس کی مثال اس خطہ ارضی میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی اور ایسی چیخ کبھی سنائی نہیں دی ہے جو اپنے مصمم ارادے سے اپنے دشمنوں کو بھی زندگی کی تمام سہولتیں اور آرام پہنچانے میں دن رات مصروف عمل ہے۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ اپنے کمزور دشمن کی حفاظت کرتا ہے۔ اچھا سلوک کرتا ہے۔ غور کرو تو معلوم ہو گا کہ بنی نوع انسان ازل سے شریفانہ سلوک، رویے کی مماثلت، اس قدر تناقضات کا مظہر، اس قدر الائشوں سے پاک اور اس قدر بازی گری پر مبنی کیوں حلیف قدرت ہے۔ لیکن اس لمحہ موجود میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہی بنی نوع انسان اس قدرتی خوبصورتی کے اس جمہوری چنگل سے جان چھڑانے کے لیے بے قرار اور بے تاب نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا نظام فطرت ہے جو کٹھن اور پیچدار ہے اور جس کے گہرے اثرات اس ارضی خطے پر مرتب ہونے کے لیے بے قرار ہیں۔

اپنی ہست و بود میں دشمن کو بھی حصہ دار بنائیں! اور اپوزیشن سے مل کر حکومت کریں۔

کیا یہ ناز کی انتہا نہیں ہے اور کیا یہ خارج از وہم و گمان نہیں ہے؟ یہ اپوزیشن ہی ہے جو اس کی خوبیوں اور برائیوں کو واضح طور پر آشکارا کرتی ہے۔ اس جہان عالم میں چند ایک ایسے ممالک ہیں جہاں پر اپوزیشن اپنا بھرپور کردار ادا کر رہی ہے اور تقریباً" ان تمام ممالک میں ایک ہی بنی نوع عوامی سرکار پر بڑا دباؤ اور اثر رکھتی ہے۔ بعض جگہوں پر اپوزیشن عوامی سرکار کے تختے الٹ دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اپنے مخالف گروپوں کو نہ صرف برداشت کرتی ہے بلکہ ان کو زندہ رہنے کے تمام مواقع اور ذرائع بھی فراہم کرتی ہے۔ عوام پر جو اعتماد کرتا ہے تو اس کی پیوستہ کاری کر کے کثرتی تعداد کے ذریعے اپنے ہونے اور منوانے کا اظہار کرتی ہے۔ یہ عوامی اکثریتی اتھارٹی اپنی جان کے دشمن کو بھی شریک سفر رکھتی ہے۔

قدیم و جدید

میں یہاں ایک ضروری صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے آپ کو دعوت فکر دے رہا ہوں۔ یہ ایک حقیقی صورت حال کا جائزہ ہے۔ جس کی ماہیت کے جوہر مشکوک اور مبہم نظر آتے ہیں۔ میں نے شروع میں اسی صورت حال کے خاکہ کے خدوخال سے آگاہ کر دیا تھا اور خاص طور پر عوامی "بغاوت" کا ذکر کیا تھا۔ میں یہاں اس کے صرف دو پہلو پیش کرتا ہوں۔ ان دونوں پہلوؤں کو ہر کوئی نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کی زبردست طور پر وضاحت بھی چاہتا ہے۔ موافق اور ناموافق ہونے کا اظہار بھی کرتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کے بارے میں نہ صرف ہمارے ذہنوں میں شبہات اور غیر یقینی پائی جاتی ہے بلکہ اس میں ٹھوس حقیقت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ نہ صرف ہمارے ایک نظریے کے مطابق اچھا ہے اور دوسرے کے نظریے کے مطابق برائی ہے بلکہ اس میں دو قوتیں زندگی کی "فتح" یا "موت" خود اس کی سچائی کا ثبوت ہیں۔

میں اس کا ذکر بھی کر دوں کہ تاریخ کے فلسفہ کی روشنی میں اس موضوع کے خلاصہ کو اس کی سچائی کے حوالے سے روشناس کروایا جائے۔ لیکن ظاہر ہے میں اس کی بنیاد اپنے ہی تاریخی فلسفے کے نظریے پر رکھ رہا ہوں۔ میں تاریخ کے فلسفہ جبریت اور بربریت پر یقین نہیں رکھتا کیونکہ اس کے برعکس بھرپور زندگی اور اس بھرپور زندگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تاریخی زندگی نہایت سادہ اور آسان لمحوں میں تسکین پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بستا "کم یا زیادہ ہر کوئی ماضی کے کسی بھی نقطہ نظر پر یقین نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کی حقیقت تذبذب کے عالم میں ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہے اور اس کو اس ممکنات میں سے اس کے موافق یا مخالف فیصلہ کرنا ہوتا ہے اور یہ الہیاتی تصور کا تذبذب ہی تو ہے جو ہر جاندار چیز کے مغالطہ سے لرزاں رہتا ہے۔ عوامی بغاوت کے عملی تغیرات نے نوع انسانی کی عضویت میں بے مثال ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔ شاید کہ یہی حیاتیاتی مقدر کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ اس کی ترقی کی

حقیقت سے میں انکار بھی نہیں کر سکتا بلکہ اس کی ترقی کے اس عام نقطۂ نظر کو سچ ثابت کر کے اس کے یقین اور پر اعتمادی میں خاطر خواہ اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں اس پہلو کو حقائق کے قریب دیکھتا ہوں کہ اس کے ارتقا میں یقینی طور پر ''تلغیت'' اور ''الجھاؤ'' کے خطرہ کو مول لے کر ترقی ہوئی ہے کیونکہ اس کے نتیجہ میں اس کا زوال شروع ہوتا ہے لیکن فتح یابی' وسعت و تنزلی اور زوال کا عمل تاریخ کے زمانوں کے ممکنات' گمان اور امید و بیم سے پھوٹتا ہے۔ زندگی اجتماعی ہو یا انفرادی' ذاتی ہو یا تاریخی دنیا میں اس کا اپنا ایک وجود ہوتا ہے اور اس وجود زندگی کا جوہر' کارناموں اور نمایاں کام اور واقعات وثوقی خطرے سے وابستہ ہوتا ہے جسے ہم کردار کے حوالے سے نہایت محتاط انداز میں ڈرامہ کہہ سکتے ہیں۔

یہ حقیقت بھی عام طور پر دیکھی گئی ہے کہ یہ صداقت بحرانی لمحوں میں زیادہ قوت پکڑتی ہے اور دبدبہ والی طاقت حاصل کر لیتی ہے۔ جس طرح حال کے بحرانی لمحوں نے اس نقطہ نظر کو بہت زیادہ قوت و توانائی عطا کی ہے۔ اسی طرح اب رہبری کے انداز میں نئے مناظر عوامی قلمرو میں ہم دیکھتے آ رہے ہیں۔ ہم نے اس کو ''براہ راست عمل'' کا نام دے رکھا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ اصطلاح مستقبل میں-اپنے کمال تک پہنچ جائے گی۔ یہ بات واضح کرتی ہے کہ ہر پرانی تہذیب حیاتیاتی توانائیوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھنے کا اپنا سفر جاری رکھتی ہے اور اپنی سنگ دلی کے اس بوجھ کو محسوس نہیں کرتی جو زندگی کی راہ میں رکاوٹ اور کھچھٹ کا باعث بنتی ہے۔ یہاں تک کہ مردہ ادارے' تشخیصی قدریں اور انداز و اطوار بھی حیات نو پا چکے ہیں لیکن اس وقت نے یہ ثابت کر دیا ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ بے معنی' غیر ضروری اور پیچیدہ مسائل کا حل اور وہ معیاری قدریں جن کے جوہر میں کمی ہوتی ہے' کو اس تہذیب کے بلاواسطہ عمل (براہ راست) عمل کے نمائندوں اس عہد کے اختصار اور آسان کاری میں جوش و جذبہ اور ولولہ پیدا کیا جائے کہ رومانوی دور کے بڑے ہیٹ اور فراک و کوٹ کو آج کے دور میں بلا آستین قمیض اور چھوٹے ہیٹ ''ڈنبیلی'' میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ سامنے آ رہا ہے کہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے عمل تغیر سے بہت کچھ حاصل کیا جاتا ہے اس طرح جسے رومانوی درخت کی شاخ تراشنے کے بعد تمنا پوری کرنے اور نقل کی تلقین پر عمل پیرا ہو کر کسی دوسرے درخت کے ساتھ پیوند لگا کر منگنول بیری (اس کا پھل) کو کئی حصے زیادہ حاصل کیا جاتا ہے۔ جس طرح غلط بیل کو جوڑ کر مرغولے دار اور چکر دار بیل کا ''فتنہ'' پیدا کیا جاتا ہے۔ یقیناً'' اس کے سایہ میں پلنے والے پودوں کو سورج کی روشنی سے محروم ہونا پڑتا ہے۔

ہر قسم کی سیاست کو بالائے طاق رکھتے ہوئے عوامی زندگی کو حقیقت کے روپ میں فوری واپس لانا ہو گا۔ یورپی اکثریتی عوام نے ابھی قلابازیوں کا عمل شروع ہی نہیں کیا تھا جس کا تقاضا

رجائیت پسند کر رہے تھے۔ ان کی خواتین نے ابھی اپنے جسموں کو ننگا نہیں کیا تھا اور نہ ہی فلسطین کے یہودی راہبوں نے صوفیانہ خیالات و نظریات سے قطع تعلق کر کے اپنی اصل زندگی کا رخ اختیار کیا تھا۔ میں دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتا ہوں کہ ان کے جوش و خروش نے بڑے نظم و نسق کے ساتھ ان کی اپنی زندگی کو تہی دست کر دینے کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اپنے اچھے مستقبل کی راہ صاف اور ہموار کرنے کے لیے اس عمل کو ناگزیر سمجھتے تھے اور میرا دعویٰ میری رہنمائی کرتا ہے کہ میں ماضی کے کسی عصری موضوع کے بارے میں اور دوسرے کسی بھی موضوع اور نظریے کے بارے میں اپنے دعویٰ اور خیال کو آپ کے سامنے آزادنہ طور پر پیش کر سکوں۔ میرے دعوے کا مستقبل ماضی پر حاوی ہے کیونکہ اس کے احکامات کی تکمیل اس کے اپنے نظریات خود کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ ماضی میں آزاد خیالی جیسی ہر چیز اس کی اصل حقیقت کی پڑیا میں بند ہوتی ہے۔

انیسویں صدی کے ان بڑے بڑے خطاکار ہدایت کاروں کے نظریات کو کالعدم اور ان کا پردہ چاک کرنا بہت ضروری ہے جنھوں نے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے اور ان کی پہچان کروانے میں کوتاہی برتی تھی۔ جنھوں نے مستقبل کے لیے چاک و چوبند رکھنے سے روکا تھا۔ ماضی میں کئی واقعات ملتے ہیں جو ڈھلوانوں سے بڑے آرام سے نیچے اترنے کے سہل پسندی کے راستوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان واقعات نے کند ذہن کو بھی خطرے کا الارم دے کر جگائے رکھنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بھی اپنی ذمہ داریوں کو نبھائے لیکن اس غبی اور ست ذہن کے مالک نے اپنے عصر کی ناخوشگوار خدوخال کی خصوصیات کو ہی سب کچھ جانا۔ حتیٰ کہ اس نے شادمانی کے لمحوں میں بھی اپنی ذمہ داریاں محسوس نہ کیں اور نہ ہی انہیں پورا کیا۔ آج ان فرسودہ اور مبالغہ آمیز محسوسات کو جب ہم حقیقت کی عینک سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ احمق تھے۔ وہ اپنے مستقبل کی بعض معلوم علامتوں اور خطرات کو سمجھنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ ماضی کے عصر کی سچائی کو جب وہ مانتے ہی نہ تھے اور اس کی حقیقت کے پہلوؤں کو تسلیم ہی نہ کرتے تھے تو ان کے عصر کو فوری طور پر کالعدم قرار دے دینا چاہیے۔

بیشک یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے متوازن عوام کو جھنجھوڑنے کے باعث، ان عوام کے ناموافق اور ناخوشگوار عوامل نے ہمارے حال اور مستقبل کو سنوارنے میں بڑی مدد کی ہے۔ اگر آج ہم بھی اسی انداز میں اپنے حال کے بارے میں سوچیں اور نہ غور کریں تو لاشعوری طور پر ان کے وعظوں اور وعدوں نے بھی ہمارے حال کو مفید اور خوش آئند بنانے میں سامنے رکھا تھا۔

زندگی کے اس تجربے نے ہلا اور چکرا کر رکھ دیا ہے کہ جن کی زندگی کو ہم نے کالعدم

قرار دینے کا خطرہ مول لیا ہے وہ اب بھی اپنی زندگی کو تاریخی بنا سکتے ہیں اور اپنے مقدر کے سکندر بن سکتے ہیں۔ اسے میں ایک بار پھر ترتیب دیتا ہوں۔ سوسائٹی کی سمت کا رخ متعین کرنے کا اختیار ایسے ہاتھوں میں آگیا ہے جو تہذیب و تمدن کے مروجہ اصولوں سے کوئی سروکار اور دلچسپی نہیں رکھتا کہ یہ ''تہذیب'' یا وہ ''تہذیب'' لیکن تنقیدی جائزے سے ہم ایک فیصلہ کن نقطہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ ہاں! بلاشبہ وہ سائنس کی دوسری ایجادات کے علاوہ موٹر کار اور بے حس کرنے والے طریقہ علاج میں وہ ضرور دلچسپی رکھتا تھا لیکن اس کی اس تہذیب کی حقیقت کے خدوخال میں بہت کم دلچسپی کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ ایسی ایجادات صرف اس کی اپنی خوشی کے لیے ہوتی ہیں جن کے فوائد میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ اس لیے عوام ان ایجادات اور نو ایجاد شدہ چیزوں کو بخوشی قبول کرتی ہے۔ چونکہ ان مصنوعات اور اصولوں سے عدمِ دلچسپی کے باوجود ان کو آرام و سکون ملتا ہے۔ مجھے اس حقیقت کو تسلیم کر کے آگے بڑھنا ہے اور میں بذات خود خوشی کے احساس کا اظہار کر کے اور بھی زیادہ خوش ہوں کہ جب سے طبعی سائنس کا ظہور ہوا ہے وہ ترقی میں نشاۃ ثانیہ سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ جوش و جذبہ اور ولولہ بڑھتا رہتا ہے جو کہ نہایت ہی اطمینان بخش صورت حال ہے اگر اس کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو ایک مناسب تعداد نے سائنسی تحقیقات کے لیے اپنی خدمات بلکہ اپنی زندگیوں کو وقف کر رکھا ہے اور ان کی تعداد نسل انسانی کی تعداد کے تناسب سے زیادہ نہیں رہی ہے۔ میں آپ کو ایک بار پھر یاددہانی کرواتا ہوں کہ زوال پذیری کا پہلا وقوعہ بھی انیسویں صدی کے وسط میں نسل انسانی کے ساتھ پیش آیا۔ اس صدی کا یہ درمیانہ عصر طالب علموں کو سائنسی تحقیق کی طرف کوئی ترغیب یا کشش پیدا نہیں کرتا تھا لیکن اس کے برعکس سائنس کی ایجادات اور سائنسی آلات و ادویات پر کیے جانے والے تحقیقی کاموں پر سے استفادہ کرنے کے لیے بے تاب نظر آتے تھے۔ ہم اس کی طوالت سے بچتے بچاتے تحقیقات اور دوسرے وقوعات کی طرف اشارہ کرتے چلیں مثلاً'' سیاست' فنون لطیفہ' اخلاقیات' مذہب اور اسلامیات بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہمیں نظر آتی ہے۔

صورت حال کا یہ باہمی تناقض اور اس تناقض کی معنی خیزی ہم پر کیا مفہوم آشکارا کرتی ہے؟ یہی بات قابل غور ہے اور اس نے اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کیونکہ اسی نے ہمارے حال کو گھیر رکھا ہے کہ یہ قدیم فرد ہے اور قدیم سوچ کا مالک ہے۔ اس مہذب دنیا کی موجودگی میں یہ سوچ قدیم ہے اور سوچ کا مالک بھی قدیم ہے۔ اسی نظریے اور سوچ نے اس مہذب دنیا کی موجودگی میں طبعی طور پر تسلط قائم کر رکھا ہے۔ جبکہ موجودہ حال کی دنیا بہت مہذب ہے اور اس کے ترقی یافتہ ہونے کی موجودگی نے طبعی سائنس کا تسلط قائم کیا ہے کیونکہ یہ نہایت ہی تہذیب یافتہ دنیا ہے

لیکن اس کے باوجود بھی اس میں رہنے والے اور باشندے مہذب نہیں ہیں۔ وہ اپنے ماحول اور تہذیبی دنیا کو نہیں دیکھتے یہ دنیا کے اس حال کو صرف مظہرِ قدرت کے طور پر جانتا ہے۔ سمجھتا ہے۔ تحقیق بھی کرتا ہے اور ثابت کرتا ہے۔ موٹر سائیکل ایجاد کر کے اس سے سکون و آرام اور خوشیاں حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا پختہ ایمان ہے کہ جنتی درخت کا پھل ہے وہ اپنے روح کی گہرائیوں سے اس تہذیب و تمدن کی انتہائی ترقی یافتہ صورت قابل یقین سمجھتا وہ قدیم فرد ہمارے عہد میں ہماری ایجادات میں استعمال کیے جانے والے اصولوں کا خوش دلی سے استقبال نہیں کرتا۔ تاریخ کی ورق گردانی کر کے جب میں لفظ "راٹھیو" کے محل استعمال کی ترتیب و ترکیب کو محسوس کرتا ہوں تو میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہم "بربروں" کے عمومی حملوں کی گواہی دیتے ہیں تو مجھے یاد پڑتا ہے اور جیسے کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک جملے یا محاورے کا کمال ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرا یہ اظہار کسی صداقت یا کسی غلطی کا احاطہ کرتا ہے لیکن پھر بھی یہ جملے یا محاورے متضاد ہیں۔ میں نے اس کی ساری پیچیدگی کی وضاحت اور صراحت کرنے کے بعد اس کا خلاصہ بیان کر دیا ہے کہ اصلی عوامی تشخص دراصل قدیمی ہی ہوتا ہے جو اپنے سروں کے سہارے قدیم تہذیب و تمدن کے سٹیج پر جا پہنچتا ہے۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج تک تکنیکی علم میں حیرت انگیز ترقی پر بحث مباحثہ جاری ہے۔ گفتگو کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن مجھے اس بہترین مستقبل کے تمثیلی فہم و شعور کی کہیں بھی علامت اور اشارہ نہیں ملتا۔ "سپینگلر" جو اپنے علم و ہنر میں یکتائے روزگار ہے اور جسے اس موضوع اور نفس مضمون کا مالیخولیا کا مرض ہو گیا تھا وہ بھی ہمیں اس مسئلہ پر رجائیت پسند نظر آتا ہے کیونکہ اس کو علم تھا کہ "کلچر" اپنے مفہوم کے حوالے سے تہذیب و تمدن کا وارث ہوتا ہے۔ جس نے خصوصی طور پر کارگزاری کی فنیاتی استعداد کو حاصل کرنے میں سب سے زیادہ مدد لی ہے۔ تاریخ اور ثقافت کے بارے میں میرا اور "سپینگلر" کا نظریہ بالکل مختلف ہے اور جداگانہ ہے۔ وہ اتنا آسان اور سادہ بھی نہیں کہ اس کو درست قرار دیں اور اس کے نتائج پر بھی میری کوئی رائے نہیں ہے۔ ہم یہاں احساس پیدا کرنے والے اسباب اور خیال کی تفصیل کو چھوڑ کر اس کے عام خیال کی عام نسب نمائی پر بحث کریں گے اور وہی ہمارا محور رہے گا مگر یہ بھی اس وقت ممکن ہے کہ اپنے اور اس کے درمیان پائے' بعد اور اختلاف پر نسب نمائی کی لکیر کھینچ دی جائے۔ سپینگلر کو یقین تھا کہ فنیاتی علم اس وقت زندہ رہ سکتا ہے جب اس کے اصولوں پر دلچسپی لی جائے گی اور ان پر کام کیا جائے گا لیکن میرا ایسی باتوں پر یقین ہی نہیں ہے کیونکہ میرے علم و دانش میں فنیاتی اور سائنسی علوم دونوں بذات خود عین ذات ہیں اور سائنسی علم اس وقت تک قائم و دائم اور زندہ رہے گا جب تک وہ اپنی ذات میں دلچسپی لیتا رہے گا اور یہ دلچسپی کب تک رہے گی؟ یہ اس وقت تک رہے گی جب تک ثقافت کے عام اصولوں کے مطابق

جوش و جذبے سے دلچسپی لیتا رہے گا۔ اگر یہ ولولہ اور جذبہ مردہ کر دیا جائے تو وقوعہ ظہور میں آ کر عملی طور پر اپنا سفر شروع کر دے گا۔ کیونکہ ہم اپنی فنی ضروریات کے سنگ سنگ زندہ رہتے ہیں۔ مگر ان کی وجہ سے زندہ نہیں رہتے کیونکہ یہ فنیاتی چیز نہ تو خود کی پرورش کر سکتی ہے اور نہ ہی وہ خود سانس لے سکتی ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کی وجہ یا سبب نہیں ہے۔ وہ تو عملی طور پر اس کی غیر ضروری اور غیرلازمی عملی سرگرمیاں ہی ہوتی ہیں بلکہ ناقابل عمل سرگرمیاں ہوتی ہیں بلکہ ناقابل عمل سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ اس لیے میں اس صورت حال کو آگے بڑھاتا ہوں کہ یہ فنیاتی کی ظاہری، عارضی اور سطحی ٹیپ ٹاپ میں دلچسپی کسی چیز کی ضمانت نہیں ہوتی کیونکہ ایسی ترقی اور اس کے تکمیلی مراحل کسی بھی اصل چیز کی حقیقت کے بارے میں کوئی ٹھوس اور مضبوط دلیل کے ساتھ تصدیق پیش نہیں کرتی۔

میرے ذہن میں شمالی امریکا کی فنیاتی ازم کی تفصیلی تصویر موجود ہے جو بے فائدہ ہے۔ اس کی جزیاتی سمت نے سارے یورپ کو الجھا دیا تھا کہ ان کے طفلانہ فیصلے جو یورپ کی مہذب دنیا نے سنا تھا یہ فیصلہ ایک خاص وقوعہ سے متعلق تھا اور متناسب تھا۔ میں نے بعد ازاں اس حال کے پیچیدہ مسائل اور حال کے ذہنوں کے درمیان پائی جانے والی الجھن کو آشکارا کیا ہے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ فنیاتی ازم کو جدید دور کی جدید ثقافت کے خاص نوعیت کے خدوخال اور پہلو پر تحقیق کرنی چاہیے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ "کلچر" بھی سائنسی اقسام پر مشتمل ہوتا ہے جو مادی لحاظ سے منافع بخش ہوتا ہے اور جب ہم ۱۹ ویں صدی کے اس جدید ترین پہلو کی موجودگی پر غور کرتے ہیں اور ذہن نشین کرتے ہیں تو میں اس کے صرف دو گوشوں کو بیان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں جو کہ یہ ہیں۔ (۱) آزاد جمہوریت (۲) فنیاتی ازم میں اسے دوبارہ بیان کرتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ فنیاتی ازم کا ذکر کرتے ہوئے یہ کیوں بھول گئے کہ اس کا اہم مرکز خالصتاً" سائنس ہوتا ہے کیونکہ سائنس ہی اِس کی ہیئت اور عملی شکل و صورت اور شرائط کو جاری بھی رکھتی ہے اور پورا بھی کرتی ہے۔ بلکہ خالصتاً" سائنسی سرگرمیوں کے حوالے سے ہی فنیاتی ازم آگے بڑھتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی ان لاتعداد چیزوں کے بارے میں نہیں سوچا؟ جو ان کے تحت الشعور میں موجود ہوں گی اور کیا سائنس دانوں نے اس کے کھرے حقیقی اور صداقت کے پہلوؤں پر سوچ کے عمل کو جاری رکھنے کی کوشش کی یا نہیں؟ آپ نے کبھی غور کیا کہ جب ڈالروں کی ریل پیل کا دور ہو گا تو سائنس کی ترقی کا عمل عروج پر ہو گا۔ میرا یہ سوال اکتسابی ہے اور دانشوروں نے اس کے جواب میں چپ کا روزہ رکھ لیا ہے۔ یہ ان کے مزید قدیمی ہونے کا بین ثبوت ہے۔ کیونکہ اگر اس میں ان گنت اور بکھرے بکھرے خیال کے

عناصر موجود ہیں تو انھیں جمع کر کے ان کی چھان پھٹک کی جائے۔ اور ان کو جھنجھوڑا جائے اور ہلایا جائے تو اس عمل کے نتیجے میں طبیعیاتی کیمیائی سائنس کے مرکبات بن جائیں گے۔ لیکن اس مضمون کا لاپروائی اور عدم دلچسپی سے مظاہرہ کریں تو بھی اس کی ظاہری حقیقت یہ بتا رہی ہے کہ فضا کی تمام حدود و قیود پر سرگرمی کے سرچشمے پھوٹیں گے۔ اسی سوچ، تحقیق اور کوشش کے باعث انیسویں صدی کے چار شہروں لندن، پیرس، وی آنا اور برلن نے طبیعی اور کیمیائی عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچایا اور چار دانگ عالم میں نام پایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تجرباتی سائنس، تاریخ کے اہم موضوعات میں سے ایک ہے۔ دانشور، پادری، گڈریا اور مجاہد وغیرہ تاریخ کے تمام زمانوں میں ہر وقت ہر جگہ موجود تھے۔ ایک تجرباتی فرد کے لیے حیواناتی قوت بھی ضروری ہوتی ہے اور اس کی جزئیات مرکب سے بھی زیادہ ضروری ہوتی ہیں اور غیر معمولی ہوتی ہیں۔ اس افسانوی "حیوان ناطق" سے کھری اور سنجیدہ حقیقت کے ظہور نے ہمیں ان پر تحقیق کرنے پر آمادہ اور مجبور کر دیا ہے۔ اس کی اعلیٰ و ارفع صفات معلوم کرنے کے لیے سائنس کے عمل تبخیر نے بڑی مدد دی ہے۔ اس طرح سے ایک خوش دل فرد یقین کر لیتا ہے کہ یورپی افراد کافور ہو جائیں گے اور شمالی امریکا کے سائنسی پنڈت اپنے سائنسی تجرباتی عمل کو جاری و ساری رکھیں گے اگر اس مسئلہ کی اہمیت کو خوب اچھی طرح تحقیق کر کے سمجھ لیا جائے اور اس کی خصوصیات کو سامنے لایا جائے تو یہی تاریخ کا اولین مفروضہ سمجھا جاتا ہے جو سائنسی تجربات کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے تاکہ اس کی فنیات کو مکمل کر کے اس سے نتائج اخذ کیے جائیں لیکن کوئی یہ خیال نہ کر بیٹھے کہ یہ نقطہ نظر کس لیے ہے اور کس واسطے سے اس کو معلوم کر لیا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ پھر اس کو ایک عوامی فرد ہی جان سکتا ہے۔ مگر عوامی فرد کے پاس اس پر توجہ دے کر اس کے جواز کو تلاش کرنے کے لیے کوئی وقت نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنے گوشت پوست پر تجربات کر کے سیکھنے کا تجربہ کرتا رہتا ہے۔

میرا ایک اور مشاہدہ ہے جو مجھے ان واعظوں، مبلغوں اور گفتگو کرنے والوں سے بچائے رکھتا ہے اور یہ نظریہ میں نے وعظ کی حقیقت کی بنیاد پر اپنایا ہے۔ وہ تجربہ یقیناً" پیچیدہ تجربہ ہے کہ یہ سب کچھ بکواس ہے۔ ایک عام فرد وعظ، تبلیغ، مشورہ اور ہدایات کو اپنائے بغیر اپنے مشاہدے کے صحیح تناظر میں اپنی زندگی کی صداقتوں کو قبول کرے گا اور اصل صورت حال کو جانچنے کے لیے ہم سب کو غور کرنا ہو گا۔ جیساکہ ظاہر ہے اس کے دوسرے رائے دہندگان ثقافت، سیاست، فنون لطیفہ، معاشرت کا معیار اور اخلاقیات نے اس مسئلہ کو مشکوک بنا دیا ہے۔ ایک اور اہم نقطہ نظر بھی اس مسئلہ کو مشکوک اور اس کے شبہات کی نشاندہی کرتا ہے اور یہ کہ وہ ناقابل تردید بھی ہے نیز مرغوب عام بھی ہے۔ وہ ہے اس کی شاندار استعداد کارکردگی "حیاتی سائنس" اسی کا نام ہے۔ یہی حسیات ہر روز نئی

ایجادات کرتی ہے اور ہر عوامی فرد اسے استعمال میں لاتا رہتا ہے۔ یہی سائنس ہے جو ہر روز حس آوری یا و یکسینیشن نما انجکشن ایجاد کرتی ہے جس سے یہ عام فرد کثرت سے پورا پورا استفادہ کرتا ہے اور ہر فرد اس سے باخبر ہے کہ سائنسی تحقیقات اور تحریکات کمزور نہ پڑ جائیں تو لیبارٹریز کی تعداد تین سے دس گنا بڑھ جائے گی تو لامحالہ ہمارے سکون و آرام دولت مندی' خفظان صحت اور خوشی میں خاطر خواہ اضافہ ہو گا اور ہوتا ہے۔ کیا اس اہم نقطہ نظر کے حق یا خلاف اس سے زیادہ خوفناک اور موثر پروپیگنڈہ کیا جا سکتا ہے؟ آپ کے خیال میں ایسے عوام کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جو از خود اپنی دولت کو قربان کرتے اور سائنس کی ترقی کے لیے اس سے کہیں زیادہ اپنی توجہ مرکوز کرے کیا ایسی قربانی دینے کے لیے کوئی تیار ہے؟ چلیے! ہم ہی جنگ عظیم کے بعد فطرتی طور پر پیدا ہونے والے سائنسی حسیات کے حوالے سے ایک نئی جنگ سے نبرد آزما ہونے کے واقعہ پر آپ کو لے چلتے ہیں کہ سائنسی فرد نے اپنی ذات کو اپنی ذات کے خول سے باہر نکال کر چوپال کے روپ میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ بات ضرور نوٹ کی جائے کہ میں حیاتیاتی اور طبیعاتی سائنس دانوں اور کیمیا دانوں کا حوالہ فلاسفروں کو نہیں دیتا اور علم فلسفہ کو ویسے بھی کسی محافظ کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی عوام کی توجہ اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ اپنے مکمل تحفظ اور افادیت کی ضروریات کو برقرار رکھتا ہے۔ اور اسی خصوصیت کی بناپر یہ عام فرد کی خدمت گزاری سے اپنے آپ کو آزاد کروا لیتا ہے اور خود کو اس مسئلہ کا لازمی جز سمجھتا ہے۔ اپنے آزاد مقدر پر فخر کرتا ہے اور خود کو آزاد فضاؤں کا ایک پنچھی سمجھتا ہے۔ اپنی ذات کی خود حفاظت کرتا ہے۔ کسی کو حفاظت کے لیے نہیں بلاتا۔ یہ اپنی سفارش بھی نہیں کرتا اور نہ ہی اپنے دفاع کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ بغرض محال اپنا دست مبارک دراز بھی کرے گا تو صرف نوع انسانی کی ہمدردی کے حصول کے لیے' اپنی ذات کے علاوہ کسی کے سہارے زندہ نہیں رہنا چاہتا اور نہ کسی کا احسان اٹھاتا ہے' نہ کسی سے توقع رکھتا ہے تو پھر کیسے گمان کریں کہ اس کی موجودگی مشکوک ہے۔ اگر کوئی اس کے اس اقدام کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ خود زندگی سے محروم ہو جاتا ہے۔ لوگ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اپنا اپنا سفر پرسکون کرتے ہیں۔ انجکشن بیٹاپون کی ایجاد سے بے حد فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ آخر یہ کس بات کا استدلال ہیں جو سائنس کی ایجادات و ترقی سے عوام کی بے ہنگم زندگی میں انقلاب آ گیا ہے۔ اس کی ترقی میں اضافہ ہونے سے عوام اپنی دلچسپی کا بے پناہ اظہار کر رہے ہیں۔ اب عوام کسی پر فریب امید سے دھوکا نہیں کھائیں گے۔ سائنس سے بے التفاتی اور بے اعتنائی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ جیساکہ عوام' ڈاکٹرز' انجینئرز اپنے اپنے پیشے میں اپنی اپنی ذہنی کاوش کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ موٹر کار' سردرد اور بخار کو ختم کرنے کے لیے اسپرین

کی گولیاں تیر بہدف ہیں' گویا سائنسی' تہذیب اور ایجادات کا باہمی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہاں ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو سائنس کی بربریت والے پہلو کی علامات دیکھ کر الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے بھی ہیں جو مادیت کے رنگ میں رنگے جانے پر آمادہ نہیں ہوتے اس کے باوجود وہ سائنس کے فوائد کا اثر ضرور قبول کرتے ہیں اور یہ اس کی احسان مندی ہے کہ جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے یا واپس کرتا ہے یا واپس نہیں کرتا تو یہ صورت حال خطرناک ہوتی ہے۔

اس شرمناک واقعہ کے باعث اس کی حقیقت کی اہمیت سو فی صد بڑھ جاتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے میں نے دوسرے اہم شعبوں سیاست' قانون' فنون لطیفہ' اخلاقیات اور مذہب کا پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ یہ سب فی الواقعہ بحران سے گزر رہے ہیں۔ یا یہ متذکرہ شعبے کم از کم عارضی طور پر دیوالیہ پن سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ مگر سائنس کا شعبہ ایسا ہے جو کبھی کسی بحران کے عمل سے ہمکنار نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ایسا حیاتیاتی شعبہ ہے جو ہر روز بھاری منافع کے ساتھ ادائیگی واپس کرتا ہے بلکہ وعدہ سے بھی زیادہ ادا کرتا ہے۔ تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ثقافتی جوش و جذبہ سے حیاتیاتی شعبہ سے اس کو نکال باہر کیا جائے۔

اس کے علاوہ اس سے بڑھ کر اور کیا حقیقت بیان کروں کہ میڈیکل سائنس' انجینئرنگ کے شعبہ جات میں اس قدر ترقی ہوئی ہے کہ اس سے افریقہ کے نیگرو بھی اسی طرح استفادہ کرتے ہیں جیسے یورپی عوام سائنس کی ترقی اور ایجادات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس پر دسترس اور غلبہ پانے کا سفر شروع کر دیا ہے۔ یہ فرضی اور قیاسی نظریہ اس پیچیدہ تہذیب و تمدن سے جا ملتا ہے۔ جس میں وہ ایک قدیم انسان پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ قدیم فرد ہے جو اپنے ذاتی سبب سے بڑے دھڑلے سے اسٹیج پر نمودار ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے وہ ایک "عمودی غنیم" کی حیثیت سے نمودار ہو رہا ہے۔ بالکل اسی قدیم انسان کی طرح۔

باب- ۱۰

تاریخ اور نظریۂ اولین عصریت

قدرت اور ہمارا باہمی تعلق ابدی ہے اور یہ تعلق خود کفیل ہے۔ قدرتی جنگلات میں ہم غیر مہذب ضرور ہیں۔ مگر ہمیں جزا و سزا کے عمل سے ضرور گزرنا ہو گا۔ اگر ہم ارادہ کرلیں کہ جنگل سے باہر نکل آئیں تو پھر ہمیں ہمیشہ مہذب رہنے سے کون روک سکتا ہے۔ لیکن اصولی طور پر انسان ہمیشہ نظریہ اولین عصریت پر قائم رہتا ہے۔ "بیرسنگ" نے اس انسان کو "صبح جاویدانی کے لوگ" کے نام سے پکارا ہے۔ یہ وہ عوام ہیں جو غیر متحرک ہوتے ہیں جو صبح کی جامد شفق کے اجالے میں ترقی پذیر نہیں ہوتے۔

یہ سب کچھ جو اس دنیا میں ہوتا ہے۔ یہ صرف فطرت ہے۔ لیکن یہ سب کچھ صرف ہماری تہذیب و تمدن کی دنیا ہوتی ہے۔ یہ صرف ہماری مدنیت ہے۔ مدنیت کہیں بھی بذات خود موجود نہیں ہے اور نہ ہی یہ خود کفیل ہے۔ یہ مصنوعی تہذیب و تمدن ہوتا ہے۔ اس تہذیب و تمدن میں تمام ہدایت کار، اداکار اور ہنرمند اس کی ضرورت ہوتے ہیں۔ اگر آپ اس تہذیب و تمدن بھری دنیا میں سے کوئی استفادہ کرنا چاہتے ہیں لیکن اگر آپ نے اس کی طرف دست تعاون نہ بڑھایا اور اس کے ساتھ دلی اور خاطر خواہ تعلق جوڑنے کا بندوبست نہ کیا۔ تو آپ مٹ جائیں گے اور اس فانی دنیا کی زندگی میں تنہا ہو کر رہ جائیں گے۔ یاد رکھیے اگر آپ اس سے بچ نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتے تو آپ اور آپ کے ارد گرد کا ماحول ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائے گا اور غائب ہو جائے گا۔ قدیم جنگل بظاہر اس کی فطری ریاست ہوتی ہے۔ ایسے ہی جیسے قدرت نے اس کے اوپر نیچے تہہ در تہہ پردوں سے لکیر کھینچی ہوئی ہے۔ جنگل ہمیشہ سے قدیم ہوتا ہے۔ ہر وہ شے جو قدیم ہوتی ہے، جنگل ہوتا ہے۔ ہر عہد میں رومانویت کو **برانگیختہ** کیا جاتا رہا ہے اور اس کی تعظیم و تکریم نہیں کی گئی۔ یہاں تک کہ قدرت اور انسان سے کمتر مخلوق نے سفید اور چٹی چمڑی پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔ اس کے مصنوعی روپ پیدا کر کے مصنوعی کردار میں ہی منظر عام پر لائے اور راج ہنس، پسپائی، سانڈ اور تضاد و تناقض کو بھیڑ بکریوں کا نام دے کر تصویر کشی کی گئی اور پھر بڑی عیاری سے اس تصویر میں بے حیائی کے تباہ کن رنگ بھرے اور اس کی عزت و وقار کو مزید یوں برباد کیا گیا کہ اس کے ارضی تناظر کو مہذب علم

جیومیٹری کی وحشیانہ روئیدگی کی نذر کر کے اس کا گلا گھونٹا گیا۔ جب آپ کی نظر کسی رومان پرور عمارت پر پڑتی ہے تو آپ کی پہلی نظر کارنس اور چھت پر پڑے گی جہاں وہ سرسوں کے پھول کے پودے اور جھاڑی کی تلاش کرے گی۔ یہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ مستقبل میں ہر چیز اپنا سفر طے کر کے ارضی بن جاتی ہے۔ کیونکہ اس ارضی جنگل سے ہی تازہ پانیوں کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ اس رومان پر درمنظر اور واقعہ پر قہقہہ لگانا عقل مندی نہیں ہو گی کیونکہ رومانویت اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ ان معصوم اور بکھرے بکھرے خیالات کے تحت الشعور میں ہمیشہ ایک اہم مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس تہذیب و تمدن اور فطرت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اور یہ کائنات اور عقل کا باہم کیا تعلق ہے؟ اس مضمون سے متعلق اور بھی چند سوالات ہیں جو میں بذات خود رومانوی ہونے کے ناطے سے کسی اور وقت پر بیان کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔

لیکن! اس وقت تو میں صرف اس موضوع کے برعکس گفتگو کرنے میں اپنے آپ کو مصروف کرتا ہوں کیونکہ یہ ماضی کے جنگل پر حملہ آور ہونے کا سوال ہے۔ اس وقت "اچھے یورپی شہریوں" کو بھی اس مسئلہ پر مصروف رکھنا چاہیے کیونکہ اس مسئلہ سے ان کا گہرا تعلق ہے کہ آسٹریلوی ریاستوں کے ساتھ لگاؤ کس بناپر قائم ہوتا ہے کہ کسی طرح اس کے شہریوں کو روکا جائے کہ وہ اس بیضہ نما پودے کے زیر زمین سمندر کی تہوں میں نہ جائیں۔ چالیس کی دہائی میں ایک آسٹریلوی کو اپنے ملک کے خوبصورت ترین مناظر "ملیگا" اور "سلی" سے لطف اندوز ہونے کی خواہش پیدا ہوئی تو وہ بحیرہ روم کے ایک مہاجر کو اپنے ساتھ لے کر اپنے بیضوی شکل برتن میں چلا جاتا ہے۔ آج "آسٹریلیا" کی حکومت اس بیضہ نما ملک کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے بھاری بجٹ خرچ کرتی ہے۔ یہ وہی آسٹریلیا ہے اور یہ وہی فرد ہے جس نے براعظم دریافت کیا تھا اور اس میں ہر سال تقریباً" ایک مربع کلو میٹر زمین کو شامل کر کے ترقی کی منزلیں طے کر کے آگے ہی آگے بڑھتا رہا ہے۔

عوام کا یہ پختہ ایمان اور ایقان ہے کہ جس تہذیب و تمدن میں وہ پیدا ہوتے ہیں جس سے وہ استفادہ کرتے ہیں اور جس سے خود رو پیداوار ہوتی ہے، یہ عین فطرت ہے اور قدیم شخص کی صورت میں نمودار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ مدنیت اور یہ تہذیب اس کے لیے جنگل ہی تو ہے میں نے پہلے بھی اس نکتہ پر کہا تھا اور اب بھی اس کی تفصیل میں جانا چاہوں گا۔ مہذب دنیا کے اصولوں کو برقرار رکھنا ضرور ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد آج کے عام آدمی کے لیے موجود ہی نہیں ہے وہ ابتدائی ثقافتی اقدار سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا اور نہ ان سے باہمی اتفاق کرنے کا مظاہرہ کرتا ہے اور نہ ان کی خدمت گزاری کے لیے خود کو تیار کرنے میں کوئی دلچپی لیتا ہے یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا؟ اس کے کئی اسباب ہیں مگر اس وقت صرف ایک سبب کی نشاندہی کرتا ہوں وہ یہ کہ تہذیب و تمدن اس وقت سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ جب وہ غیر متناسب طور پر مستقبل کی طرف بڑھتا ہے۔ یہ وہی غیر متناسب تیاری میں پائے گئے مسائل ہیں جنھیں ہم حال کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ یہ مسائل پیچدار

ہیں، اسے لوگوں کی مثال جن کے ذہن ان مسائل کو برابری کی سطح پر سوچتے ہیں، ان کے ذہنی فکری اور کردار کی سوچ میں بہت کم اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں ہمیں جنگ عظیم کے بعد کی ایک مثال دعوتِ فکر دیتی ہے۔ یورپ کی تعمیر نو تو ہمارے کان کھل جاتے ہیں اور کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ سارا کمال "الجبرا" سے متعلق ہے اور یورپ کا عام فرد اپنے آپ کو اس اہم معرکے سے کم تر سمجھتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس کا حل نکالنے میں کسی چیز کی کمی پائی جاتی ہے۔ البتہ ایک چیز کی کمی ہے اور وہ ہے "ذہن" یا یوں سمجھیے کہ بعض ذہن یا محدودے چند ذہن۔ لیکن وسطیٰ یورپ کے عوام اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر ڈالنے کے لیے ناخوش ہیں۔

مسائل کی پیچیدگی اور باریک بینی اور ذہنوں کے درمیان پائے جانے والے تفاوت کا مطالعہ کرنا از بس ضروری ہو جاتا ہے اگر اس کے حل کا کوئی علاج تلاش نہ کیا جائے.تو پھر یہی سبب ہماری تہذیب و تمدن کے ابتدائی المیہ کو جنم دیتا ہے۔ اس کے اصولوں کی افادیت اور ایک عام آدمی کے اثر قبول کرنے کی قوت پیدا کرنے اور اس میں خاطر خواہ اضافہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصولوں کی افادیت کے اسباب کو سامنے لایا جائے اور ان اصولوں کی یقینی اور عملی شکل و صورت سامنے لا کر اس کی مقدار اور باریک بینی میں فرق ظاہر کیا جائے۔ یہ میرے ذہن یا مطالعہ میں نہیں آیا کہ ایسا ماضی میں بھی کبھی ہوا ہو۔ ماضی کی تمام تہذیبیں بھی اپنے اساسی اصولوں کے ناکافی ہونے کے باعث دم توڑ گئی تھیں لیکن اس کے مقابلہ میں یورپ اس کے برخلاف یورپ اس کا مطیع ہو رہا ہے۔ روم اور یونان میں عوام نہیں تھے جو ناکامی سے دوچار ہوئے تھے۔ بلکہ اصولوں نے ادھر دم توڑا تھا۔ سلطنت روم اپنی فنیاتی مہارت کی کمی کی بدولت ختم ہو گئی تھی۔ جب اس کی آبادی میں خاطرخواہ اضافہ ہوا تو اس کا کثیر اور وسیع التعداد عمرانی رابطہ نے چند مادی مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک مطالبہ کیا کہ ہر قسم کی فنیاتی تکنیک کو بروئے کار لا کر قدیم دنیا کی انحطاط پذیری سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ افسوس ناک صورت حال یہ ہے کہ اس تہذیب و تمدن کی ترقی کی رفتار بہت ست ہے اور نہایت ست روی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ جبکہ آج سے تیس سال قبل بھی روشن خیال لوگ آج کے بنیادی مسائل اور موضوعات پر گفتگو اور مطالبے کرتے تھے۔ مجھے تو یہ لوگ اجرت پر کام کرنے والے کسان اور کاشتکار ہی دکھائی دیتے ہیں جو اپنی بے سڈول ہاتھوں کی منحنی انگلیوں سے کھلیانوں میں بڑی اناج کو سوئی کی طرح اٹھا لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان سماجی اور سیاسی مسائل کو اگر وہ دو سو سال پہلے والے متکبرانہ اور ظالمانہ انداز کے خیالات کی روشنی میں اوزاروں اور ہتھیاروں کو استعمال میں لا کر ایسی صورت حال کو نمٹاتے اور مقابلہ کرتے ہیں۔ اگر ان کا سختی سے مقابلہ کرتے تو آج کے مسائل کی پیچیدگی کم از کم دو سو درجہ کم مشکل میں ہوتی۔

ایک ترقی یافتہ تہذیب و تمدن میں انھی مسائل ماضی کا حل نکالنے میں ماضی کی مشکلات ہی حائل ہیں۔ لہٰذا جس قدر ترقی کی رفتار میں اضافہ ہو گا اسی قدر مشکلات کا خطرہ سامنے آئے گا اور

معاشرتی زندگی بتدریج بہتر ہو گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسائل بھی اسی طرح پیچیدہ اور مشکل صورت حال اختیار کر جائیں گے۔ لیکن ان مسائل کے حل میں اعلیٰ درجہ کی استعداد کارکردگی بھی حاصل ہو گی۔ اس لیے نئی نسل کو فنیاتی تکنیک اور استعداد کار میں کمال حاصل کرنے کے لئے تمام ذرائع کو بروئے کار لانا ہو گا اور ان ذرائع کی خوبیوں اور صفات کو یکجا کرنا ہو گا۔ اس لیے مدنیت کی ترقی کی راہ میں ایک سادہ سے نام کو بھی ذہن میں محفوظ رکھنا چاہیے۔ وہ نام یہ ہے کہ نسل کی پشت پر "ماضی کا تجربہ" اور صرف ماضی کے ادوار کا تجربہ اس کے علم تاریخ کی تکنیک کی تاریخ کو محفوظ کرنا پہلی شرط ہے۔ جس پر حال کی تہذیب و تمدن کی روشنی میں اس کو ترقی کی شاہراہ پر عمل کر کے گامزن کیا جا سکے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ماضی کی وہ اہم شرط حال کے مثبت پہلو کا حل نکالنے میں اس کے قابل بھی ہو۔ زندگی ہمیشہ پہلے سے کہیں زیادہ مختلف ہوتی ہے۔ لیکن ماضی کا یہ تجربہ ہمیں بے تکلفانہ اور صاف گوئی' پہلے وقتوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو دوبارہ دہرانے سے روکتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم بوڑھے ہو کر یہ سوچنا شروع کر دیں کہ زندگی گزارنا دشوار ہو گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ نے ماضی کے تجربے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا بلکہ اپنے حال کو ماضی کی یادداشتوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے ماضی سے کچھ حاصل نہیں کیا۔ اس وجہ سے آپ کو حال کے ہر معاملہ میں ہر مسئلہ کو حل کرنے میں دقتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تو جناب! میرا پختہ یقین ہے کہ حال کی یورپ کے یہی احوال اور صورت حال ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حال کے نہایت مہذب لوگ ماضی کی تاریخ کی اس معصومانہ تکلیف دہ اور ناقابل یقین صورت حال میں مبتلا ہیں جن سے ان کو نجات حاصل کرنی چاہیے۔ میں اپنے اس یقین پر قائم ہوں کہ حال کے یورپی رہنما اٹھارویں صدی کے اپنے ساتھی رہنماؤں سے ماضی کے علم تاریخ سے بہت کم واقف ہیں۔ حتیٰ کہ یہ سترھویں صدی کے اپنے ساتھی لیڈروں سے بھی بہت کم علم تاریخ کو جانتے ہیں۔ ماضی کی تاریخ کی وہ حکومتیں جو اقلیتوں پر حکمرانی کرتی تھیں۔ انھی نے دراصل انیسویں صدی کی ترقی کو حیرت انگیز طور پر ممکن بنا دیا تھا۔ دراصل انھوں نے ان کو سترھویں صدی کے تجربات اور پالیسیوں کے ماحصل کی حقیقت کو اچھی طرح جان لیا تھا اور معلوم کر لیا تھا۔ المختصر! یہ کہ انھوں نے ماضی کے رہنماؤں کی کوتاہیوں اور غلطیوں کو سامنے رکھ کر ان کے حقیقی وجود اور تجربے کے ماحصل کا سراغ لگا لیا تھا لیکن گھپلا یہ ہوا کہ انیسویں صدی نے اپنے "ثقافتی تاریخ" کے ورثے کو نظرانداز کر دیا تھا یہ الگ بات کہ ماہرین سیاست نے اس صدی کو "ترقی یافتہ سائنس" کا نام دے دیا۔

ہم یہاں ماضی کی تاریخ کے اس معروضی دور میں سائنس اور ثقافت کے درمیان پائی جانے والی تفاوت کی چند جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم ان کی خاص غلطیوں اور کوتاہیوں کے باعث شکنجے میں کسے ہوئے ہیں۔

اس صدی کی تیسری دہائی کے آخر میں اس الجھن کو پراسرار طور پر آغاز ہو چکا تھا۔ مطلب یہ کہ زوال پذیری نے بربریت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یعنی فراست اور قدیم ازم کے انسان کی طرف جس کا کوئی ماضی نہیں ہے یا یوں سمجھیے کہ اس نے اسے فراموش کر دیا ہے۔

پس! بالشویک ازم اور فاشزم کی دنیا میں یہ دو نئی کوششیں یورپ اور اس کی سرحدات پر کی جانے والی کوششیں یورپ کی زوال پذیری کی دو واضح مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ایسا اس لیے ہوا کہ یورپ کے ان خاص دونوں گروہوں نے اپنے نظریوں کے مثبت پہلوؤں کا احساس کیا ہے۔ جس سے وہ تنہا ہو گئے۔ قدرتی طور پر یہ جزوی صداقت کائنات کیا ہے۔ کائنات میں کیا ہے۔ کائنات میں ایسا کوئی ذرہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہ ہو؟ اس لیے تاریخ اور زمانے سے متعلق ہر چیز کی جزئیات کو اپنی علمی دماغی اور عقل کی میزان میں جانچنا چاہیے۔ عوامی یلغار کی خصوصی حرکات و سکنات انھی لوگوں کی قیادت ہدایات اور رہنمائی پاتی ہے جو اوسط درجے کی صلاحیت رکھنے والے افراد بروقت مہیا کرتے ہیں۔ "یہ وہ افراد ہوتے ہیں جو اپنی طویل یادداشت اور تاریخ کے روشن اور با ضمیر پہلو سے نابلد ہوتے ہیں" اور یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو ابتدا میں ہی کچھ ایسا سلوک کرتے ہیں۔ جیسے وہ ماضی سے متعلق پہلے سے سب کچھ علم رکھتے ہیں اور جیساکہ اب اس موجودہ لمحہ میں بھی ہو رہا ہے۔ دراصل یہ وہی عوام ہیں جنھیں ماضی میں وحشی کہا جاتا تھا۔

سوال موجود اور غیر موجود کا نہیں اور بالشویک اور کمیونسٹ تحریک سے متعلق بھی میری بحث نہیں اور نہ ہی ان کے نظریاتی دھرم پر کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ ناقابل فہم کیا ہے اور تاریخ سے متعلق کیا خطائیں سرزد ہوئی ہیں۔ البتہ یہ جاننا ضروری ہے کہ کمیونسٹوں نے ۱۹۱۷ء میں ایک انقلاب برپا کر کے کیا خطا کی ہے جو عملی طور پر تاریخ کے ان عصروں کے برخلاف ایک واضح نظریے رکھتے تھے لیکن یہاں انقلاب لانے کے لیے ماضی کی تاریخ سے استفادہ کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ ماضی کی تاریخ کی غلطیوں کی چھان بین کی اور نقائص دور کیے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ روس میں کیا کیا ہوا۔ روسی تاریخ میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ میں ایک بار پھر دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اس عوامی انقلاب نے بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایک نئے سفر کا آغاز کیا تھا لیکن اس کے برعکس یہ ایک نظریاتی انقلاب کو دائمی انقلاب میں تبدیل کرنے کی کوشش نقطہ آغاز تھا۔ کیونکہ اسی راستہ پر چل کر "اپنی نظریہ دائمی انقلاب" کی منزل پا سکتے تھے۔ اس انداز فکر سے متعلق اور بھی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ ماضی کی تاریخ کے تجربوں سے بنی نوع عوام نے بھرپور استفادہ کیا اور انقلاب بپا کیے مگر افسوس کہ عوام الناس کے اس انقلابی اقدامات کی تکریم و تعظیم نہیں کی گئی اور نہ ہی ان کی آواز سنی گئی۔ ان کے صرف اسی انداز کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ "انقلاب اپنے بچے چیر پھاڑ کر کھا جاتا ہے" "انقلاب ایک اعتدال پسند جماعت سے شروع ہو کر انتہا پسندوں تک کا سفر کرتا ہے" وغیرہ وغیرہ ان قابل تعظیم اور غیر معمولی سچائیوں اور حقیقتوں میں کچھ اور مثالیں شامل کر سکتے ہیں جو لوگوں میں کم مشہور ہیں۔ جن کو بہت کم لوگ جانتے

ہیں۔ اگرچہ وہ بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں ہیں۔ ایک خاص مثل یہ ہے کہ ایک انقلاب پندرہ سال سے کم مدت پر محیط نہیں ہوتا یہ ایک ایسا دور ہوتا ہے جس میں ایک نسل اپنی ترقی کے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

ایک نسل کا عہد تیس سال پر مشتمل ہوتا ہے لیکن اس کی سرگرمیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ اول جو اپنے پہلے نصف حصے کے دور میں وہ ایک نسل اپنے خیالات، ترجیحات اور معیار کا بھرپور پروپیگنڈہ کرتی ہے اور بالآخر طاقت و توانائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اپنے دوسرے نصف حصہ پر غالب آ جاتی ہے یا اس کی راہ چلنا شروع کر دیتی ہے۔ لیکن یہی نسل تعلیمی ترقی کے ماحول میں اپنے متذلزل خیالات، نظریات، ترجیحات اور طور طریقوں کے مالک ہوتے ہیں جو ماحول کی ہوا خارج کرنے کے عمل میں کام آتے ہیں اور اس طرح توڑ پھوڑ کا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ جب حکمران نسل کے نظریات، ترجیحات اور معیار انتہا پسندانہ ہو جائیں تو یہ یقینی طور پر انقلابی ہوتی ہیں۔ یوں وہ نئی نسل کی انتہا پسندی اور انقلاب کے مقصد کے منافی سرگرمیوں میں منصف عمل ہو جاتے ہیں جس سے وہ دراصل روح کی تسکین کی بحالی کرتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی اس بحالی کو صحیح اور حقیقی معنوں میں سمجھا نہیں گیا۔ دراصل اپنے پرانے طور طریقوں کی طرف مراجعت ہیں یہ ایک ایسا غیر معمولی پہلو ہے جس کو اس بحالی کی صورت میں پہلے کبھی محسوس نہیں کیا گیا۔

جو کوئی اس نئی سماجی، سیاسی حقیقت کی چھان بین کرنے کی آرزو رکھتا ہے اسے سب سے پہلے اس بات کی تسلی کر لینی چاہیے کہ تاریخی تجربات کے یہ متحمل مزاج لوگ عوام کے اس مقام و مرتبہ کو اس صورت حال کے پیش نظر کہیں کالعدم قرار نہ دے دیں جو وہ اس حال میں سمونے کا آرزو مند ہے۔ کیونکہ میں اسے سیاست دان کے لیے "ایک غیر معمولی ذہن کا انسان" کا خطاب دینے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ جس نے بڑی مشکل سے ابھی اپنے معمولات کو شروع کیا ہو جبکہ ہمارے کالجوں کے پروفیسروں اسے "پاگل پاگل" کی آوازیں لگانے کا عمل شروع کر دیتے ہیں کیونکہ اس نے دیکھا اور پرکھا ہوتا ہے کہ سائنس کے تمام "قوانین" کے راستے میں کھڑی کی گئی رکاوٹوں سے وہ ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔

حقیقی بالشویک ازم کے حوالہ کو ایک اشارہ میں تبدیل کر کے شاید فاشزم کے بارے میں اس قسم کے بیانات دے سکتے ہیں۔ ان تجربات میں سے کوئی ایسا تجربہ نہیں جو "ہمارے وقت کی سطح کی بلندی" سے بڑھ کر ہو۔ وہ تمام تجربات ماضی کی تاریخ کے کمتر ہونے کی نمائندگی نہیں کرتے بس یہی شرط اس ماضی کی بہتری کے لیے مقصود ہے اور انتہائی ضروری ہے۔ جدوجہد نے ماضی کے ساتھ کوئی دست بستہ لڑائی نہیں کی۔ ورنہ مستقبل اسے نگل کر غلبہ حاصل کر لیتا۔ اگر حال ماضی کے کسی ناقص تجربے کو نظرانداز کر دے تو یہ حال خود بخود ان سے محروم ہو جائے گا۔

بالشویک ازم اور فاشزم دونوں صبح کاذب ہیں، وہ نئے دن کی نئی سحر نہیں لاتے بلکہ قدیم اور دقیانوسی دن لاتے ہیں جسے بار بار ضائع کر دیا جاتا ہے۔ دراصل وہ صرف "نظریہ اولین عصریت" جو اسی قسم کی تمام حرکات و سکنات ایسے احمقانہ انداز میں استعمال میں لاتا ہے جیسے مقابلہ شروع ہونے سے قبل دو باکسر ایسی حرکات ماضی کے وقتوں میں ہوتی ہوئی ملتی ہیں۔ مگر ماضی کے تمام عصروں نے بھی ایسی احمقانہ حرکات و کردار کو قبول اور ہضم نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اپنے نظام میں ایسی حرکات شامل کر سکتے تھے۔ الغرض یہ امر شبہ سے بالاتر ہے کہ انیسویں صدی میں آزاد خیالی نے خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ لیکن اسے آپ خالصتاً" کسی ایک جماعت، تحریک یا گروہ کی کوشش نہیں کہہ سکتے جبکہ فاشزم کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جو ببانگ دہل آزاد خیالی کی مخالفت میں ہے۔ اس سے ہمارے سامنے ایک ایسی حقیقت ابھر کر سامنے آئی ہے کہ آزاد خیالی کے مخالف جو انسان کی آزاد خیالی کی تاریخ کو قبل از تاریخ کی تشکیل قرار دیتے تھے اور جیساکہ موخرالذکر نے اپنے مخالف پر کامیابی حاصل کر لی ہے تو پھر یہ کیوں نہ اپنی فتح کو بار بار دہرائے گا یا تمام خیالوں پر آزاد خیال اور آزاد خیالی نہیں۔ یورپ کی تباہی میں دفن ہو جائے گی۔ زندگی کے تاریخی مطالعہ میں سنگ دلی اور تاریکی پیدا ہو جائے گی۔ اس میں آزاد خیالی کے مخالفوں اور آزاد خیالی میں بعد پایا جاتا ہے۔ تاہم یہ اس سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

"کسی شے کے مخالف" کے بر خلاف دیکھنے کا رویہ اس چیز کا بُعد ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی نظربد اس کے برخلاف ہونے کی علامت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہ اس کے ماضی کو فرض کر لیتا ہے اور اپنے حریف کی جدت اور اختراع کے برخلاف رو میں بہہ جاتا ہے اور تاثر یہ چھوڑتا ہے کہ وہ صرف قناعت پسند ہے۔ "قصۂ پارینہ" نے اس لیے مثبت رویہ اختیار کیا جب اس کے اس رویہ کا آسان اور سادہ زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو وہ شخص خود اس پیڑ کا حریف ہونے کا دعویٰ کرتا ہے جس نے از خود اپنے دعویٰ کے اعلان کرنے کے سوا کچھ نہیں کہا تھا کہ وہ اس دنیا کا مرید ہے جس میں اس پیڑ کا وجود نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پیڑ کے دنیا میں پیدا ہونے سے قبل ایسا ہی ایک واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ پیٹریٹی کے حریف کو پطرس کے بعد کے مقام و مرتبہ پر فائز کرتے تھے اور اسے اس کا ماضی بتا دیتا تھا اور پھر اس نے ماضی کی فلم کی الٹی ریل چلا دی جس کے اختتام پر یہ واضح ہوتا تھا کہ پیٹر کا دوبارہ ظہور ہو گا۔ اسی طرح حریفوں کے ساتھ اکثر واقعات پیش آتے رہے ہیں۔ روایت کے مطابق کنفیوشس کے ساتھ بھی ایسا واقعہ پیش آیا۔ ظاہر ہے وہ اپنے والد کے بعد ہی پیدا ہوا ہو گا۔ راوی کے مطابق کنفیوشس ۸۰ سال کی عمر میں پیدا ہوا تھا۔ جبکہ اس کے کسی شجرہ کے مطابق اس کے والد کی عمر تیس سال کی تھی۔ حالانکہ ہر مخالف سادگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا صرف لفظ "نہیں" کا دعویدار ہوتا ہے۔

اگر ماضی میں سب کچھ اچھا ہوتا تو لفظ "نہ" یا "نہیں" کو ماضی میں ہی دفنا دیتے لیکن

ماضی میں بھی روح کا جوہر ہوتا تھا۔ اگر اس کو برا نکیختہ کیا جائے تو ظاہر ہے یہ اپنے اصل میں واپس چلی جائے گی۔ البتہ اس سے جدا ہونے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ اس کو برا نکیختہ نہ کیا جائے۔ اور اسے اپنے حسن سلوک سے دھوکہ دے کر نظرانداز کر دیا جائے اور پھر یہ کہ ہم ایک لفظ کے استعمال سے وہ بھی اپنے وقت کے ارتقاع کی موجودگی میں' اس سے یہ سلوک اس لیے کر رہے ہیں کہ اس کے ساتھ زندہ رہا جائے۔ یوں ہم تاریخ کی حقیقت اور مبالغہ آمیز شعور کی موجودگی میں اس کے ساتھ ایسا سلوک کر رہے ہیں۔ ماضی کے پاس ایسا سلوک روا رکھنے کی وجہ موجود ہے اور اس بارے میں ماضی کا اپنا نظریہ بھی موجود ہے۔ اس کے نظریہ کا انکار ہمیں ماضی میں لے جانے کا مطالبہ کرے گا۔ اس لحاظ سے آزاد خیالی کی اپنی وجہ ہوتی ہے۔ "پرمسائیکولا سائیکولو روما" میں تسلیم کیا گیا ہے' مگر یہ ان تمام اسباب میں سے ایک سبب ہے بلکہ سبب کا ایک حصہ ہے وجہ نہیں کہ اسے مستعار لیا جائے۔ اس وقت یورپ کے سامنے اہم مسئلہ نظریہ آزاد خیالی کا تحفظ ہے اور حال کی شرط بھی یہی ہے۔ جس کے ذریعہ آج غلبہ پایا جا سکتا ہے۔ میں نے یہاں بالشویک اور فاشزم کا ذکر ضمناً" اور بالواسطہ کیا ہے کیونکہ میرے نزدیک وہ تحریکیں خطائے تاریخ ہیں' اس لیے کہ میرے نزدیک اس کا یہ پہلو آج کی تمام بظاہر فتح و کامرانی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ ہمارے حال کے عوام کی کامیابیاں ماضی کی ان تحریکوں کے باعث حاصل ہوئی ہیں جو اپنے قدیم اسلوب اور انداز سے لبریز ہے۔ جن کی وجہ سے آج ہم ان کامیابیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور ان پر فخر کرتے ہیں اور نازاں ہیں چونکہ میں اس وقت اس تحریک کے حقیقی پہلوؤں اور سمتوں پر بحث نہیں کر رہا اور نہ ہی میں ارتقاع اور انقلاب کی دوہری مشکل میں پڑنا چاہتا ہوں لیکن میں اس مضمون کے تقاضا کا اظہار بڑی دلیری سے کرتا ہوں کہ انقلاب اور ارتقاع کے عمل کو تاریخ کے اصل پس منظر میں دیکھا جائے نہ کہ خطائے تاریخ کے حوالہ سے۔ میں نہایت سیاسی غیر جانبداری سے اپنے مضمون میں اس موضوع پر بحث کرنے کے لیے آپ کو آمادہ کر رہا ہوں کیونکہ یہ موضوع سیاست اور اختلاف رائے کے وسیع تر سمندر میں پھلتا' پھولتا اور بڑھتا ہے۔ اس لیے کہ میرے نزدیک قدامت پسند اور انتہا پسند کسی پہلو سے بھی عوام سے کم تر نہیں ہیں اور ان کے درمیان جو فرق نظر آتا ہے وہ ہر دور میں بالکل مصنوعی ہوتا ہے بلکہ حقیقتاً" اسی فرق کو مٹانے کے لیے ہی عوام بغاوت کرتی ہے۔

اس وقت یورپ کے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے کہ اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے اپنے ہم عصر عوام کے ہاتھوں میں باگ ڈور دے دے کیونکہ یہ وہی عوام ہیں جن کے دل شدت جذبات سے اپنی حقیقت کو تسلیم کروانے کے لیے بے چین ہیں۔ جو ماضی کے زیر زمین رازوں کو سطح زمین پر لانے کے لیے دھڑکتے ہیں اور یہ وہی عوام ہیں جن کے دل دقیانوسی اور قدیمی تمام رویوں سے بیزاری اور نفرت کے اظہار کے لیے دھڑکتے ہیں۔ ہمیں تاریخ کو کلیت کے معنوں میں سمجھنے کی شدید ضرورت ہے بلکہ ہمیں ایسے ماضی سے بچاؤ کی تدابیر کرنی چاہیں۔

خود اطمینانی کا زمانہ

میں ایک نئی سماجی حقیقت کا جائزہ ایک بار پھر آپ کو پیش کرتا ہوں کہ پوری کی پوری تاریخ میں پہلی بار ایک عام آدمی کے فیصلوں کا احترام کیا گیا ہے اور تاریخ کے گمشدہ اوراق سے پردہ اٹھا کر اس کا انکشاف کرتا ہوں کہ آج کے یورپ نے عام آدمی کی آواز کو سنا اور اس کو مستعدی عطا کی ہے۔ عام آدمی دوسروں سے کس طرح رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ ان رہنما اصولوں اور فیصلوں کی روشنی میں اس عام آدمی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ دنیا پر خود حکمرانی کرے گا۔ اس عام آدمی نے اپنی سماجی حیثیت اور حقیقت کو پس منظر میں رکھ کر یہ خود ہی فیصلہ کیا ہے۔ اس نئے اور عام آدمی نے اس وقت اپنی نمائندگی کو پیش کیا ہے۔ جب اسے کامل بالغ نظر ہونے کا یقین ہوتا ہے لیکن عوامی زندگی کے پچھتاووں، محرومیوں اور رویوں کا سامنا کرنے سے پہلے ہمیں اس کی ساخت، بناوٹ اور خدوخال کا مطالعہ کرنا ضروری ہو گا۔ ہم نے اس کے مطالعہ کرنے سے یہ اخذ کیا ہے۔

(۱) اس کی قدرتی پیدائش سے اس کے گمان اور ممکنات کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ جس سے زندگی آسان اور سہل گزرتی ہے۔ اس کی کثیر تعداد بہت ساری بے جا بندشوں سے آزاد ہو جاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر عام آدمی اپنی ذات میں سنسنی خیزی کی طاقت اور کامیابی کا سراغ لگا لیتا ہے جو:

(۲) وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی دعوت عام دیتا ہے۔ کیونکہ وہ خود ہی اپنے عقلی جوہر اور اخلاق و فضیلت اور فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے عمل کو مکمل کر لیتا ہے۔ اس کے خود کے اطمینان نے اس کی رہنمائی کی ہے کہ وہ کسی بیرونی قوت کی عدالت میں اپیل کرنے سے باز رہے گا۔ کسی اور کی بات پر دھیان نہیں دے گا اور نہ ہی اپنی رائے کو کسی کے سپرد کر کے فیصلہ سنے گا۔ اور نہ ہی دوسروں کی موجودگی پر غور یا توجہ دے گا۔ اس کے اس احساس کی طاقت اسے تاکید کے ساتھ ہدایت کرتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی برتری کو نافذالعمل کرے اسے اب یہ احساس ہو گیا ہے کہ وہ صرف خود یا اس کی مثل ہی اس جہاں میں رہنے کے قابل ہیں اور ظاہر ہے کہ

(۳) وہ زندگی کے تمام معاملات اور مسائل میں خود مداخلت کیا کرے گا اور اپنے عامیانہ خیالات و نظریات کو کسی دوسرے کی پروا کیے بغیر ٹھونسے گا اور وہ اپنے اختیارات کی کوئی حد مقرر نہیں

کرے گا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے ”براہ راست ایکشن“ کے نظام کے تحت اپنے کاموں اور سرگرمیوں کو جاری و ساری رکھے گا۔ ان کا تاریخی پہلوؤں سے مٹی اتارنے کا ایک تسلسل ہے جس نے ہمیں چند نا تمام عوام الناس مثلاً ”خراب بچے اور وہ قدیمی لوگ جو زندگی کے چلن سے برگشتہ ہو کر وحشی بن گئے ہیں۔ ان پر غور و فکر کرنا میری مجبوری بن گئی ہے۔ اس کے برعکس وہ غیر مہذب عوام الناس جو تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ خود کو معروف اتھارٹی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ خواہ مذہبی ہوں یا سماجی وہ ان سے مقاطعہ کر کے اپنے رسم و رواج پر سختی سے عمل کرتے ہیں۔ میں نے جس قسم کے انبوہ عوام الناس کا ذکر کیا ہے آپ کو اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس مضمون میں میں نے اس کامیاب آدمی کے خلاف ان کی ابتدائی جھڑپوں اور حملوں کے ذکر کے سوا اور کوئی شے شامل نہیں کی ہے اور میں نے واضح طور پر اس کے نفس مضمون میں اعلان کیا کہ یورپ کی ایک بھاری اکثریت نے اپنے جابرانہ اختیارات کو بڑی سختی سے استعمال کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اس وقت اسے عوام الناس کی پہلی جھڑپ کے طور پر سمجھا جائے پھر اس کے بعد بالمقابل جھڑپ کا ذکر کریں گے اور میرے خیال میں یہ فوری نوعیت کا حملہ شاید جلد کر دیا جائے گا اور یہ حملہ خاصا مختلف انداز میں کیا جائے گا۔ اس حملے کی خصوصیت یہ ہے کہ مضمون میں ذکر کیے جانے والے تمام حملوں سے اس حملہ کا ذکر قدرے مختلف نوعیت کا ہو گا۔ یہ حملہ سامنے سے ہو گا اور عوامی آدمی اسے روک کر اپنا تحفظ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو گا۔ وہ خود دیکھے گا کہ یلغار اس کے سامنے کی جا رہی ہے۔ اس میں شبہ کی گنجائش بھی نہیں ہو گی کہ یہ حملہ سامنے سے ہو گا۔

آپ چاروں جانب جو اس قسم کا حملہ دیکھ رہے ہیں۔ اس میں وہ خود اپنی روحانی طاقت و بربریت کا نفاذ ہر جگہ کر رہے ہیں۔ یہ دراصل انسانی تاریخ کے بگڑے تگڑے بچے ہی ہیں۔ یہ وہی خراب بچے ہیں جو مورث اعلیٰ کی وراثت کے حصول میں غیر معمولی طور پر اظہار کر رہے ہیں کیونکہ اس کیس میں بھی یہ ان کی تہذیبی میراث ہے جو اپنی سہولیات، اپنی سلامتی اور مفادات کے حصول میں حملے کرتے ہوئے اور کامیابی کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ اس عام صورت حال کی موجودگی میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جس نے ہماری تہذیب و تمدن کو جنم دیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ایسی تمثیلی تہذیب کے خدوخال اور طرز معاشرت کو مد نظر رکھ کر وہ شاہراہ ترقی پر رواں دواں ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ جان گئے ہیں کہ ایسی تمثیلی تہذیب کی تحریک سے ہی اپنی زندگی میں انقلاب بپا کر سکتے ہیں۔ یہ انسانی بیوٹی کے تعیش سے پیدا ہونے والی تحریک کی ایک بدنما صورت ہے۔ اس گمراہ کن رجحان پر شاید کوئی اعتبار نہ کرے کہ کثرت افراد کی دنیا میں زندگی کو اس زندگی سے زیادہ بہتر ہونا چاہیے۔ جس کا انحصار قلیل مقدار کے برخلاف جدوجہد کی زندگی پر ہے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ اس سے انتہا پسندانہ اور طبعی نوع کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ جن کو یہاں پھیلانا اور بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ حال ان اسباب و وجوہات کے برخلاف واقعات کی حقیقت کو دہرانا چاہتا ہے۔ جو ہر ایک اشرافیہ کی وراثت کے المیہ کو تشکیل کرتا ہے۔ میرے

یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ کس خدوخال اور طرز و طریق کا مالک ہوتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تمام قرنوں میں عام لوگوں اور اشرافیہ میں پائی جانے والی خوبیوں اور خصلتوں کا آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اسی طرح عوامی آدمی اور عوام الناس میں تمام ادوار کے وقتوں کی خوبیاں اور خامیاں منجمد شامل ہو کر عوامی آدمی میں نمو پاتی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس کی کھیلوں میں رغبت اور دلچسپی سے اس کے جسم کی ساخت کو صحت بخش قوت حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح اس کے جسم کے جھکاؤ سے وہ اپنے لباس پر توجہ دیتا ہے۔ اس کے جسم میں موٹاپا آ جاتا ہے۔ جس سے وہ عورت کے ساتھ پیار و محبت کم کرنے لگتا ہے اور وقت آنے پر اپنے خادم یا اپنے بہادروں کو سزا دینے کا حکم سنا دیتا ہے وہ اپنی زندگی کو ایک مطلق طاقت کے زیر اثر رہ کر گزارنے پر ترجیح دیتا ہے نہ کہ وہ ایسی طاقتور حکومت کے زیر سایہ زندگی گزارنے کو ترجیح دے گا۔ جس میں آزادی اظہار رائے اور آزادانہ بحث مباحثہ کرنے کی کھلی آزادی ہو۔

وسائل میں اضافہ اور بہتات کی زیادتی سے ماحول کو پراگندہ نہ کیا جائے۔ انیسویں صدی زندگی کے ماحول میں مقداری اور ماہیتی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ میں نے اسی زندگی کے ایک پرتو کا اوپر ذکر کیا ہے لیکن ایک لمحہ وہ بھی آتا ہے جب مہذب دنیا کا یہ عام آدمی اپنی فہم و فراست کی وسعت کے باعث ماضی کے اشرافیہ کی دست اندازیوں اور زیادتیوں پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس کی ایک مثال ترقی نے جو اس عام آدمی کو تحفظ فراہم کیا ہے (یعنی ہمیشہ ترقی سے ترقی نے بھرپور استفادہ کیا ہے) اس نے عام آدمی میں بد دلی پھیلائی جس کی بنا پر اس کی تحریک میں اعتماد آیا اور وہ جھوٹ اور بداخلاقی کا مرتکب ہوتا ہے۔ جو لاغرپن کی دلیل ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ دوسرے مسئلوں کے علاوہ اس عام آدمی نے انگریز اشرافیہ کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اگرچہ یہ معاملہ لائق تحسین اور بڑا دلچسپ ہے کیونکہ اگر تاریخ انگلستان کا مختصر جائزہ لیا جائے تو اس کی استثنائیت کا جواز اور اصول صداقت پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ اکثر یہ بھی کیا جاتا ہے کہ یورپ میں انگریز اشرافیہ کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اس کی یہ اشرافیہ ہمیشہ خطرات میں پل کر جوان ہوئی ہے اور چونکہ یہ مسلسل خطرات میں زندگی گزارتے ہیں اس لیے انھوں نے اپنی خودملکی بہت عزت و تکریم خود بھی اور دوسروں سے بھی کروانا ہوتی ہے اور اس میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جب وہ تکریم حاصل کرنے کی کوشش میں ہوتے ہیں تو وہ توڑ پھوڑ اور خود شکستگی کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ وہ شاید بھول جاتے ہیں کہ انگلستان اٹھارویں صدی تک مغربی یورپ میں غریب ترین ملک تھا۔ درحقیقت یہ وہی اشرافیہ تھی جس نے انگلستان کو بچائے رکھا تھا۔ انگلستان اگرچہ وسائل میں خود کفیل نہیں تھا۔ لیکن پھر اس نے اشرافیہ کی رہنمائی میں تجارتی اور صنعتی شعبوں کی ترقی میں داخلہ لے لیا۔ براعظم یورپ نے اس کی اس ترقیاتی حرکت کو ذلیل حرکت قرار دیا۔ دراصل میرے کہنے کا مدعا ہے کہ مابعد انگلستان اپنے معاشی نظام میں انوکھی اصلاحات کا اہتمام کیا جو دنیا میں اپنی نوعیت اور واحد

معیشت کا نظام قرار پایا ہے اور یہ سب کچھ اس بنا پر ہوا کہ انگلستان کی اشرافیہ صرف خود کو سہولیات اور فائدے نہیں پہنچائے بلکہ انھوں نے عوام کے لیے قاعدے قانون اور انصاف مہیا کرنے کا ایک زبردست نظام کا قیام عمل میں لائے تھے۔

میں ایک بار پھر اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ یہی غیر مہذبانہ رجحانات کا آدمی، تازہ ترین اور بربر نما خود رو آدمی اسی جدید تہذیب و تمدن کی پیداوار ہے۔ یہ عام آدمی بالخصوص انیسویں صدی کی مہذب ترین شکل و صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ عام آدمی پانچویں صدی کے سفید بربروں کی طرح سرپٹ گھوڑے دوڑا کر اس مہذب دنیا میں داخل نہیں ہوا اور نہ ہی یہ کسی پراسرار طور پر اس مہذب دنیا میں پیدا ہوا ہے۔ جس طرح "ارسطو" تالاب کے غوچکوں کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ تالاب کا قدرتی کھیل ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے درج ذیل دیے گئے فارمولا کو سامنے رکھتے ہوئے اس عام آدمی کے پیداواری مسئلہ جانچا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کو کرہ ارض کے حیوانی جغرافیہ کے قانون اور حیاتیاتی جغرافیہ نے اس عام آدمی کی فضیلت تائید اور تصدیق کر دی ہے کہ اب یہ انسانی حیات ترقی کے لیے خود جاگ اٹھی ہے اور جب اس نے گذشتہ وسائل کا موجودہ وسائل کے درمیان پائے جانے والے تفاوت کا موازنہ کر لیا تو اسے معلوم ہوا کہ طبعی اور روحانی نظام کے اس تغیر و تبدل کے نظام میں یہ فارمولا صداقت پر مبنی ہے۔ اسی طریق سے اس کا حوالہ مادی انسان پر لاگو کیا جاتا ہے۔ اسی طرح میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ انسان نے خود اپنے طور طریقوں اور ڈھنگ سے اس خطہ ارض پر توانائی حاصل کی ہے۔ یہ وہی خطہ ارض ہے جو گرمی کے موسم کو سردی کے موسم میں تبدیل کر کے اس کا معاوضہ ادا کرتا ہے جیسے منطقہ حارہ کے ممالک میں حیوان ناطق پستیوں میں گرتا ہے یا اس کے برعکس کم تر نسل، طبقے، حبشی وغیرہ کو اور ان سے بعد میں آنے والی نسل کو منطقہ حارہ میں واپس بھیج دیتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے طبقات اور نسل کو حالات اور واقعات کے یکے بعد دیگرے ارتقاء کے عمل کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

معاشرہ سے گھر کا کیا تعلق ہوتا ہے۔ اس کا ایک تعلق تو قوم سے ہوتا ہے جو قوموں کی تشکیل سے قبل یکجا ہو جاتا ہے۔ میں یہاں صرف ایک تعلق کی وضاحت کرنا چاہوں گا جو فوری نوعیت اور بھاری اکثریت کی گواہی دیتا ہے۔ وہ یہ ہے "اطمینان بالذات کی حکمرانی" آگے چل کر ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ جن اقوام نے مصمم ارادہ کیا کہ "وہ وہی کچھ کریں گے جس سے وہ خوش باش رہ سکیں" جو عوام کا کنسورشیم بھی انھیں اجازت دیتا ہے۔ جسے وہ اپنی فہم و فراست سے قوم پرستی کا نام دیتے ہیں۔ میں اس جھوٹی سپرد داری کو جو بین الاقوامیت تک جا پہنچتی ہے، بکواس سمجھتا ہوں اور ان سے بے حد نفرت کرتا ہوں کیونکہ اس کے برعکس ان کا یہ خود فریبی سے گزرتا دور اقوام کا کم ترقی یافتہ دور کہلاتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اشرافیہ کا یہ رکن اس وراثت کو اپنے نام سے مشروط کر دیتا ہے جو درحقیقت اس اشراف کی خود تخلیق نہیں کی ہوتی۔ وہ دراصل اپنی انفرادی موجودگی کو نامیاتی یونین میں تبدیل کر کے تخلیق کرتا ہے۔ وہ اچانک اور کچھ سمجھے بغیر اپنی پیدائش ہی سے اپنی امارت اور میراث پر اپنا استحقاق سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کے خود نے کوئی چیز پیدا نہیں کی ہوتی وہ کسی دوسرے عظیم اسلحہ ساز آدمی یا اس کے آباؤ اجداد نے تخلیق کیے ہوتے ہیں اور وہ صرف ان کا وارث کے طور پر زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے کی زندگی سے اپنے بناؤ سنوار کرتا ہے اور لباس پہنتا ہے۔ اس عقدہ کے کھولنے سے ہمیں کیا درس ملتا ہے؟ اس اشرافیہ کے رکن کی زندگی جو وہ اپنے اسلاف کا ترکہ سے لے کر بطور وارث کے زندگی گزارتا ہے تو وہ کیسے زندگی گزارتا ہے؟ اسی لیے اس اشرافیہ رکن کی آج بھی مذمت کی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ عوام الناس کی نمائندگی نہیں کرتا۔ ہماری فہم و فراست کا آج یہ نتیجہ نکلا ہے کہ یہ اشرافیہ کا رکن نہ ہی مکمل طور پر اپنے آباؤ اجداد کی عکاسی کرتا ہے اور نہ خود کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے اس اشرافیہ رکن چودھراہٹ، معتبری، صداقت اور زندگی کے دوسرے وقار کھو چکی ہے۔ اس نے اپنی ماہیت ایک دوسرے کی تصوراتی زندگی کی فراوانی کے باعث اس کی زندگی میں لاغرپن آگیا ہے۔ تمام زندگی ایک مسلسل جدوجہد ہوتی ہے جو بذات خود کوشش بھی ہوتی ہے۔ میں نے خود کے احساس کے حصول میں جس قدر مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ اس نے درحقیقت مجھے ہلا اور جگا دیا ہے۔ جس کے کارن میں نے اپنی سرگرمیوں کی وسعت کی لام بندی کر دی ہے۔ اگر مجھ پر میرے جسم کا بوجھ نہ ہوتا تو میں چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوتا اور اگر گرد و پیش کے ماحول نے مجھ پر دباؤ نہ ڈالا ہوتا تو میں اپنے جسم کے بوجھ کو مبہم، پلپلا، تھل تھل اور غیر حقیقی محسوس کرتا۔ اسی طرح اس اشرافیہ رکن کی شاہانہ طمطراقی کی انفرادیت اب مبہم ہو گئی ہے۔ کیونکہ اب اس نے کوشش اور مسلسل جدوجہد کے عمل کو چھوڑ دیا ہے۔ جس سے ہماری قدیم اشرافیہ کے احمقانہ پہلوؤں کا اظہار ہوتا ہے جو آج کل ہر کسی اشرافیہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی احمقانہ حقیقت ہے جس کو ابھی تک اس کے میکنزم کے المیہ میں یکجا کر کے بیان نہیں کیا گیا ہے۔ یہ وہ خوفناک اور المناک میکنزم ہے جو اشرافیہ کے تمام موروثی استحقاق کو ناقابل علاج سمجھ کر انحطاط پذیری کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔

صرف اسی لیے وہ ہمارے اور ہمارے وسائل اور رجحانات کے خلاف کام کرتا ہے۔ اس سے یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے وسائل کی بہتات اور کثرت عوام کی موجودگی کے احساس نے اسے حمایت کرنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن اس کے برعکس اس کثرت اور بہتات کی دنیا کے ممکنات اور گمان کی خود روئی سے بنی نوع انسان کی زندگی میں انارکی اور بداخلاقی پیدا کرتی ہے جسے عام طبقہ اسے موروثی آدمی کہتا ہے۔ جس کو اس ”اشرافیہ رکن“ کا ماڈل قرار دیتے ہیں اور یہ وہ فرد ہے۔ دوسرے چند بچوں کو خراب بھی کر دیتا ہے۔ اسی لیے ہمارے عام آدمی کو تیسرے درجے کا طبقہ قرار دیا گیا ہے۔ ہمیں ”اشرافیہ“ کے اس خفیہ راز کو استعمال میں لا کر زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہیے اور

اس کے بعد انیسویں صدی کی مدنیت نے اس عام آدمی کو کھلے بندوں اجازت دے دی کہ وہ کثرت تعداد کی دنیا میں اپنا مقام و مرتبہ خود متعین کرے۔ اس تہذیب میں جس میں تعیش اور آرام و سکون کے تمام ذرائع اور وسائل کا استعمال خود اس کی مرضی کے تابع ہوں اور جس تہذیب میں اسے کوئی دکھ، درد اور مشکل کا بار نہ اٹھانا پڑے جو اپنے گرد و پیش اپنی سلامتی اور حفاظت کے لیے نہایت ہی حساس اور جدید ہتھیار رکھتا ہو۔ علاج معالجہ کے لیے ہزاروں حیرت انگیز ادویات کی سہولت رکھتا ہو اور خود اس کی حفاظت کے لیے اس نے حکومتیں قائم کر رکھی ہوں اور اپنی صحت صفائی کے لیے خوب سے خوب تر انتظامات کرنے کا استحقاق رکھتا ہو۔ لیکن اس کے برعکس یہ عام آدمی کس قدر معصوم نظر آتا ہے۔ جب وہ اپنے حال کو یقینی اور تابناک بنانے کے لیے نئی نئی ادویات اور جدید و حساس ہتھیار بنانے کے لیے جتن کرتا ہے۔ کتنی مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ وہ بڑا متفکر نظر آتا ہے۔ وہ اتنا مصروف عمل ہو گیا ہے کہ وہ یہ محسوس ہی نہیں کرپاتا کہ اس کی ریاستی تنظیمیں یا جماعتیں کس قدر غیر مستحکم ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ذاتی ذمہ داریوں سے عہدا برآ ہونے کے لیے اسے کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس بے وزن مقدار نے اس کی فطرت میں خاصی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ جو اس کی بنیاد کو اس نے بگاڑنا شروع کر دیا ہے اور اس بگاڑ نے اس کی زندگی کے سواد سے تعلق کو توڑنا شروع کر دیا ہے بلکہ باعث بنا ہے اور بنیادی اور قطعی خطرت کا جواز پیدا کرتا ہے۔ حیات انسانی کی جس نوع میں سب سے زیادہ تضاد پایا جاتا ہے وہ ہے "اطمینان بالذات" لیکن جب انسان اس نوع کے اسباب دوسروں میں پاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خطرہ سر پر آچکا ہے اور جب وہ اعلان کرتا ہے کہ انسانیت پر تنزلی کا خطرہ غالب آنے والا ہے۔ جس سے اس کی موت واقع ہونے والی ہے۔ یورپ میں حال آج کی اہم سطح کے بارے میں اس کی توضیح یہ پیش کرتا ہے کہ یہ اعلیٰ درجہ کی سطح ہے اور ماضی میں تمام عصروں کی سطح سے زیادہ بلند ہے اور اس کا پلڑا بھاری ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر مستقبل پر نگاہ ڈالیں تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ اس کے اعلیٰ درجے یا اس سے نچلی سطح کے ارتفاع تک پہنچ جائے گی۔

انسان کی ضرورتوں کے پیش نظر اس کی اس حصوصیت "انسان بالذات" میں کافی ندرت اور صراحت کی غیر معمولی قوت پیدا ہو چکی ہے تاکہ اس کو بلند ترین مقام تک پہنچایا جائے۔ یہ وہ عام آدمی ہے جو زندگی کے اس حصے میں داخل ہو چکا ہے جہاں وہ اپنی پسند کا کام کر کے خوش ہوتا ہے اور کام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ وہ فریب ہے جو اس نے اپنے خاندان سے متاثر ہو کر لیا ہے یا یوں سمجھیے کہ ورثہ میں لیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ یہی ناں کہ اپنے خاندان میں اور خاندان کے حلقہ میں اگر بڑا نقصان بھی کرتا ہے تو اسے کوئی سزا نہیں دی جاتی۔ خاندانی حلقہ نسبتاً" مصنوعی ہوتا ہے جو سوسائٹی اور بیرونی دنیا کے تباہ کن ماحول سے متاثر ہو کر مصنف

پر خصوصی اثر انداز ہوتا ہے۔ ان تمام تاثرات اور معاملات کو خود اطمینانی کی وجہ سے وہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے، لیکن اس قسم کا آدمی سوچتا ہے کہ وہ جس طرح گھر میں کام کرتا ہے وہ اسی طرح گھر سے باہر کے ماحول میں بھی کام کر سکتا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ کوئی چیز بھی ہلاکت خیز یا مہلک، لاعلاج اور ناقابل واپسی نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ جو چاہتا ہے حاصل کر لیتا ہے اور وہی کرتا ہے جو اس کے من پسند ہو۔ یہ ایک توانائے کل کی بھول میں غلطی "جہاں تم جاؤ گے لے جائے گی" پر تگالی طوطے کی کہانی کی طرح وہ ایسی آواز یا حرکت نہیں کرتا جس سے آپ خوش ہوتے ہیں۔ سیدھی سی بات وہ اس کے سوا کچھ نہیں کرتا جو ہمیں کرنا چاہیے یا کرنا پڑے گا۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ نہ کرنے سے انکار کر دیا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس سے بھی ہم کوئی اور کام کرنے کے لیے آزاد نہیں ہو جاتے۔ یہ اس لیے کہ اس سے ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح ہم اپنی مرضی اور خواہش سے ایک منفی آزادی کو اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم اپنے مقدر کی سمت کو اپنی مرضی کے تابع کر کے موڑ دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ صرف ہمارے گھرے عقوبت خانہ کا قیدی بن جاتا ہے۔ اس سے بہتر اور واضح طور پر میں اپنے قاری کو نہیں بتا سکتا کہ عام آدمی کا انفرادی مقدر اس کے علاوہ کسی اور شکل میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ میں اپنے قاریوں کو ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ لیکن میرے لیے یہ تو ممکن ہے کہ میں اس کے مقدر کے خدوخال، خاص جزویات اور پہلوؤں پر بتا سکتا ہوں۔ جو ویسے ہی ایک دوسرے میں موجود ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یورپ کا ہر ایک عام ساکن پورے اعتماد اور یقین سے اس کی قوت و توانائی سے زیادہ جانتا ہے۔ جن کے بارے میں اس کے خیالات اور اظہار رائے کیا جا چکا ہے کیونکہ آج کا ہر یورپی باشندہ حریت پسندی کے الاؤ میں تپ رہا ہے۔ آیئے! اس پر غور کریں کہ آیا یہ "حریت پسندی" ہے یا "آزاد خیالی" کی کسی دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے جو اس کی خود تخلیق کی ہو۔ میں اس کا حوالہ اس طرح دینا چاہتا ہوں کہ یورپ کے اکثر رجعت پسند اپنے ضمیر کی گہرائیوں سے جانتے ہیں کہ یورپ کے تمام ساکنوں نے گذشتہ صدی میں لوگوں میں حریت پسندی کے لیے جو کوشش کی ہے وہ اس کی آخری پناہ گاہ، ناقابل ترمیم حقیقت اور بے رحم قسم کی کوششیں تھیں اس کی یہ کوشش بے شک آج کا مغربی انسان اسے پسند کرے یا نہ کرے۔

ناقابل تردید گواہیوں اور پورے وثوق سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ یورپ کی سیاسی آزادی اور اس کے نقش پر شاندار مستقبل کشیدہ کے حصول میں کی جانے والی کوششیں مثبت اور ٹھوس بنیادوں پر کی گئی تھیں۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اس میں بھی جھوٹ اور غلط ردوبدل کیا گیا ہے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ گزشتہ صدی میں دی جانے والی گواہیاں اور مواد بھی درست اور حقیقت پر مبنی تھا۔ یہ فیصلہ کن شہادت آج پورے یورپ کے کیمونسٹوں اور فاشسٹوں پر بھی صداقت کی دلیل دیتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی ذات کو ایک نسل میں تبدیل کرنے کے لیے کوئی طریقہ یا کوئی اور پہلو کو بھی اختیار کر سکتے تھے۔ سب کو معلوم ہے کہ حریت پسندوں کے خلاف ہر قسم کی تنقید اور

توجیہات پیش کرنے کے باوجود ان کی حریت پسندی میں ناقابل تردید سچائی پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس میں نہ علم ونظر، نہ سائنس اور نہ عقلی شعور کا عمل دخل ہے۔ بلکہ اس کے قاعدے قانون کی بنیاد مختلف اور فیصلہ کن ہوتی ہے۔ جسے میں مقدر کا سکندر یا مقدر کی حقیقت کا نام دیتا ہوں۔ مشاہداتی علم کی سچائیاں اور حقیقتیں نہ صرف متنازع ہوتی ہیں بلکہ اس کے تمام مطالب اور قوتیں اس کے متنازعہ ہونے کی دلیل ہوتی ہیں کیونکہ اس کے سارے سوتے اس کی بحث و مباحثہ سے پھوٹتے ہیں۔اس لیے وہ اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اس پر بحث کا عمل جاری رہے گا۔ کیونکہ وہ خاص طور پر اپنے پر بحث کرنے کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا مقدر کیا ہو گا اور کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے اس نکتہ کے موقف پر بحث نہیں کی گئی ہے۔ اسے نہ منظور کیا جاتا ہے اور نہ ہی رد کیا جاتا ہے۔ اگر ہم اسے مان لیتے ہیں تو ہم مستند ٹھہرتے ہیں اور اگر ہم اسے مسترد کر دیں تو ہم "تردیدی" ٹھہرتے ہیں اور ہم اپنے خود کی ہی دروغ بافی کرتے ہیں۔ مقدر وہ نہیں ہوتا جس کا ہم احساس کرتے ہیں کہ ہم کیا کرنا پسند کریں گے بلکہ یہ رویہ اور خدوخال کا نقشہ ہمارے شعور کی تہوں میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔

انسان کی زندگی میں بے توقیری اور تنزلی اس کے کسی ایک رویے اور روش سے پیدا ہوتی ہے جو وہ اپنے فرض کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی مستند ہستی ہوتی ہے لیکن بہرطور وہ ہوتا نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو بہتان تراشی میں بدل دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہوتی ہے جو اسے باور کراتی رہتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کم تر درجے کی گزارتا ہے۔ اس زندگی کے مقابلہ میں جس میں وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ بہرحال یہ مسخ شدہ عام آدمی خود کھودے ہوئے موت کے کنویں سے بچ نکلتا ہے۔

ہمیں کیا ضروری کرنا چاہیے جو ہم کرنا پسند نہیں کرتے۔ خود اطمینانی کی اس کیفیت اور خصوصیت کا انسان کو علم ہوتا ہے کہ بعض کام ہو سکتے ہیں اور بعض نہیں ہو سکتے لیکن پھر بھی وہ کسی بہانے اور سبب کے کارن وہ کام کرنے کا جتن کرتا ہے اور اس کے برخلاف استعمال کیے جانے والے الفاظ کی گواہی کو بھی مان لیتا ہے۔ فاشسٹ آج سیاسی آزادی کے خلاف ڈٹا ہوا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ جانتا ہے کہ وہ آئندہ کبھی ناکام نہیں ہو گا لیکن چونکہ یہ پوری زندگی کے ناگزیر مواد کا ایک حصہ ہے اور جب تک اس کی موجودگی کی حقیقت کی ضرورت ہو گی اس وقت تک وہ واپس نہیں جائے گا اور جب وہ جائے گا ایک سخت بحران میں لوٹ جائے گا۔ اسی طرح عوامی آدمی کی زندگی قوت بخش دوا کی طرح غیر سنجیدہ ہوتی ہے اور وہ اسے مذاق ہی مذاق میں اس کے اثرات اور معمولات کو نوٹ کرنا ناگزیر سمجھتا ہے کیونکہ وہ اسی طرح کرے گا جیسے اس کی "فلس ڈی فیملی" فراریت کی راہ اختیار کرنے کے لیے کہے گی۔ اس کی زندگی میں تند و تیز روش، قطعیت اور کلی طور پر فیصلہ کرنے کی صلاحیت وہ صرف اپنی بازیابی کے لیے اختیار کرتا ہے۔ یہ انسان المیہ کھیل کھیلتا ہے کیونکہ وہ اپنے المیہ کی حقیقت پر یقین نہیں رکھتا۔ جو دراصل اس مہذب دنیا میں کھیلا جا رہا ہے۔

یہ بہت اچھا ہو گا کہ اگر ہم ایک فرد کی مستند ذات کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ خواہ وہ کسی طرح اپنی خود اطمینانی کو ہم سے منوانے کی کوشش کرے لیکن اگر کوئی اپنی بات یا موقف پر بضد ہے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں تو یہ بھی کوئی جواز نہیں ہے کہ وہ بھولا بھالا آدمی ہے۔ اس کی اس ضد پر بھی ہمیں اعتماد کر لینا چاہیے کیونکہ وہ اس پر بھی اعتقاد نہیں رکھتا ہے۔ تاہم وہ کتنا ہی چیخ و پکار کرے وہ اپنے قتل کرنے کی اجازت خود ہی دے دیتا ہے۔ اس کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی پر اعتماد اور یقین کرتا ہے۔ یورپ کے ممالک میں آج کل ہر جگہ اور ہر قسم کی مضحکہ خیزیوں اور غم و غصے کے طوفان کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر اور اس سے نمٹنے کے لیے جس قسم کے بھی دعوے اور اعلانات کیے جاتے ہیں وہ تمام جھوٹ پر مبنی ہیں اور اس سلسلہ میں کی جانے والی کوششیں ہمارے اصلی مقدر سے ہمیں بہت دور لے جائیں گی تاکہ ہم اپنی گواہیوں کی شہادت کو نہ دیکھ سکیں اور نہ کوئی ہماری اپیلوں کو کوئی دھیان سے سنے گا تاکہ ہمارے اس عمل کو پس پشت ڈال دیں کہ ہم نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ ہم سب آج کے دور میں ایک مضحکہ خیز اور عجیب و غریب فیشن کے دور میں رہتے ہیں۔ افسوڑ اور سطحی فیشن نے ہماری شکل و صورت کو مصنوعی بنا دیا ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے جو ہر جگہ پایا جاتا ہے اور جہاں زندگی گزارنے کے طور طریقوں کی کوئی حتمی بنیاد نہیں ہے۔ جس میں وہ خود کو ڈھال کے اور اس کی وضع قطع اختیار کر کے اس طوفان بدتمیزی کو وقتی طور پر روکا جا سکے۔ عوامی آدمی اپنے مقدر کی بنیادوں پر مثبت انداز میں خود کلہاڑا پیوند کاری نہیں کرے گا۔ وہ اپنے افسانوی اور غیر حقیقی مقدر کو ابھی ہوا ہی میں روک دینے کو ترجیح دیتا ہے۔ ہم نے اس سے قبل غیر موادی گروہ یا جماعت کو اپنا نصیب بناتے نہیں دیکھا جو خود کو ہوا میں تحلیل اور بکھرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ یہ اس عہد کے رویوں کا بہاؤ ہیں کہ جس میں وہ خود کو پھسلنے کی اجازت دیتا ہو اور ایسے رجحان اور بہاؤ روکنے کے لیے بمشکل مزاحمت کرتا ہو۔ کیونکہ اس کے بگولوں نے فنون لطیفہ' خیالات' سیاست اور معاشرت کے رسم و رواج میں نئے انداز داخل کر دیے ہیں۔ لہٰذا مبالغہ آمیز تحریروں اور تقریروں نے پہلے سے کہیں زیادہ ترقی کر لی ہے۔ اس کے بالمقابل اہل الرائے اور حقیقت پسندوں کا موقف یہ ہے کہ عوامی آدمی نے ادبی تاریخ کے ارتقاء سے کہیں زیادہ ترقی کر کے کئی منزلیں آگے طے کر لی ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان دونوں نظریاتی گروپوں نے اپنے نظریاتی علم پر روشنی ڈالی ہے یا اسے بھی بیت الخلاء میں داخل کر دیا ہے۔

موجودہ صورت حال کو سمجھنے اور نوٹ کرنے سے ہمارا موقف واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے خصوصی خدوخال ماضی کے عصری زمانوں سے قدر مشترک رکھتے ہیں اور بظاہر یہ بحیرہ روم کی تیسری صدی عیسوی کی تہذیب و تمدن سے کہیں زیادہ بلندی پر پہنچ گئی ہے۔ جب فلسفہ کلیسی کا پیرو اپنا ظہور

کرتا ہے تو اس کے موروثی سینڈل کیچڑ سے لت پت تھے جو اویسٹوفس کے خوبصورت اور اعلیٰ بھاری قالینوں پر چلتے تھے۔ یعنی کلبی کے پیروؤں نے زندگی کے ہر شعبہ میں اوپر اور نیچے اور ہر جگہ ماحول کو آلودگی سے بھرا ہوا ہے اور یہ وہی کلبی ہے جو ہماری تہذیبی دنیا میں تخریب کاری کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا۔ جو قدیم یونانی مدنیت کا منکر کل تھا اس کا بس یہی کردار تھا کہ وہ ہر کام میں رکاوٹ پیدا کرتا تھا۔ اور دوسروں کی کوششوں میں رکاوٹیں کھڑی کرتا تھا۔ ہر حال وہ اپنی تمام کوششوں کو کامیاب بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اس نے کوئی چیز ایجاد نہیں کی اور نہ ہی کسی چیز کو بنایا ہے۔ فلسفہ کلبی کا پیرو کسی ایک تہذیب طفیلی زندگی کے حقائق سے مکمل طور پر انکاری ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے اس انکاری موقف پر ڈٹا ہوا ہے کہ وہ کبھی ناکام نہیں ہوا ہے۔ اس پیرو کا اس مہذب دنیا میں کیا مقام و مرتبہ ہو گا جہاں ہر ایک فطرتی طور پر اور سنجیدگی سے اپنے ذاتی کردار کا اس کے ذاتی کردار سے تجزیہ اور مقابلہ کرے گا؟ آپ کا فاشٹ گروہ اگر آزادی رائے کی مخالفت اور آپ کا غیر وجودی گروہ فنون لطیفہ سے متعلق زندگی کے بارے میں کوئی کلمہ خیر نہیں کہے گا تو کدھر جائے گا؟

اس منظم اور مہذب دنیا میں اس عام آدمی کے علاوہ اور کوئی اپنا بھرپور کردار ادا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ اپنے عہد میں اپنے مفادات کے متعلق ادراک رکھتا ہے اور آنے والے خطرات کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ لیکن یہ الگ بات کہ اس کے گرد و پیش کے ماحول اور حالات نے اسے خراب کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ ایک تہذیبی دنیا کا باشندہ ہے۔ وہ اپنے ایک ایک، گھر کے ماحول سے مکمل آگاہی رکھتا ہے۔ یہ گھر اس کے خاندانی حلقے ہوتے ہیں۔ اس لیے اس متلون مزاج آدمی کو آپ مجبور نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے موقف سے دستبردار ہو جائے۔ اس سے زیادہ بہتر آپ کو مدنیت اور کیا دے سکتی ہے کہ تم اپنے اعلیٰ اور بزرگوں سے مشاورت ضرور کر لیا کرو تاکہ تم اپنے مستقبل کے مقدر کو کسی بے رحم ہاتھوں میں دے کر خود اس کے ممنون احسان نہ بن سکو۔

باب - ۱۲

خصوصی مہارت کی بربریت

میں نے اسی مقالہ میں ذکر کیا ہے کہ عوامی آدمی انیسویں صدی کی خود رو پیداوار ہے۔ اس لیے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں اس کے عمومی اور خاص طور پر اس کے پیداواری میکنزم کو اس کے صحیح اور واضح پس منظر کو واضح کیے بغیر اس پر تنقیدی جائزہ پیش کروں۔ یوں مجھے اس عوامی آدمی کی جامد نوع نے میرے دل میں دلنشیں تحریک پیدا کی کہ میں اپنے اس مقالہ میں اس کا تنقیدی جائزہ پیش کروں۔

انیسویں صدی کی تہذیب کا خلاصہ میں صرف دو بڑی دوریوں کے حوالے سے پیش کرتا ہوں۔ ماہر فنیات اور آزاد "جمہوریت" پہلے اول الذکر کا حال بیان کرتے ہیں کہ سرمایہ داری اور تجرباتی سائنس کے باہمی اشتراک کے زقند لگانے سے جدید ماہرِ فنیات تخلیق ہوا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام ماہرینِ فنیات سائنسی ہوں۔ اسی طرح "چلی" کے ماضی میں ایک ماہر فن نے ایک پتھر کا کلہاڑا ایجاد کیا تھا۔ جس میں صرف سائنس کی کمی باقی رہ گئی تھی۔ لیکن اس میں تکنیکی پہلو کے تمام عناصر موجود تھے۔ ادھر چین اعلیٰ سطح کی فنی مہارت کو حاصل کر گیا ہے۔ جس میں کم از کم طبیعیات کی موجودگی کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صرف جدید یورپ کے فنی مہارت حاصل کرنے کا کمال ہے۔ جس میں سائنسی بنیاد موجود ہوتی ہے کہ جس سے ہم خصوصی کردار نگاری کا سبق پاتے ہیں۔ اس نے لامحدود ترقی کے دروازے کھول دیے ہیں۔ مطلب یہ کہ مصری، یونانی، روسی، شرقی اور مشرقی میں فنی پہلوؤں کی آمیزش میں ترقی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ جہاں سے آگے جانے کے لیے انھیں کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ اس سے آگے جائیں تو کہاں جائیں۔ لہٰذا ہم یہ کہنے پر مجبور ٹھہرے کہ " ہر کمالے را زوالے" یعنی بلندیوں سے پستیوں کی طرف رجوع کرنا ہے۔

اس حیرت انگیز فنی مہارت نے یورپ کے آدم زادوں کے خوابوں کی تعبیر کو ممکن حد

تک ثمر آور بنا دیا ہے۔ وہ لمحہ یاد کریں جب میں نے اس مضمون کا آغاز کیا تھا اور جب میں نے اس تکنیکی جرثومہ کے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرنے کی اپیل کی تھی۔ چھٹی صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک یورپ کی کل آبادی ۱۸۰ ملین سے زیادہ نہیں ہوئی۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۹۲۰ء تک یہی آبادی ۴۶۰ ملین تک پہنچ جاتی ہے۔ آبادی کی یہ برق رفتار زقند ہماری تاریخ میں بے مثل ہے۔ اس پر بھی شبہ نہیں کہ فنی مہارت نے آزاد جمہوریت کے ساتھ ملاپ کر کے عوامی آدمی کی افزائش نسل میں کمیت کا اظہار کیا ہے۔ دراصل میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہی مذکورہ یعنی افزائش نسل میں کمیت کا اظہار عوامی آدمی کی نوعیتی، ماہیتی اور ہجویہ اور ہتک آمیزی کرنے کا بھی ذمہ دار ہے۔

میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا کہ عوام الناس کو خاص طور پر کارکنوں میں شمار نہ کیا جائے۔ یہ سماجی طبقہ کی نمائندگی نہیں کرتے۔ تاہم وہ تمام سوشل طبقات میں شامل ضرور ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ ہمارے عہد کی زندگی کی نمائندگی بھی کرتے ہیں جو زور آور ہو کر حکومت کرتے ہیں۔ اب ہم اس قوت کو ثابت کرنے کے لیے اس کا سراغ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس عہد میں وہ اس معاشرتی سوشل پاور کو کیوں استعمال کرتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو اپنے ادراکی طرز عمل کو اس عہد پر نافذ کرتا ہے؟ تو ہماری نظر میں یقیناً" یہ متوسط طبقہ ہی قرار پاتا ہے۔ جو یہ سارے عمل کرنا چاہتا ہے۔ متوسط طبقہ میں سے وہ کونسا گورپ ہے جو اشرافیہ پر مشتمل ہوتا ہے؟ تو بلاشبہ فنیاتی ماہرین، انجینئرز، سرمایہ کار، استاد اور اسی طرح کے کئی اور لوگ ملک کی سب سے بڑی اور معتبر اشرافیہ قرار پاتی ہے۔ تکنیک کاروں میں وہ کونسا گروپ ہے جو ان کا امتیازی نشان کی علامت بن جاتا ہے؟ میں دوبارہ بھی ان سائنس دانوں کو ہی اشرافیہ کہتا ہوں۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے اگر کوئی تورانی پیکر یورپ کا دورہ کرے تو وہ بھی اس کو دیکھ بھال کر یورپ کے حق میں فیصلہ دینے میں خوشی محسوس کرے گا کیونکہ وہ خود دیکھے گا کہ یہاں (یورپ) سائنسی آدم زادوں کے حق میں فیصلہ دے کر کے فخر و نازاں ہو گا۔ بلاشبہ وہ ہمارے نورانی پیکر اور منفرد افراد کے بارے میں دریافت کرنا ضرور پسند نہیں کرے گا جو چینی قسم کے سائنسی آدم زادوں کے بارے میں دریافت کرنا ضرور پسند کرے گا جو اس عہد میں اور نوع انسانی میں بلاشبہ ارفع و اعلیٰ ہیں۔

اس تحقیق کا ماحصل یہ ہے کہ یہ اصلی سائنسی آدمی عوامی آدمی کے نقل مطابق اصل ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ کسی عوامی آدمی اور سائنسی آدمی کا یہ معاملہ صرف اور صرف سائنس پر ہے۔ جو ہماری تہذیب کا نتیجہ ہے جو خود روئی سے عوامی آدمی کے قلبی ماہیت میں بدل جاتا ہے۔ اور جس سے ایک قدیم اور مہذب آدمی پیدا ہوتا ہے اور جس نے اب ایک جدید بربری کا روپ دھار

لیا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ صداقت کبھی چھپ نہیں سکتی۔ میں نے اسے تسلسل کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی صداقت کے نامیاتی نظریہ کو میں نے اپنے مقالہ میں موزوں کر کے اس کی حقیقت کی سچائی کو چھان پھٹک کر کے سامنے لانا مناسب جانا ہے۔

عملی سائنس نے "گلیلیو" کی سولھویں صدی کے آخری حصہ کی نشاندہی کی تو اس نے سترھویں صدی کے نیوٹن اور اٹھارھویں صدی کے درمیانی حصے کی ترقی کے راز کا سوراخ فراہم کیا ہے۔ کسی چیز یا دور کی ترقی ایسے ہی نہیں ہو جاتی جیسے اس کے آئین میں ہوتی ہے۔ یہ حقیقت حالات سے مشروط ہوتی ہے۔ پس یوں طبیعاتی دستور جو عملی سائنس کا اجتماعی نام ہے۔ اس کے "نظریہ اضافت" کو متحد کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیوٹن اور اس کے عہد کے بعض دوسرے سنگی ساتھیوں نے ان تمام سائنسز کو باہمی اشتراک میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن افریقہ میں طبعی ترقی نے جو کریکٹر کے لحاظ سے مختلف ہے' متضاد ترقی کے اتحاد میں ایک اہم فریضہ ادا کیا ہے۔ مزید ترقی کرنے کے لیے سائنس نے "نظریہ تخصیص" پیش کر دیا ہے جو علم و عمل کا مطالبہ کرتا ہے بلکہ خود اور تمام سائنس دانوں کی ترقی کامطالبہ کرتا ہے۔ سائنس فی نفسہ متخصص نہیں ہوتی یعنی کہ ماہر فنیات نہیں ہوتی ہے۔ اگر ہو تو یہ بذات خود سچ کو ختم کر دیتی ہے۔ کیونکہ ایسا عملی سائنس میں بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ کلیت پر موقوف ہوتی ہے۔ لیکن اگر سچ ہے تو پھر یہ ریاضی کو منطق اور فلسفہ سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ بہرحال سائنسی تحقیق کی تخصیص کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

طبعی اور حیاتیاتی سائنسز کے تاریخی استنباطی عمل پر پہلی نظر پڑتے ہی اس کی افادیت میں دلچسپی لینے کا احساس دوگنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ کیوں نہ ہو کہ اس کے تمام تحقیق کنندگان نے اس کے فنیاتی شعبہ میں بالخصوص فن مہارت کی ضرورت میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ نسلی سائنس دان اپنے عملی تخصیص کو کس طرح اپنے دماغی تصرف میں محدود اور استعمال کر کے ترقی کی منزلیں عبور کرتے ہیں۔ یہ نکتہ اس لحاظ سے اہم نہیں ہے کیونکہ اسے تاریخ نے بتایا ہے کہ وہ ان متضاد مسائل کی نوعیت کو پیش کرے کہ کس طرح ایک نسل نے اپنے عہد کے سائنس دان کو صرف اس کے اپنے تحقیقی مشقت کے دائرہ کار میں پابند کر کے دوسری ترقی پسندانہ سائنسی برانچوں سے رابطہ کرنے کا موقع ضائع کر دیا ہے کہ جو کلیاتی کائناتی سائنسز کی ترجمانی کرتی ہیں' کے ساتھ اپنے رابطہ کو ختم کر دیا ہے۔ یہی وہ چیز یا حقیقت ہے جسے سائنس' کلچر اور یورپی تہذیب کا نام دینے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

تخصیص کی رسمی ابتداء ایک ایسے وقت میں ہوئی ہے جو اپنے اس مہذب انسان کو علم

قاموسی کا خطاب دیتی ہے۔ انیسویں صدی ان انسانوں کے رویے کے تابع ہو کر اپنا آغاز کرتی ہے۔ جس میں یہ ماہرین قاموسی معاشرتی طور پر رہ رہے ہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی تخصیص جو حضرات کا رنگ موجود تھا۔ اس کی "پیرو" نسل نے اس کا توازن بگاڑ دیا اور اوپر نیچے کر دیا۔ اس طرح موجودہ تخصیص جو لوگوں نے ان انفرادی سائنس دانوں کا کلی کلچر نکال باہر کیا ہے۔ ۱۸۹۰ء میں جب تیسری نسل نے یورپ میں اپنے ذہنی کمان کا چارج سنبھالا تو ہم نے اپنے درمیان ایسے نا بغہ روزگار سائنس دانوں کو موجود پایا ہے جن کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ یہ ایک ایسا مہذب انسان ہے جو گزشتہ نسل کے مصروف سائنس دانوں سے بہت زیادہ ادراک کرتا ہے۔ جسے منصفی کا آدمی بھی کہتے ہیں اور یہ ایک ایسا عظیم منصف انسان ہے جو اپنی ایک سائنس کی برانچ سے مکمل آگاہی رکھتا ہے۔ جسے ہر کوئی تحقیق، تجربات اور معائنے کرتا ہوا دیکھ سکتا ہے۔ وہ اپنی تنہائیوں میں بھی عملی سائنس میں مگن رہتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ اسے نیکی قرار دینے کا دعویدار ہے جو کھرا سچ ہے۔ یہ اپنے ادراک اور توجہ سے اپنے خارجی خطے کی مستعد سرگرمیوں سے بھی سروکار نہیں رکھتا اور نہ کچھ حاصل کرتا ہے۔ خاص طور پر اس حصے سے جس کو اس نے خود متمدن کیا ہے بلکہ وہ اس کو علوم و فنون لطیفہ کا نام دے کر اپنی تحقیق اور تجسس کے شوق کے علم میں شامل کر کے اپنے خاص شعبے میں مصروف کار ہو جاتا ہے۔

اس انسان کے ساتھ وہ کیا واقعہ پیش آیا ہے جس نے اس انسان کو اپنے مخصوص بصری خلیے میں محدود کر دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ وہی انسان ہے جو تازہ اور نئی صداقتوں اور سائنسی ترقی میں خاطر خواہ پیش رفت کر کے بڑے بڑے انکشافات کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ قاموسی ادراک کرنے والا بااصول اور کم علم سائنس دان خود اور حادثاتی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ ایسی چیز کیا اور کیسے ممکن ہوتی تھی اور اب کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ کیونکہ وہ اس کے بعد اس کے نتائج کی روشنی میں اس کی ناقابل تردید حقیقت پر غور و فکر کرنے پر اصرار کرنے کو ضروری سمجھتا ہے۔

عملی سائنس نے اس قدر زبردست اور شاندار ترقی کی ہے کہ ہم اس کو دیکھ کر پہلے اس کے شکر گزار ہوتے ہیں اور دوسری طرف اس کی حیرت انگیزیوں کو دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں۔ جب ہم اس انسان کو کوشش کر کے دریافت کر لیتے ہیں کہ اس ساری ترقی کا راز صرف اسی اوسط درجے کے سائنس دانوں نے آنکھ کو خیرہ اور تحیر خیز سائنسی ایجادات اور عملی تجربات کا انکشاف سے بھی کیا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری جدید سائنس ہی ہماری اصلی حقیقی تہذیب کی علامت ہے۔ جس نے عقل مند آدمی کو اعلیٰ مقام عطا کیا ہے تاکہ وہ صرف اپنے تخصیصی شعبہ میں مقید ہو کر ترقی کی کامیاب سرفرازیوں سے ہمکنار ہوتا رہے۔ اس کو اتنا بڑا مقام عطا کرنے کی وجہ یہ ہے۔ اس

نے لمحہ موجود کی تہذیب میں سے موتیوں کو چن چن کر جدید سائنس کی دنیا میں تہلکا مچا دیا۔ اس نے حیاتیاتی تہذیب میں میکانک سازی کے ذریعے حیرت انگیز ترقی کی اور اس ترقی کے باعث حیرت انگیز انکشافات کر کے موجودہ تہذیب و تمدن میں جہاں اعلیٰ و ارفع فوائد پہنچائے ہیں وہاں آرام و سکون کے علاوہ آئندہ پیش آنے والے سائنسی خطرات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ تکنیک سازی میں تو اس نے کمال کر دیا ہے۔ حیاتیاتی اور میکانکی کے شعبہ پر پڑی مٹی اور پردوں کو ہٹا دیا ہے اور انسانی زندگی میں اتنا آرام و سکون پہنچایا ہے کہ جس پر ہم سب فخر کناں اور نازاں ہیں۔ لیکن اس کی سائنسی بصیرت میں وہ مزید اور خاطر خواہ تحقیق کرنے پر بھی زور دیتا ہے۔ جسے کوئی ایک سائنس دان ہی سرانجام دے سکتا ہے۔ زیادہ یا کم سائنسز کو تقسیم کر کے یا کسی ایک شعبہ تک محدود کر کے اور خود کو صرف اپنے تک محدود کر کے سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ باقی شعبوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں رہ کر وہ اپنی اپنی تحقیق اور چھوٹی دنیاؤں میں بند ہو کر ترقی کے اس عمل کو آگے بڑھائیں اور یہ انسان ا جمادی حالت کو حرکت میں لاتا ہے اور صحت کے علوم و فنون میں ایک قانون و ضابطہ کے تحت اور اصلی علم کے دروازوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے کام کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ کام اسی طرح کیا جا سکتا ہے جیسے ایک شخص ایک مشین کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ اسے یہ جاننا ضروری نہیں ہوتا کہ وہ اس کے معنوی اصول کو بھی مد نظر رکھے۔ اسی طرح جدید اور ماہر سائنس دانوں کی ایک کھیپ نے سائنس کی عمومی ترقی کے تمام جوازوں کو اپنی اپنی لیبارٹریوں کے وسیع اور بے انت انکشافات کر رہے ہیں۔ یہ اسی طرح تحقیق کرتے ہیں جیسے شہد کی مکھی اپنے چھتے میں بیٹھ کر اپنے تخلیق کے عمل سے نبرد آزما ہوتی ہے یا پھر اسی طرح جیسے ریڑھی کے اوپر آگ میں سیخ کباب پکانے کا عمل کیا جاتا ہے۔

آپ کو حیرت ہو گی کہ اس انسان کے تجرباتی عمل نے ایک اور غیر معمولی اور عجیب و غریب آدمی کو تخلیق کیا ہے۔ اس نئے کھوجی نے فطرت کی ایک نئی حقیقت کا پردہ چاک کیا ہے اور اپنی خود یقینی، اپنی طاقت، ایمانداری اور لطیف حسی تجربے کی بناپر سچائی کے انکشاف کو انجام دیا ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ یہ آدمی پوری ایمانداری اور یقین کے ساتھ اپنے اندر کے نہاںخانہ میں دیکھتا ہے۔ تو محسوس کرتا ہے کہ اس کے نہاںخانہ میں پائی جانے والی تمام چیزوں کو جانتا ہے کہ ان کی حقیقت کیا ہے؟ تاہم اس پر کچھ تہیں پڑی ہوئی ہیں۔ جن کو وہ اپنے دماغی تفکر سے پرے کر دیتا ہے اور جان لیتا ہے کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ نہاں خانہ میں چھپے فکری اور علمی خزانے نہاں خانہ کے دروازوں کی درزوں سے وا کرتے ہیں۔ بس یہی متفحص آدمی ہے جو فطرت کے مقاصد کے اصلی اور اندرونی اور فطرتی حس لطافت کی حقیقت کا انکشاف کرتا ہے۔ لوگو! غور کرو۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ یہ وہی متفحص انسان ہے جس نے اس صدی کے اول حصہ میں ہمیں دنیا کے اس وحشی

اسٹیج پر لا کھڑا کیا ہے۔ متخصص آدمی اپنی اس چھوٹی سی خصوصی اور فنی مہارت کی دنیا کو اچھی طرح "جانتا" ہے اور باقی دنیا سے بنیادی طور پر ناواقف ہے۔

ہم اس عجیب و غریب "نئے آدمی" کے دو متضاد پہلوؤں کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس بات کا دعویٰ کرنے والے کہ "وہ انسانی پیداوار تھا" اس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ متخصص بھی ان بہت ساری تہذیبی نسلوں میں ایک حیرت انگیز اور ہو بہو مثال ہے جو ہمیں اپنی ندرت اور بنیادی فطرت سے واضح کرتی ہے۔ اور واضح طور پر آگاہ کرتی ہے کیونکہ ماضی میں لوگوں کو پڑھا لکھا اور ان پڑھ کے دو لفظی حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا اور یہاں کم یا زیادہ ایک قسم کے لوگ رہتے تھے۔ ان میں ہمارے اس متخصص انسان کو آپ ان دو حصوں (قسموں) میں ہرگز شامل نہیں کر سکتے کیونکہ یہ پڑھا لکھا اس لیے نہیں ہوتا کہ یہ ان تمام چیزوں سے رسمی طور پر ناواقف ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے تخصص کاری شعبہ میں شامل ہوتا اور نہ ہی وہ شعبہ سے ناواقف ہے بلکہ وہ صرف ایک سائنس دان ہوتا ہے جو صرف اپنے خود کے "حیاتیاتی" حصے کو جانتا ہے۔ مجھے کہنے کا موقع دیجیے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ جاہل ہے۔ یہ ایک بہت ہی سنجیدہ مسئلہ ہے۔ یہ اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو تعلیم یافتہ ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ لاعلم بھی ہے۔ یہ لاعلم آدمی بطور فیشن کے نہیں ہے بلکہ اس بدمزاج آدمی کی طرح ہوتا ہے جو ہر صورت میں اپنے شعبہ کا پڑھا لکھا آدمی ہے۔

یقیناً" اس متخصص کا اسی قسم کا رویہ (طرز عمل) ہونا چاہیے کیونکہ یہ سیاست، فنون لطیفہ اور سماجی چلن اور دوسری ایک قدیم اور جاہل آدمی کا رویہ اختیار کرتا ہے لیکن وہ اس کو اپنی پوری طاقت سے استعمال کرتا ہے بلکہ یہ اپنے خود کفالتی رویے کو بھی تسلیم نہیں کرتا کیونکہ اسی کا نام "تناقضہ" ہے کیونکہ یہ متخصص آدمی اپنے دوسرے معاملات میں ایسا ہی رویہ اختیار کرتا ہے۔ تہذیب اسے صرف مخفی علم کو آشکارہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے محفوظ اور محدود دائرے میں خود اطمینانی کی دولت سے سرفراز ہوتا ہے۔ اس کا احساس اور قابلیت اس کو اپنے اندر سیل پر حکومت کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی خارجی فنی مہارت پر غالب آتا ہے۔ اس مقدمہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ متخصص آدمی ہے۔ اس کی یہی خصوصیت اس کو عوامی آدمی کی زندگی میں مداخلت کرنے پر اکساتی ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے چھوٹے سے سیل کے علاوہ ایسا سلوک کرنے والا جاہل اور ان پڑھ آدمی ہے۔

یہ کوئی وحشیانہ بیان نہیں ہے کیونکہ اس نے سیاست، مذہب اور دیگر معاملات زندگی

میں (اس متخصص آدمی نے) بڑی بے دردی سے اپنے خیال، فیصلہ اور مستعد فعل کا احمقانہ طور پر مظاہرہ کیا ہے۔ جس سے لگتا ہے ایسی جبلتیں اس میں پہلے سے موجود تھیں جس کا اظہار اب اس نے احمقانہ طرز عمل سے کیا ہے اور یقیناً" اس عرضی خطے میں ایسے سائنسی "آدمیوں" کی کمی نہیں ہے اور اسی طرح ڈاکٹروں، انجینئروں، سرمایہ کاروں، اساتذہ وغیرہ کا رویہ بھی عوامی کی طرح بدل جاتا ہے۔ یہ رویہ اس انسان کے بالکل متضاد ہے۔ وہ خود کے سمعی اور بصری عمل کو کسی دوسرے آدمی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑتا اور نہ ہی تابع کرتا ہے۔ انھی عوامل کے بنیادی رویوں اور خصوصیات کے ذکر کو بار بار دہراتا رہا ہوں کہ یہی طور طریقے اس فیاتی ماہرمیں بھی عوامی آدمی کی طرح ہی پائے جاتے ہیں بلکہ اس کی جبلت کا حصہ ہوتے ہیں۔ اس کے یہ سب رویے اور خصوصیات اس بات کی دلالت کرتی ہیں اور کسی حد تک اس عوامی کے اصلی چہرے اور غلبے کا ثبوت بربریت کی صورت میں آشکارا کرتی ہیں۔ ترقی کے ان رویوں، خدوخال اور طرز عمل کے باعث یورپ ایک بار پھر تنزلی کے گڑھوں میں داخل ہو جائے گا۔ یورپ میں اس اخلاقی پستی میں جانے کا یہ ایک عالمی سبب ہو گا۔ مزید برآں ان کے ان شدید اور خوفناک رویوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ گذشتہ صدی کی تہذیبی ترقی کی انتہاؤں میں کس قدر زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ آپ اسے یوں سمجھیں کہ اس نے بھی حیرت انگیز اور خود اپنی ذات کے حوالے سے کس قدر ہیبت ناک دھماکے کیے جس کے باعث گذشتہ صدی کی ترقی نے ایک بار پھر جنم دے کر قدیمی اور بربریت کو جنگلوں میں بھیج دیا تھا۔

ہمارے عہد میں اس متخصص آدمی نے معاشرتی اور تہذیبی توازن کو بگاڑ دیا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ جب پہلے سے زیادہ سائنس دان پیدا ہو جائیں وہاں پر کم ہی بااخلاق لوگ رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یورپ میں ۱۷۵۰ سے زیادہ یہاں "سائنس دان" پیدا ہو جائیں اور موجود ہوں۔ انھوں نے سائنس کی دنیا میں اپنے سائنسی سیخ کباب کی ریڑھی سے بھی زیادہ ترقی کے ارتقاء میں خود ہی اضافہ کرکے اور ترقی کا انقلاب برپا کیا ہے۔ وہ یہ انقلاب اپنے یقین اور اعتماد پر لائے ہیں۔ کیونکہ سائنسی عہد کو ایک نگران کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اپنی ترقی کے ارتقاء میں خود ہی اضافہ کرنے کا باعث ہو۔ دوبارہ مشقت اور عرق ریزی اور اپنا دستور سازی کا عمل جاری رکھ سکے میں نے پہلے بھی کہا کہ ان کا یہ فعل تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی دوسری سائنسوں کے ساتھ باہمی اشتراک کے عمل کو تیز کرے جو زیادہ تر بڑھتا جاتا ہے۔ اور کم از کم طور پر گھٹتا ہے مگر اس کے باوجود دنیا کے تمام سائنسی علوم کے حصول میں بے انتہا کی وسعتوں کو چھو لیتا ہے۔ "نیوٹن" علم فلسفہ کو جاننے کے بغیر طبیعیات کے شعبہ میں اپنا ایک نظام اور مقام دریافت کر لیتا ہے۔ لیکن اس نے جب آئن سٹائن کی ضرورت محسوس کی تو اس نے خود کو "کانٹ" اور سیچ کے کے فلسفہ سے مخمور کر لیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ

اپنی کسی ترکیب کی کماحقہ واقفیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔ کائنات اور میچ کو فلسفیانہ اور منطقی خیال کی علامت سمجھتے تھے جنھوں نے آئن سٹائن کو بھی زیر اثر کر دیا تھا۔ انھوں نے آخرالذکر کے ذہنی فکر کو بالکل نظرانداز کر دیا تھا کہ وہ خود اپنی جدت کو تن تنہا آشکارا کرے لیکن اس کے لیے آئن سٹائن ناکافی تھا۔ طبیعیات اپنے تاریخی بحران میں داخل ہو رہی تھی اور اسے صرف ایک نئے علم قاموسی کے واسطے سے بچایا جا سکتا تھا جو اول الذکر سے بہتر نظام کا حامل ہے۔

اس طرح جب عملی سائنس کے اس متخصص نے اس صدی میں اتنی زبردست ترقی کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تو اس نے سٹیج پر آ کر دستک دی کہ اس نے اب فنی مہارت میں ترقی کے سوا اور کچھ نہیں کرنا۔ اس نے اعلان کیا کہ جب تک نئی نسل ریڑھی والے سیخ کباب کو زیادہ ترقی یافتہ بنانے کے مواقع فراہم نہ کرے گا وہ آرام سے نہیں بیٹھے گا۔ لیکن فنیاتی ماہرین ہی اگر سائنسی فلسفہ کے اندرونی اور بنیادی رویوں سے جو اس نے خود خلق کیے ہیں سے ناواقف ہے تو پھر اسے بنیادی طور پر تاریخی صورت حال سے ناواقف ہونے کی ضرورت پیش آئے گی تاکہ وہ اپنے ترقیاتی سائنس کے نظام کو جاری و ساری رکھ سکے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے سوسائٹی اور نیا آدمی کے نظام کے طریق کار کو اس طرح منظم کرنا پڑے گا کہ اس تحقیق اور تفتیش کرنے والے اپنے تجرباتی عملیات کو جاری رکھ سکیں۔ حال ہی میں مَیں نے اوپر بیان کیا ہے کہ سائنسی پیشے اور روزگار میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس سے قبل بھی میں اس کا ذکر کر چکا ہوں۔ کیونکہ یہ کیفیت بے قراری ہر ایک فرد کی جبلی علامت ہوتا ہے۔ اسے اپنی تہذیب کی اس بے قراری کو دور کرنے کے لیے اپنا ذہن واضح طور پر صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے "یہ تہذیب کیا ہے؟" اور اس سے کس قسم کے فعل کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن میرا یہ خیال ایسا خیال ہے جو ایک مثالی سائنس دان کے ذہن میں عموی طور پہ کم ہی پایا جاتا ہے اور یہی کمی ہماری تہذیب کے لیے خطرناک حد تک خطرے کا باعث بن سکتی ہے۔ لیکن اسے کامل اعتقاد ہے کہ از منہ ماضی کے جنگلات میں موجود پیری کی طرح تہذیب اور اس ارضی خطہ میں پیری وافر مقدار میں پائی جاتی ہے اور پکارتی ہے کہ کوئی تو ہو جو اس کا گریبان چاک کرے۔

باب - ۱۳

ریاست ایک عظیم خطرہ

ایک صحیح عوامی سرکار کو تشکیل دینے اور خاص مقصد کے حصول میں عوام از خود کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ یہ تو ہدایت پانے، مطیع رہنے، نشان ہونے، منظم ہونے، خود کو تقسیم کرنے اور زیادہ سے زیادہ تمنا کرنے کے لیے اس دنیا میں آئے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ وہ از خود کرنے کے لیے اس دنیا میں نہیں آئے ہیں۔ کیونکہ عوام کو اپنی بہتر زندگی کی خاطر کسی اعلیٰ عدالت (جو اقلیتوں میں سے ہوتی ہے) کی اطاعت شعاری کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اعلیٰ افراد کون لوگ ہوتے ہیں جن پر اپنی حسب منشا گفتگو کی جا سکے خواہ وہ کوئی بھی ہوں اور کیا ان کے بغیر عوام الناس اپنی ضروریات زندگی محفوظ کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا بحث طلب مسئلہ ہے جس پر شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ الگ بات کہ یورپ نے اس بے مہار شتر مرغ کی قیادت میں ایک صدی گزار دی ہے اور اس سوچ میں غلطاں اور کوشش میں رہے کہ کیا وہ اس کھری صداقت کو رد کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ہماری رائے حقیقت پر مبنی ہے۔ اس لیے ہم اس پر بحث نہیں کر رہے بلکہ اس کے معاشرتی علوم جو نیوٹن کی طبیعیات کے قوانین سے بھی زیادہ غیر متحرک ہیں' کے حوالے سے بحث کر رہے ہیں۔ بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ یورپ میں مستند فلسفہ کی حکومت ہے۔ بس یہی ایک صداقت ہے جو عوام کا تحفظ کر سکتی ہے۔ ایک بار پھر ایسا وقت آئے گا جب وہ محسوس کرنا شروع کر دیں گے کہ انسان پسند کرے یا نہ کرے۔ قدرتی طور پر وہ اپنی ہست و بود میں قوت محسوس کرے گا اور وہ ضرور کسی اعلیٰ مقتدر کے حضور درخواست گزار ہو گا۔ یا یوں کہ کوئی انسان اس کے وجود (ہستی) کو پسند کرے یا نہ کرے۔ وہ از خود قدرتی طور پر وجودی عمل میں اعلیٰ مقتدر سے درخواست گزاری کے لیے رجوع کرے گا۔ انسان اگر اسے از خود تلاش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو یقیناً" وہ ایک عظیم آدم زادہ ہے۔ اگر وہ تلاش کرنے میں ناکام ہوتا ہے تو وہ بے شک عوامی آدمی ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے

سے برتر لوگوں سے اپنے خود کو تسلیم کروائے۔

کیونکہ یہ رسم منشائے ربانی خود کے ہست و بود (وجود) کے حق اور مقتدر کی خاطر جدوجہد کرے کہ وہ ازلی طور پر سرکش ہوتا ہے اور جو کچھ وہ آج کر رہا ہے یہ اس کے خود روئی ہونے کے ایک تسلسل کی کڑی ہے۔ یہ وہی عوام الناس کی جدوجہد ہے جو ایک بغاوت ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں کیونکہ جب کوئی معقول حد تک اور سچائی کی انی پر بیٹھ کر بغاوت کرتا ہے تو یہ از خود کی سرکشی کو تسلیم کرتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی منزل نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ وہ اپنی ذات کی تقسیم اور نفی کرنے کے لیے بغاوت کرتا ہے۔ آرک ا-ینجل' لوسیفر کی بغاوت اس سے کوئی کم نہیں ہے۔ اگر وہ خود خدا بننے کی بجائے جو یقیناً" اس کی منزل مقصود نہ تھی' اس نے بھی یقیناً" فرشتوں سے کم تر ہونے کے لیے جدوجہد کی تھی جو ظاہر ہے اس کی یہ کوشش بھی ویسی برابری کی منزل نہ تھی۔ اگر لوسیفر (ابلیس) روس کے ٹالسٹائی کی طرح ہوتا تو وہ بھی شاید اسی طرح کی بغاوت کرنے کو ترجیح دیتا جو کسی نہ کسی طرح خدا ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

جب کثیر عوام از خود متحرک ہوتے ہیں تو وہ صرف ایک وجہ پر ایسا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ وہ اختیار اور قانونی حیثیت کے بغیر مجرموں کو سزا دیتا ہے۔ اس کو محض ناگہانی فعل قرار نہیں دے سکتے۔ اس لیے آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ کم تر قانون امریکا سے یہاں امپورٹ ہوا ہے۔ امریکا میں یہ فعل بطور ایک فیشن اختیار کیا جاتا ہے اور یہ وہی امریکا ہے جو عوام الناس کی ارضی جنت ہے۔ جب عوام فتح یاب ہوں گے تو یقیناً" تشدد کو بھی اس کے ساتھ ساتھ کامیاب ہونا چاہیے۔ مطلب یہ کہ ان دونوں کی حیثیت اور اصول کو یکجان ہونا چاہیے۔ ذرا پہلے میں نے آپ کی توجہ اس تشدد کی انتہائی ترقی پر مبذول کروائی تھی جو اس بات کی علامت ہے کہ اس کا بھرپور حملہ ہونے والا ہے۔ آج کے عہد میں متشددانہ کاروائیاں مبالغہ آمیزی ہے۔ کیونکہ یہ فن تشدد کا خود ساختہ استاد ہے۔ جب انسانی ہستی نے اپنے خود کے تاریخی نصاب کو مکمل کر لیا تو اس کا جہاز تباہ ہو کر مردہ ہو گیا تو تب سمندر کی لہروں نے اسے مبالغہ آمیزی کے ساحلوں پر پھینک دیا۔ جہاں اس کی لاشیں کافی دیر تک پڑی رہی ہیں۔ مبالغہ آمیزی انسانی حقیقت (نفس الامری) کا شہر خاموشاں ہے۔ اس طرح جیسے بوڑھوں کے گھر ہوتے ہیں۔ صداقت خود اپنے نام سے زندہ رہتی ہے جو اول و آخر ایک لفظی ہے جو اپنے خود کو قدرتی طور پر آشکارا کرتی رہتی ہے۔

اگرچہ اس تشدد کی کسی کلی نظام یا اصول کے حوالے سے ترقی نہیں ہوئی لیکن اس کی ترقی پسندانہ سرگرمیاں اب پستی کے گڑھوں میں داخل ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ لہٰذا ہمیں پوری ذمہ

داری ہے یورپی تہذیب کے لیے متوقع اور خوفناک خطرے کا بگل جو بج رہا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔ ان تمام دوسرے خطرات کی طرح جس نے یورپی تہذیب کو جھنجھوڑ کر بلکہ ہلا کر دھمکی دی ہے کہ جاگ ذرا یورپی تہذیب جاگ! کہ یہ خطرہ خود مول لیا ہے کیونکہ یورپی تہذیب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ اپنی عظمتوں اور خطرات کے ساتھ ساتھ اپنی معاشرتی زندگی کی ترقی بھی کرتا رہتا ہے اور تشکیل کرتا ہے جیساکہ سب جانتے ہیں کہ آج اس کو ریاست کہتے ہیں اور ہم ایک ایسے نقش ثانی کے بالمقابل کھڑے ہیں۔ میں یہ نقش ثانی (چربہ) سائنس کو کہتا ہوں جس کا ذکر میں نے گزشتہ باب میں بھی کیا ہے۔ اس نے اپنی زرخیزی سے معاشرتی صلاحیتوں میں حیرت انگیز طور پر ترقی کرنے کا عزم کر لیا ہے۔ لیکن اس کے اپنے شعبہ اختصاص نے سائنس کا گلا دبانے کی دھمکی دے دی ہے۔

اور آج ریاست بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہے اور اگر ذرا دھیان اور ذہن پر زور ڈالیں کہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں ریاست کے ہاتھوں سے یورپی قوموں کی کیا صورت بن گئی تھی۔ بالکل ایک چھوٹا سا مسئلہ! سرمایہ دارانہ نظام اور صنعتی نظم اور اس کی سائنسی تکنیک کی کامیاب ترقی نے پہلی بار سوسائٹی میں اس کا نفاذ کر دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں ایک نیا سماجی طبقہ ابھر کر سامنے آیا ہے جو تعداد اور مضبوطی کی بنیاد پر ماضی سے کہیں زیادہ طاقتور ہے اس معاشرتی قوت کا نام متوسط طبقہ ہے۔ اس زیرک اور ہوشیار سوشل طبقہ پر ایک چیز نے قبضہ کر لیا ہے۔ جو پہلے قبضوں سے بہت بڑا ہے۔ اور یہ چیز اس طبقہ کی ذہانت مطانت اور ذوق ہے۔ اس متوسط طبقہ کی عملی ذہانت اور عملی استعداد کاری جانتی ہے کہ وہ خود کو کس طرح منظم کرتا ہے۔ اور کس طرح ریاست میں نظم و ضبط قائم کرنا ہے اور اس عمل کے دوران اپنی کوششوں کو کیسے تسلسل کے ساتھ اور مستقل مزاجی سے جاری رکھنا ہے۔ اس طبقہ نے اسی "ریاستی جہاز" میں سوار ہو کر اپنے اپنے سمندری ساحلوں کے پر خطر سفر پر روانگی کر دی ہے۔ بورژوا (متوسط طبقہ) نے ریاستی جہاز کو دوبار تیار کیا ہے اور جس نے خود کو وسیع و عریض بحر' مطلق باردار جہاز کا بادوباراں کے طوفانوں میں سفر کرنے کا بغور اندازہ لگا لیا ہے۔ جیساکہ میں نے کہا ہے کہ یہ ایک چھوٹے سے جہاز کا چھوٹا سا مسئلہ ہے۔ اس کے پاس کوئی فوج نہیں ہے۔ مگر اس کے پاس فقط بیوروکریٹس کی آرمی اور دولت ہے۔ ابتدا میں اس جہاز کو قرون وسطٰی کے ایک خاص طبقہ کے لوگوں نے تیار کیا تھا جو اس بورژوا طبقہ کے جہاز سے کافی مختلف تھا۔ یہ عالی منش لوگ ایک ایسے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو بے پناہ قائدانہ صلاحیتیں رکھتے ہیں اور یہ طبقہ حسی لطافتوں سے ذمہ داری کے ساتھ عہدہ برا ہونے کی قابلیت رکھتا ہے۔ اس لیے یہ قابل صد احترام ہیں۔ اس طبقہ کی غیر موجودگی میں یورپی اقوام اپنی ہست و بود کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اس طبقہ کے ان اشرافیہ میں پائی جانے والی خوبیاں اور خامیاں ہمیشہ سے بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں اور یہ

طبقہ اپنی اچھائیاں اور برائیاں ہمیشہ اپنے سربراہ کے کھاتے میں ڈالتے تھے*اور میں اس طبقہ کی محدود قابلیت، جذبات، وجدان صرف ایک لفظ میں "نامعقولیت" پر مبنی ہوتے ہیں۔ انھوں نے سائنسی تکنیک میں کوئی ترقی نہیں کی ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو تحویل کا تقاضا کرتی ہے۔ مقام شکر ہے کہ اس نے بارود ایجاد نہیں کیا ہے۔ یہ نئے ہتھیار اور اوزار کو ایجاد کرنے کے ناقابل تھے۔ انھوں نے "بورژوا" طبقہ کو اجازت دے کر بارود کو شاید مشرق سے منگوا کر اپنے استعمال میں لائے اور پھر جنگ جو امیر زادوں کے خلاف جنگ میں استعمال کیا اور کامیابیوں سے ہمکنار ہوتے رہے ہیں۔ "ہسپانوی" معزز شخص (کلینزو) نے نقانہ طور پر لوہے میں ڈال کر بند کر دیا۔ تاکہ وہ جنگ کے دوران بمشکل حرکت کرے اور یہ وہ شخص ہے۔ جس نے کبھی سوچا نہ تھا کہ قدیم زمانوں کی جنگوں کے دوران وہ کونسے حربے ان لوگوں نے استعمال کیے جس سے انھوں نے اپنا دفاع خود کیا۔ یہ طبقہ نہیں جانتا تھا کہ آج کے نپولین نے جنگ عظیم اول کے حملوں کے دوران اور اپنے دفاع کے لیے کونسی جدید ترین تکنیک کے حربوں کے طریقوں کو دریافت کیا۔

ہم ریلنکی (Ranke) کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس ایک تاریخی واقعہ پر سے پردہ ہٹایا ہے کہ انھوں نے قرون وسطیٰ کی اشراف آرمی کو اس لفظ "بورژوا" کی حاکمیت میں بدل دیا ہے۔ اس نے آج کی اشرافیہ فوج کو ماضی کی آرمی کے فن حرب اور دیگر جنگی و حربی اور دفاعی حربوں کے تسلسل کو باہم کر دیا جس سے ماضی کو بورژوائی فوج کا تعلق موجودہ بورژوائی فوج سے قائم کیا ہے۔ اس حقیقت سے بھی ہمیں روشناس کرایا۔ ماضی اور حال کی بورژوائی فوج کا رشتہ ایک ہی نسل سے اور صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔

جیساکہ ریاست ایک تکنیکی مسئلہ ہے۔ یعنی عوامی نظام اور انتظامیہ "قدیم نظام حکومت" جو کمزور ریاست کے ساتھ اٹھارویں صدی کے اواخر تک آ پہنچتا ہے جو چاروں جانب سے سوشل بغاوت سے گھری ہوئی ہے۔ اس وقت جو ریاستی قوت اور سوشل طاقت کے مابین اس قدر عدم مساوات ہے کہ اس کا موازنہ اگر جارجی میگنی کی ریاست سے کیا جائے تو اٹھارویں صدی کی ریاست سے زیادہ کمزور تھی لیکن اس کے مقابلہ میں مضافات کی سوسائٹی طاقت کے لحاظ سے کمزور تھی۔

اس نکتہ کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ یورپ کی کئی شاہی حکومتیں کمزور ریاستوں سے منطبق رہی ہیں۔ اس سوال کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ اگر ریاست مطلق طور پر طاقتور تھی تو اس نے

خود کو کیوں طاقتور اور مضبوط نہیں بنایا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ نا اہل تھے۔ تکنیکی نظم و نسق، بیوروکریسی شاہی نسل سے تھے لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ ماضی میں اور کچھ بھی ہوا کہ شخصی ریاست اور اس کی اشرافیہ نے منصب و وقار اور دولت کو عمومی طور پر معاشرتی زندگی کے ساتھ اس کی آمیزش نہ ہونے دی۔ شاہی ریاست حساسی طور پر سوسائٹی کی عزت و تکریم کرتی تھی۔ لیکن اس نے اپنی تاریخی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا۔

یہ شاہی حکومت چند آدمیوں کی بنیادی خصوصیات اور مشاہدات کے ذریعے بڑے بڑے کام سرانجام دیا کرتے تھے اور یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے آج کے کام کو کل کے سپرد کرنے کا کام بھی کرتے تھے۔ مزید برآں عوامی آدمی ریاست میں ایک گمنام مضبوط طاقت دیکھتا اور اس میں خود کو بھی ایک گمنام ریاست سمجھتا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ ریاست بھی اس کی اپنی ہے۔ فرض کیجیے کسی ملک کی عوامی زندگی میں کوئی مشکل تنازع یا کوئی مسئلہ سر اٹھاتا ہے تو عوامی آدمی فوراً اٹھ کھڑا ہو گا اور ریاست سے مطالبہ اور خواہش کرے گا کہ وہ اس معاملہ کو فوری طور پر رفع دفع کرے۔

آج بھی ہم اس عوامی خواہش اور مطالبہ کو پورا کرنے کے مسئلہ سے دوچار ہیں۔ یہ ایک سنگین مسئلہ ہے جس نے تہذیب کو دھمکی دے دی ہے کہ وہ ریاست کے معاملات میں مداخلت کریں گے۔ چونکہ ریاست نے از خود خودروئی سے یہ طاقت حاصل کر کے تحلیل کر دیا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ریاست نے از خود یہ تاریخی اور خودروئی طاقت کا عمل برجستگی سے دہرا دیا ہے جو اس خودروئی فعل کو مستقبل میں ترقی کرنے کے لیے اور وسیع کرنے کے لیے مزید آگے روانہ کر رہی ہے اور جو انسانی مقدر کو خود بخود برانگیختہ کرے گا۔ چنانچہ عوام الناس پر کوئی مصیبت آئے یا پھر اسے ہوس پرستی کی بھوک لگ جائے تب اسی عوام میں از خود اشتعال اور سرکشی کرنے کا جذبہ اٹھتا ہے۔ لالچ پیدا ہوتا ہے اور اس کی یہ ہوس پرستی کی خواہش اور جذبہ از خود دنیا کی چیزوں کو فتح کرنے اور سمیٹنے کے عمل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ان کی یہ خواہش، جذبہ، شک اور خطرہ بغیر کسی کوشش اور جدوجہد کے پیدا ہوتا ہے۔ جیسے اب یہ بٹن دبانے سے اس بھاری مشین کو چلا دیتا ہے۔ عوام خود کو ریاست سمجھتے ہیں جو از خود ایک غلطی پر مبنی ہوتی ہے۔ آپ اس کو یوں سمجھیں کہ انسان خطاکار ہوتا ہے۔ ریاست اس وقت عوام ہوتی ہے جب اس کے دو آدمی سامنے فعل کرتے دکھائی دیں۔ کیونکہ یہ دونوں کسی کے نام سے واقف نہیں ہوتے۔ ہمعصر ریاست اور عوام دونوں کی پہچان اور ہستی اس میں ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے میں گمنام زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ ان کا قدیمی راز ہے۔ جس پر جمی ہوئی پرتوں کو ہم نے ہٹا دیا ہے۔ حتیٰ کہ عوام کی خواہش اور جذبہ ایک نہ ایک دن ایمان ہو جاتا اور پکار

اٹھتا ہے کہ وہ ریاست ہے تب اس کی خواہش سرکشی کرتی ہے کہ عوام اپنی مشینری کے تمام کل پرزوں کا ایک بٹن دبا کر مشین کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرتا ہے اور اپنی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی دبی ہوئی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے کئی حیلہ سازی، بہانے اور عذر پیش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور ریاستی ڈھانچے کو دھمکی دے دیتا ہے۔ ریاست کے کاموں میں خلل اور کئی الجھاؤ پیدا کرنے کی دھمکی دیتا ہے جو ریاست کو بے حال کر دیتی ہے۔ وہ ہر حالت میں ریاستی اقلیت تباہ و برباد کرنے پر تلی ہوتی ہے جو ریاستی اقلیت کو لاغر اور بے حد کمزور کر دیتی ہے۔ مثلاً" ریاست سیاسی نظم و نسق (ڈھانچہ) صنعت اور معیشت کے میدان میں اکھاڑ پچھاڑ کر دیتے ہیں۔

عوام کے اس رجحان کا نتیجہ بڑا مہلک ثابت ہوا۔ عوام نے خودروئی قوت کے بل بوتے پر سوشل ایکشن کیے ہیں۔ جس پر ریاست نے بار بار مداخلت کرنا ضروری جانا۔ ریاست کے ڈھانچے کی توڑ پھوڑ سے اس کے ڈھانچے میں سکت نہیں رہتی کہ وہ اس عوامی ریلے کے سامنے ٹھہر سکے۔ ریاست کو سوسائٹی کے لیے زندہ رہنا چاہیے اور سوسائٹی کو ریاست کے لیے زندہ رہنا چاہیے۔ مطلب یہ ہوا کہ دونوں لازم و ملزوم تشکیل پاتے ہیں۔ اور عوام کو حکومتی مشینری کا ایک اہم کل پرزہ کے طور پر رہنا پڑتا ہے اور یوں بالآخر یہ ایک مشین ہے۔ جس کی ہست و بود کی تعمیر، مرمت اور اس کے مضافاتی گرد کی آلودگی کو فتح کرنے اور اس کی صحت و صفائی کرنے کی ذمہ داری اور انحصار ریاستی نظم و نسق پر ہوتی ہے۔ اگر ریاست کا مغز اور گودا نکال دیا جائے تو سوسائٹی میں خون کی حرکت بند ہو جاتی ہے اور پھر صرف ایک ڈھانچا، زنگ آلود مشینری رہ جائے گی۔ اس مشین کی نفرت انگیزی اس کے نامیاتی جسم کی مدت سے زیادہ توانا اور طاقتور حالت میں زندہ رہے گی۔

یہ قدیم تہذیب کا افسوسناک اور غضبناک مقدر تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "جولی" اور کلاڈی کی خسروانہ ریاستیں ایک سے ایک بڑھ کر قابل تحسین تھیں جو خدوخال اور ساخت کے لحاظ سے قدیم "روما" کی اصلی اور جمہوری ریاستوں سے مقابلتاً" اعلیٰ اور زیادہ بہتر مشینری رکھتے تھے لیکن عجیب اتفاق ہوا کہ۔ان کی مشین نے ترقی کی تمام منزلیں طے کرنے کے باوجود سوسائٹی کے نامیاتی جسم کو خوراک نہ دی اور وہ تباہ و برباد ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس سے قبل دوسری صدی کے دور میں ریاست نے اپنی اعلیٰ حاکمیت اور زبردست مخالفت کے باوجود سوسائٹی کی مشین پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا، اپنی سوسائٹی کو زبردستی غلام بنایا، تشدد کیا۔ بے پناہ ظلم کیے۔ ظلم کے اتنے پہاڑ گرائے کہ اگر وہ زندہ بھی بچ نکلے تو صرف وہ ریاست کی تابعداری اور خدمت گزاری کریں گے۔ عوام کی ساری زندگی کو بیوروکریسی کے ماتحت کر دیا تھا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ بیوروکریسی نے زندگی کے تمام شعبوں کی اکھاڑ پچھاڑ کر کے تباہ و برباد کر دیا، وہ مرجھا گئے اور زندگی کے تمام اختیارات خود سنبھال لیے۔ ان کی اقتصادی

حالت پتلی کر دی تھی اور افزائشِ نسل پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔ فیملی پلاننگ کے منصوبہ پر عمل در آمد سختی سے شروع کر دیا تھا۔ یعنی "بچے کم اور ریاست خوشحال" ریاست نے اس وقت اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پہلے توجہ دینے کی ضروریات کو محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی بیوروکریسی کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دے کر سوسائٹی میں عسکری قوت کو بھی ابھرنے کا موقع دیا اور یہی طاقت شاہوں کی فوج ہوتی تھی۔ اس سے پہلے ریاست (ان کے جان و مال کی ضمانت دیتی تھی کہ جس سے عوامی آدمی پیدا ہوا تھا) جو سب پر حاوی فوج افریقی نژاد سیوری نے پوری دنیا کو عسکریت میں لپیٹ لیا تھا۔ متکبرانہ کام یا بدبختی میں اضافہ ہوا، عورتیں کم بچے جننے لگیں۔ حتیٰ کہ فوج میں بھی کمی پیدا ہو گئی اور سیوری کے دور کے بعد خارجی لوگوں سے فوج میں بھرتی ہونے کا آغاز ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ملکی سپاہیوں کی تعداد میں زبردست کمی آ گئی۔

کیا خلاف قیاس اور شماریاتی حقیقت کو اب محسوس نہیں کیا جاتا؟ اور کیا سوسائٹی زندگی کے لیے بہتر مواقع فراہم نہیں کرتی اور کیا یہ ریاست کو ایک مشین کی طرح خلق نہیں کرتی؟ اس سبب کے کارن آج کی ریاست کی خود بالادستی قائم ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ سوسائٹی کے ذریعے زندہ رہتی ہے۔

یاد کریں وہ جملہ جو سیپٹیمس سیویرس نے اپنے بیٹوں سے کہا "آپس میں متحد رہو۔ سپاہیوں کو معاوضہ ادا کرو اور باقی کسی کا کوئی لحاظ نہ کرو"

لیکن اس کے باوجود ریاست اب بھی سوسائٹی کے ارکان پر مشتمل ہے۔ لیکن جلد ہی ان اراکین نے اس کی حمایت کرنا کافی نہ سمجھا اور پھر اس کو (ریاست) کو مجبوراً" بدیسی فوجوں کو بلانا پڑا تھا۔ سب سے پہلے ڈالماشی لوگوں کو بلا کر فوج میں شامل کیا۔ اس کے بعد جرمنوں کو دعوت دی گئی۔ ان بدیسی فوجیوں نے ریاست پر قبضہ کر لیا اور تمام سوسائٹی جو اکثریت میں ہوتی ہے پر قبضہ کیا۔ اس اکثریتی سوسائٹی کو ریاست کا غلام بنا دیا گیا۔ عوام کو اس کا غلام بنا دیا گیا۔ ان دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ اس طرح ریاست کی قیادت کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ لوگوں کو متحرک کیا جاتا ہے کہ وہ اس مشین کا پیٹ بھرتے رہیں جو کہ از خود ایک ریاست ہے۔ یہ ڈھانچا اپنے ارد گرد پڑے گوشت سے پیٹ کے دوزخ کو بھرتا ہے۔ اس طرح تختہ دار از خود مالک بن جاتا ہے اور اس گھر کا مالک کرایہ دار ٹھہرتا ہے۔

جب اس کی حقیقت اور ضرورت اور امیدوں کی آواز مسولینی کے کان پر پڑی تو اس

نے اٹلی میں اس فارمولے کا اعلان کیا کہ "تمام ریاست کے لیے" تو بس اسی اعلان نے فاشزم کی ابتداء دریافت کر لی ہے۔ یہ ایک خاص قسم کی عوام الناس کی تحریک ہے۔ مسولینی نے ظاہر ہے اس ریاست کو خود تعمیر نہیں کیا تھا۔ بہرحال اس نے ان خیالات اور قوتوں جن سے وہ نبرد آزما تھا' سے حاصل کیا۔ اس نے آزاد ڈیموکریسی کے نظریہ کی تکمیل کرنے کا اعلان کیا تھا۔ تاہم اس کے تمام اختیارات کو اپنے قبضہ میں کیا اور اپنے منصوبے کا معائنہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ اب تک اس سے جتنے نتائج اخذ کیے گئے ہیں اس کا مقابلہ آزاد ریاست میں سیاسی اور انتظامیہ کے شعبہ کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس نے کوئی فائدہ حاصل کیا بھی تو وہ بھی معمولی فائدہ حاصل کیا جو بہت کم نظر آیا وہ یہ کہ اس نے ریاست کی تمام مشین کی قوتوں کو اپنی ذات میں مجتمع کیا ہے۔ کیونکہ وہ پھر بھی اپنے بیوٹی (جوہر) میں کمی محسوس کرتا تھا اور اس کی اس کمی کے اشتعال کو استعمال کر کے اپنی مشین کی اس حالت اور خصوصیت کو چالو کرنے کے قابل ہوا۔

جمہوریت ایک برتر قسم ہے۔ جس کو تشدد اور براہ راست عمل سے لایا جاتا ہے۔ جب تشدد اور براہ راست ایکشن کو بطور معیار تسلیم کیا جاتا ہے اور اس معیار ریاست سے اور اس کے ذریعے سے دیگر معیار قائم رہ جاتے ہیں۔ اس ذریعہ کو گمنام مشین کہتے ہیں۔ عوام الناس کی سرگرمی اور کردار صرف اپنے لیے ادا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی طرح یورپی اقوام کو اپنی اندرونی زندگی میں مشکلات کا دور پیش آتا ہے۔ بالخصوص اقتصادیات اور عوامی نظم و نسق کو چلانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ کیا ہم یہ محسوس کیے بغیر رہ سکتے ہیں کہ عوامی حکمرانی میں ریاست فرد یا گروہ کی آزادی کو کچل نہ دے گی اور اس کی ذاتی آزادی کو پامال کر دے گی اور کیا یہ عوامی کاشت کی گئی فصل کو تباہ و برباد نہ کر دے گی۔

ہمیں اس میکنزم کا ٹھوس ثبوت گزشتہ تیس سالوں کے مظاہر قدرت سے مربوط اس ایک عجیب و غریب ماحول سے میسر (حاصل) ہوتا ہے کہ تمام ممالک نے اپنی اپنی پولیس میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ پولیس فورس میں اضافہ کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ ان تیس سالوں میں آبادی کے بڑھنے میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ تاہم اس اضافہ میں ہمارے معاشروں کی روایات کا بھی بہت عمل دخل ہے۔ تاہم یہ معاشرے اپنے اپنے رواجوں کے کتنے ہی پابند کیوں نہ ہوں وہ اس خوفناک تناقض کو اپنے ذہن سے کھرچ نہیں سکے۔ جس سے آبادی میں اضافہ اس کی ضرورت بن گیا تھا۔ لوگوں نے اپنے ماضی کے تسلسل کو ایک بار پھر جوڑ دیا چنانچہ انھوں نے اس تسلسل کی روانی میں اس عہد کے ایک بڑے اور جدید شہر کی فلاح و بہبود' کاروبار حیات' امن و امان پر توجہ دے کر پولیس کے محکمہ میں اضافہ کیا اور امن عامہ کو درست کرنے کے لیے پولیس انتظامیہ کو قول متناقض پر عمل کرتے

ہوئے ہنگامی بنیادوں پر منظم کیا۔ یہ قانون کے محافظوں اور شہر کی بھلائی کے لیے پولیس فورس میں اضافہ کیا جو ایک احمقانہ پن ہے۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ یہ "عوامی اتھارٹی" جو شہریوں کے امن و امان کے لیے بنائی گئی ہے۔ تخلیق کی گئی ہے وہ پہلے اپنی خواہشات کے مطابق اس کا نفاذ کریں گے۔ کیونکہ وہ اپنی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خود کی ہست و بود کو ختم کر دیں گے۔ دراصل انھوں نے اپنی قدرتی بصیرت سے اس کا نفاذ کیا جو ایک قدرتی اور فطرتی عمل کے استعمال کا تقاضا کرتی ہے۔

پولیس اہل کاروں نے نظم و ضبط قائم کرنے اور اس پر قانونی عمل کے نفاذ کے دوران جو رویہ اختیار کیا اس کے خلاف سوسائٹی نے کیا ردعمل پیش کیا۔ اس کا بیان اور اظہار ہمارے لیے یہاں بہت ہی ضروری ہے۔ تقریباً "۱۸۰۰ء میں جب جدید اور نئ صنعت نے ایک" نیا آدمی" کا دھاکا کیا یعنی" نیا صنعتی کارکن" پیدا کیا تو پولیس کارکنوں کے بالمقابل اس نئے "صنعتی آدمی" (کارکن) میں ترقی اور صنعتی اور اہلیت کے زیادہ جرثومہ پائے جاتے تھے اور یہ ترقی کرنے پر زیادہ مائل ہوا۔ فرانس نے پولیس فورس میں فوری طور پر اضافہ کر دیا۔ ۱۸۱۰ء تک انگلستان نے فرانس کو دیکھتے ہوئے اپنی پولیس فورس میں بہت اضافہ کر دیا۔اگرچہ انگلستان خطاکاری کی اس بہتی رو میں داخل ہو گیا تھا۔ لیکن انگریزوں نے اچانک محسوس کیا کہ پولیس فورس جدید طرز کی ہے اور حاکم قدامت پسند ہیں تو ایسی صورت میں وہ کیا کریں گے؟ اور کیا وہ پولیس کو قائم کریں گے۔ انھوں نے اس خطاکاری کو برداشت کیا جتنا کہ برداشت کی سکت ان میں تھی۔ لوگوں نے اس مصیبت اور بد نظمی کو تنہا کام کرنے کی اجازت دے دی۔یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ یہ قیمت آزادی کے لیے دے رہے ہیں۔ جان ولیم وارڈ لکھتا ہے۔ "پیرس" میں ایک قابل صد تحسین پولیس فورس موجود ہے جس کی ترقی اور فوقیت کے لیے اس نے اپنی محبوبہ کو بھی قربان کر دیا ہے۔ میں اس خواہش کو ترجیح دیتا ہوں کہ ہر تین یا چار سال بعد نصف درجن لوگ اپنی سرکشی کے باعث اپنے جرم کا اقبال کرتے ہوئے اپنے گلوں کو راٹلفے روڈ پر کٹوا دیا کرتے تھے لیکن انھوں نے سکونتی دورہ کرنے اور نوچے کے میکنزم کے حصول کے لیے مخبری کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ریاست کے بارے میں یہاں ہمارے پاس دو متضاد خیال نظریے ہیں۔ انگریز مطالبہ کرتا ہے کہ اس کے آغاز پر حد قائم کر دینی چاہیے۔

باب - ۱۴

دنیا میں کس کی حکمرانی ہے؟

میں پہلے بھی کئی بار ذکر کرچکا ہوں کہ یورپی تہذیب نے عوامی بغاوت کو تخلیق کیا ہے۔ اس نقطہ نظر سے میں نے ایک امید افزا پہلو کو آشکارہ کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عوامی بغاوت قسم کی تحریک کے دو نام ہیں جیسے نتھو سنگھ اور پریم سنگھ اس میں بے سروپا مبالغہ آمیزی ہو چکی ہے۔ جس نے ہماری زندگی کی موجودگی کو درس عبرت دیا ہے۔ البتہ برخلاف اس کے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جو بڑا بھیانک اور خوفناک ہے۔ جو یہ ہے کہ انسانی زندگی میں اخلاق پست کر دینے کے عمل نے آغاز کر دیا ہے۔ آیئے ذرا ہم اس پر ایک نئے تناظر میں غور کرتے ہیں

ایک نیا تاریخی جوہر اور کردار کو انسان اور اس کی روح کے اندرونی اور بیرونی تصادم اور توڑ پھوڑ کے نتیجہ میں حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ نتیجہ رسمی اور میکانیکی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دباؤ نے روح کو باہر نکال دیا ہے۔ اس لیے جب ہم ایک عہد کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو سب سے پہلے ہم یہ سوال سمجھنے کے لیے پوچھتے ہیں۔ یا پوچھنا چاہتے ہیں کہ دنیا میں کس کی حکومتٗ ہے؟ اور در حقیقت صورت حال کچھ یوں ہے۔ کہ انسانیت اس وقت دنیا میں مختلف گروپوں اور گروہوں میں بکھری پڑی ہے۔ اسے آپ اتفاق کا گمان کہہ لیجیے۔ اور کمال یہ ہے کہ ان سب کا آپس میں میل جول اور راہ و رسم بھی نہیں ہے۔ اور نہ یہ نسل اپنے اندرونی اور بیرونی تغیر و تبدل سے پیدا ہونے والی خودمختاری کی دنیاؤں کو نہ ترتیب دے رہے ہیں اور نہ ہی منظم کر رہے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سولھویں صدی میں نسلِ انسانی نے وسیع پیمانے پر متحد اور ہم خیال ہونے کے عمل میں داخل ہونے کا آغاز کر دیا ہے۔ اب ہمارے عہد میں یہ آخری سرے تک پہنچ چکی ہے۔ ہماری صدی میں اتحاد اور ہم خیال ہونے کی انتہا ہو چکی ہے۔ نسلِ انسانی کا کوئی خطہ یا علاقہ ایسا نہیں ہے جو ایک دوسرے سے بے خبر ہو۔ یا ایک دوسرے کے جزیرے سے جدا رہتا ہو۔ اس لیے اس صدی عیسوی سے متعلق یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس دنیا میں جو کوئی حکومت کرتا ہے۔ عوام الناس اس کی اطاعت کرتی ہے۔ دراصل یہ حکومت سب پر یعنی ساری دنیا میں اخلاقی اور روحانی طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اپنے اثر و رسوخ استعمال میں لاتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ تین صدیوں میں یورپی عوام نے، اس حکومت کی

خاطر ایک ہم جنس (متجانس گروپ) تشکیل دیا ہے۔ جو اسی حکومت کی طرح زبردست رول ادا کرتا ہے۔ یہ یورپ کی حکمرانی اور یورپ کی حکومت تھی۔

دنیا میں یورپ کی حکومت اور دنیا ایک اکائی کی صورت میں ایک وحدت کی کمان میں قیام پذیر ہے یعنی ترقی پسندانہ وحدت کسی صورت میں رہتی ہے۔ اس قسم کے اس طبعی روپ کو ہم جدید دنیا یا جدید زمانہ کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس کا کوئی رنگ و بو نہیں ہے۔ یہ بے نام ہوتی ہے۔ مگر موثر طور پر کام کرتی ہے۔ اور کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دیتی۔ بس یوں سمجھیے کہ یہ یورپی حکومت ہے۔ جو ساری دنیا پر راج کرتی ہے۔ ہم اس حکومت کی مادی قوت اور جسمانی بربریت کو بنیاد بنا کر یہاں گفتگو نہیں کرتے۔ بلکہ ہم احمقانہ تصورات کو سمجھنے سے گریز کرتے ہیں۔ اور غیر مہذب اصولوں کو سمجھنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس کے پائیدار و مستحکم اور طبعی تعلق کا معروف نام حکومت ہے جو کسی جبر اور قوت پر بھروسہ نہیں کرتی اس کے برعکس اس میں انسانوں کا کوئی گروپ اپنے ضروری سماجی مواد اور طاقت و جبر کی مشینری کے ساتھ اپنے اپنے علاقوں میں عوامی نظم و نسق پر راج کرتی ہے۔ یوں پہلی نظر میں یہ ایک طاقت اور قوت نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد کمان پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ کمان بھی اس وقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب اس کا قریب سے جائزہ لیا جائے۔ یا معائنہ کریں۔ بس! یہی ہمارے اس مقالے کا طرہ ء امتیاز ہے۔ اور ثبوت ہے۔ آپ کو یاد کراتا چلوں کہ نپولین نے سپین پر بھاری قوت سے حملہ کی قیادت کی اور وہ یہاں بحالت جنگ رہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے سپین میں ایک دن بھی حکومت نہیں کی۔ بے شک اس کے پاس بے حد قوت اور مشینری تھی۔ اس لیے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ حملے کے عمل اور حکومت کی صورت کے درمیان خط امتیاز قائم کیا جائے۔ مقتدر کی طبعی حالت پر حکومت مشق کرتی ہے۔ اور حکومت کی فاعلی اساس عوام الناس کی آراء کی کمان میں ہوتی ہے۔ ایک ہزار سال قبل کا ذکر ہے۔ کہ انگریزوں میں سے آسٹریلیا کے اصل باشندوں نے جنم لیا۔ اسے بھی عوام ہی کہتے ہیں گویا اس ارضی خطے میں عوامی آراء کے سوا کبھی کسی نے اس دنیا میں حکومت نہیں کی۔

خیال کیا جاتا ہے کہ ایک وکیل "ڈینٹن" (Danton) نے عوامی آراء کے اقتدار اعلیٰ کو سب سے پہلے ۱۷۸۹ء میں متعارف کروایا تھا۔ "سینٹ تھامس اقیناس" (Saint Thamas Aquinas) نے عوامی حکومت کو ۱۳ ویں صدی میں ایجاد کیا تھا اس قیاس اور گمان کو بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک عصر سے دوسرے عصر نے انکشاف کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوامی حکومت ایک اساسی قوت ہے۔ جو قدیم اور جدید معاشروں میں حکومت کرتی ہے۔ اور جب تک بنی نوع انسان موجود ہے اس کی حکومت بھی برقرار رہے گی۔ نیوٹن کی طبعیات کے مطابق میلان ہی طاقت ہوتی ہے۔ جو تحریک پیدا کرتی ہے۔ اور علم سیاست کی تاریخ میں عوامی آراء کا بنایا ہوا قانون ہی میلان کا آفاقی قانون ہوتا ہے۔ اور اس کے بغیر تاریخ کی سائنس بھی ناممکن ہے۔ چنانچہ ہیوم (Hume) کا یہ کانٹے دار خیال کہ تاریخ کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ عوامی آراء کے اقتدار اعلیٰ' ایک مثالی تمنا' اور حدی لکیریں

کھینچنے کے لیے اپنا ثبوت مہیا کرے کہ دونوں میں کس قدر فاصلہ ہے۔ دراصل انسانی معاشروں میں اس قسم کی صورت حال اور واقعات اکثر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اس شخص کے بارے میں خیال کریں۔ جس نے اپنے آلہ استبداد کے کارن جانثار فوج کی مدد سے حکومت کرنے کی کوشش کی تھی۔ تو یہ اس کی تجاویز تھیں اب باقیماندہ عوام پر منحصر تھا۔ کہ وہ اسے حکومت کرنے دیں یا نہ کونے دیں۔ عوام کی مرضی اور آراء بہرحال مقدم اور مقتدرہ اعلیٰ ہوتی ہے۔

بلکہ تاریخی سچ یہ ہے کہ جانثار حکومت سے مل کر حکومت نہیں کی جاسکتی اور جب کہ ٹیلیرنڈ (Talleyrand) نے ایک بار نپولین سے کہا تھا "جناب عالی! آپ رائفل کی سنگینی پر سے ظلم و ستم کے پہاڑ تو توڑ سکتے ہیں لیکن اس پر آپ خود بیٹھ نہیں سکتے"۔ یقیناً" حکومت جسم کے اشاروں سے نہیں کی جاتی بلکہ حکومت روح کی پرستان جسم پر اشارہ کرنے سے کی جاتی ہے۔

یعنی میری مراد یہ ہے کہ حکومت صرف "عاجزی" سے کی جاتی ہے۔ خواہ یہ پھانسی کے تختہ پر ہو یا پادری کی سیٹ پر ہو۔ حکومت "انکساری" سے کی جاتی ہے۔ جذبات انگیز ناٹک' بے جان اور غیر معقول دلائل سے حکومت نہیں کی جاتی۔ یہ صرف ایک "مداری کا تماشہ" ہے۔ اس مضبوط کرسی کو کس نے بنایا ہے؟ یہ ریاست کی رائے ہوتی ہے جو خوبصورت انداز میں دی جاتی ہے۔ اور اس ریاستی فیصلہ میں غیر جانبداری کرنا وقت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی چونکہ عوامی آراء کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اس لیے ایک وقت آتا ہے کہ سوسائٹی کے گروہوں میں اخلاقی جھگڑے' ناچاقی اور بے ہنگم سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دونوں گروپ اپنے اپنے خیالات اور نظریات کے حق یا مخالفت میں رائے اور دلائل دیتے ہیں اور ایک دوسرے کو قائل کرتے ہیں۔ یا مسترد کرتے ہیں۔ ان کے باہمی جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ حکومت کی تشکیل کی جائے۔ عوامی آراء ایک کو تجویز کر لیتی ہے۔ اور ایک کو مسترد کر دیتی ہے۔ ایک کو مقتدر بنا دیتی ہے۔ دوسرے کو مسترد کر کے نفرت کا اظہار کر کے اس کو ناپسند کرتی ہے۔ چنانچہ اگر ہم عوامی آراء کے بارے میں تاریخی کشش کے حوالے سے کوئی قانون بنانا چاہیں تو ضرور اس امر کو دیکھنا پڑے گا۔ کہ کہاں موجود ہیں اور کہاں کہاں غیر حاضر رہتی ہے۔ اور غور و خوض کے بعد ایک فارمولہ ایجاد کیا جائے گا کہ جو ایک مصحف' قابل تعظیم' کھرا ہے اور وہ فارمولہ تقاضہ کرتا ہے کہ عوامی مشورے اور آراء کی مخالفت سے حکومت نہیں کی جاسکتی اور نہ رہ سکتی ہے۔

ہمیں اس سے تقویت پہنچتی ہے کہ حکومت عوامی غلبہ کی دلالت کرتی ہے۔ اور واضح کرتی ہے اور اسی طرح روح کو بھی واضح کرتی ہے۔ یعنی زبان خلق کو نقارہ ء خدا سمجھنا چاہیے۔ وہ یوں کہ عوامی حکومت میں جو کہا جاتا ہے اس پر عمل درآمد بھی کرایا جاتا ہے۔ اس کو روحانی عمل یا روحانی قوت کہتے ہیں۔ جس کی صحت اور باقاعدگی کی تصدیق تاریخ کے آئینہ میں کی جاتی ہے۔ تمام قدیم

حکومتیں ایک متبرک کردار رکھتی ہیں۔ کیونکہ ان کی اساس مذہب پر قائم کی جاتی ہے اور مذہب حکومت کی اولین قسم ہے۔ جس کے بعد یہ غیر مادی شخصیت (نفس) خیال اور رائے کو تخلیق کرتا ہے۔ المختصر! یہ بے حد طبعی اور غیر مادی ہوتی ہے۔ زمانہ ء وسطیٰ کے قدیم ادوار میں اس عجیب و غریب واقعہ/واضح اور کشادہ بنیادوں پر دوبارہ بیان کیا ہے۔ یورپ میں چرچ پہلی بار عوامی ریاست کے اقتدار اعلیٰ کا قیام عمل میں لایا ہے۔ اس چرچ نے اس کو اپنے خاص نظریات اور واضح تجویزی کردار کے ساتھ اس کو وقوع پذیری اور نمو بخشی ہے۔ اسے "روحانی قوت" کہتے ہیں۔ یہ سب طور طریقے سیاسی طاقت نے چرچ سے دریافت کیے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی اس کا ماخذ ہوتا ہے اور یہ روحانی اقتدار ہے جس کے بعض خیالات اپنے ہوتے ہیں۔ بدیں وجہ یورپ میں مقدس رومی سلطنت کا قیام عمل، میں آیا تھا اس طرح دونوں کے درمیان حکومت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ان دونوں کے جوہر میں بنیادی طور پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں ایک روح ہوتی ہیں۔ اور انھوں نے ایک دوسرے سے ایک معاہدہ کیا ہوتا ہے۔ کہ ہر ایک خود کو درجات میں پابند اور محدود کر دیتے ہیں۔ یعنی عارضی اور ابدی طور پر محدوذ کرتے ہیں۔ عارضی اور ابدی طاقت دونوں کی مساوی طور پر روحانی ہوتی ہے۔ لیکن یہ مذہبی روحانیت' عوامی آراء کی روحانیت' اور دنیاوی رائے جو خود کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ کیونکہ یہ ابدی روحانیت صرف اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان مقدر اور مقصد میں سب کچھ ودیعت کیا ہوا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دو معروضی اوقات اور عہد میں ایسے انسان' ایسے عوام' اور متجانس گروپ ہمیشہ کمان کرتے ہیں۔ جیسے آج معروضی حالات اور وقت کی دنیا میں فوقیت رکھتے ہوں اور یہ خیالات' ترجیحات اور تمنائیں اور مقاصد کی ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔

اس غلبہ کو کس طرح سمجھا جائے؟ اکثریت کے اپنے نظریات ہوتے ہیں۔ جس طرح مشین میں تیل ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح فہم و فراست میں خارج سے اندر پچکاری کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے۔ بعض انسان یا چند دوسرے گمان کرنے والوں کو بھی اپنی مقتدرہ کو اندر پچکاری کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ وہ لوگ جو اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں۔ یا رائے دہندہ نہیں ہیں۔ یعنی اکثریت کو بھی اپنی اپنی رائے دینا شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر انسانی زندگی میں مادی' تہی دامنی' یا جسمانی ڈھانچہ میں کمی واقع ہو جائے گی۔اس کمتری کے باعث اسی طرح روحانی طاقت کے بغیر کسی پر کمان کرنااور متناسب نظم و نسق میں مادہ ء انسانیت پر حکومت کرتی ہے اور عین اسی طرح طاقت کو ہٹانا موقوف کرنا اقتدار اعلیٰ میں اپنی آراء کی طاقت کے باعث ہر قسم کی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ بھی تاریخی کشش کے نتیجہ میں تبدیلی آئی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اب ہم وہاں چلتے ہیں جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔ لوگو! یورپ نے دنیا میں صدیوں برس حکومت کی ہے۔ لیکن حالت اس کی ایسی ہے جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں منجمد ذرات ہوتے ہیں۔ یہ ایک نسل کے عوام ہیں' اور روحانی طور پر ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔

جیسے منجمد پانی میں ذرات زمانہ وسطیٰ کے تاریخی ادوار میں بھی لوگوں کے عام مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی عارضی حکومت تک نہ تھی۔ اور اسی طرح تاریخی ازمنہ میں بھی لوگوں نے کسی قسم کی حکومت بنانے کا کوئی ایسا کارنامہ سرانجام نہیں دیا یا کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ لوگوں نے حکومت بنائی ہو۔ اسی طرح اکثریت نے بھی مادہ ء بربریت کا منظر پیش کیا ہے۔ جس میں عوامی آدمی کی رائے شامل نہیں ہوتی ہے۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ کہ عوام کسی حد بندی کے آپس میں پیار و محبت، خوشی و مسرت، اور بے حد محبت کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف فہم و فراست کا شائبہ نہیں ہوتا۔ جیسے معجزے چھومنتر کرنے کے بغیر نہیں ہوتے لیکن بڑے بڑے معروف عصروں میں بنی نوع کا ذی روح ہونا صرف فہم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ حکومت کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ متوسط زمانہ میں اگر اس کے دوسری جانب دیکھا جائے۔ تو ہمیں ایک عہد میں اس موجودہ عہد کی حکومت ہی دکھائی دیتی ہے۔ جس کا کوئی حاکم ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ دنیا کے بہت سارے حقوق پر قبضہ کیے ہوتا ہے۔ تو اس پر بھی اس کی حکومت ہوتی ہے۔ مثلاً" روم ایک عظیم حاکم اور عظیم ہدایت کار تھا یہ وہی "روم" ہے۔ جو بحیرہ روم کے آس پاس کے علاقوں اور سرحدوں پر حکمرانی کرتا تھا۔

جنگِ عظیم اول کے بعد کے وقتوں میں لفظ یورپ دنیا میں متعارف ہوا۔ کہ یہی دنیا میں حکومت کرتا ہے۔ ہم نے اس لفظ کی پوری کشش پر غور و خوض کر کے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟ تو پتہ چلتا ہے کہ ایک طاقت نے دوسری طاقت کو ہٹا کر خود قبضہ کر کے حکومت کرنے کا اعلان کرتی ہے۔ کہ اس نے کس سمت اپنا سفر شروع کیا ہے۔ وہ کون ہے جو درحقیقت یورپ میں حکومت کرنے کے لیے کامیاب ہو گا؟ اور کیا یہ ممکن ہے یا یقین ہے کہ کوئی ایک یورپ کی حکومت کو دنیا میں کامیاب کرائے گا؟ اگر کوئی حکومت نہیں بنائے گا۔ تو پھر کیا وقوع پذیر ہو گا؟ بلاشبہ اس سے کوئی خاص وقت، کوئی کھری صداقت اور بے حد کشادہ دنیا وجود میں آئے گی۔ چنانچہ آج کل اس دنیا میں جو واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ یہ اپنے اپنے شعور کے ساتھ وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ اس لیے اس ستم ظریفی پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہم اس کے باعث کی حقیقت کو براہ راست جاننے کے قابل نہیں ہیں۔ اور نہ ہم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ ہمارے لیے اس میں رکھا ہی کیا ہے۔ لیکن اگر ہم حقیقت کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اور جو اس کا نقشہ بنے گا وہ آنے والے کل یعنی کچھ عرصہ بعد ایک فیشن کی صورت اختیار کر جائے گا۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ قیاس اور تصورات کو ترتیب دینے کے لیے ایک چوکھٹا بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ہم ایک جگہ کا تعین کرنے کے بعد ہم اصل حقیقت کی صداقت کو پالینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس بصارت کے عمل میں سائنسی طریقہ، کارفرما ہوتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! ابھی ہمیں اس کی عقل اور فہم و فراست کو بھی پرکھنا ہے۔ کہ یہاں اس نے کس قدر مستعدی سے استفادہ کیا ہے۔ اور جب ہم اپنے دوست کو باغ کے راستہ سے آتے دیکھتے ہیں۔ تو پکار اٹھتے ہیں "یہ پیڑ آ رہا ہے" اس طرح ہم جان بوجھ کے ایک غلط جملہ طنزاً" بولتے ہیں۔ کہ یہ "پیڑ" اس پیڑ کے جسمانی خدوخال (ساخت) اخلاقی طور اطوار اور چال چلن کے پوشیدہ مسائل کی حقیقت پر

دلالت کرتا ہے۔ یعنی کریکٹر پر صادر آتا ہے (یعنی "پیٹر" اور "پیٹر اعظم") حالانکہ ہمارا دوست پیٹر کی حقیقت کا اظہار "پیٹر اعظم" سے نہیں ہوتا ہے۔ بیشک حقیقتاً" ہمارا دوست "پیٹر" اور "پیٹر اعظم" متشابہ ہیں۔ مگر ہمارا دوست پیٹر فضیلت کے لحاظ سے کم تر ہے۔ ہر تصور خواہ سادہ ترین ہو خواہ انتہائی تکنیکی ہو، اپنے چوکھٹے میں فٹ بیٹھا ہوتا ہے۔ جس طرح جیومیٹری کے حساب سے کاٹ کاٹ کر یہ نگینہ سونے کی انگوٹھی کے چوکھٹے میں رکھتے ہیں۔ اور اس میں فٹ بیٹھا ہوتا ہے۔ یہ متشابہ تصور ہمیں سنجیدگی سے بتاتا ہے کہ یہ چیز "الف" اور وہ چیز "ب" ہے۔ لیکن ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے۔ کہ وہ شخص جو بڑا سنجیدہ ہے۔ وہ تم سے مذاق کر رہا ہے۔ اس طرح یہ آدمی اس سنجیدہ آدمی کے مذاق اور قہقہوں کو اپنے اندر جذب کر رہا ہوتا ہے۔ اور اگر وہ آدمی قہقہہ نہ لگائے۔ اور اپنے ہونٹ سختی سے بند رکھے۔تو اس کے چہرے کا انداز اور کیفیت بدل جائے گی۔ یہ آدمی اچھی طرح جانتا ہے۔کہ یہ چیز صرف "الف" کی نہیں ہے۔ یا وہ چیز صرف "ب" کی نہیں ہے۔ دراصل یہ اس کی سوچ کا خیال ہے۔ جو لفظ ادا کرنے والے سے مختلف سوچتا ہے۔ اور اسی قسم کی ستم ظریفی اس کے نہاں خانے میں بھی پائی جاتی ہے۔ یا پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ دراصل وہ جو سوچ رہی ہوتی ہے وہ یہ ہے میں اسے جانتا ہوں اور میں یہ دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ "الف" نہیں ہے اور وہ چیز "ب" بھی نہیں ہے۔ لیکن "الف" اور "ب" کا اتصال دونوں کا ادراک رکھتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ وہ خود کی عقل کا ادراک رکھتے۔ ہیں کہ میں دونوں کی طرف اپنے رویہ کے مقصد کی خاطر ان کی طرف دیکھتا ہوں۔ میرے اس استدلالی علم نے ایک یونانی کو ناراض کر دیا ہوگا کیونکہ یونانی کو یقین ہوتا ہے کہ وہ تصور کے سبب کسی حقیقت کو اپنے اندر کی حقیقت سے آشکارا کر لیتا ہے۔ اس کے اس خیال سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تصوراتی خیال اس کے اپنے گھر کے برتنوں کی طرح ہوتے ہیں۔ جن کی اسے ہر وقت ضرورت ہوتی ہے اور ہر وقت استعمال کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ وہ اس کی لامحدود اور مشکل حقیقت کی حقیقی زندگانی کو آشکارا کرے۔ زندگی ایک مسلسل جدوجہد کے عمل کا نام ہوتی ہے۔ جو اس کے اندر کے جذبوں میں جذب پذیر ہوتی ہے اور جس کو اس نے ہر حال میں بحال رکھنا ہوتا ہے۔ نظریات اور تصورات ایک منصوبہ کی جنگی حکمت عملی ہوتے ہیں۔ جس کو ہم اپنے جوابی حملہ کی صورت میں اپنے اندر مقید رکھتے ہیں اس طرح ہم نظریہ کے حقیقی چوکھٹے میں داخل ہو کر معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ تو ایک طرف اپنے خود کے بارے میں کچھ واضح نہیں کرتی لیکن ہم پر صرف اپنا لب لباب آشکار کرتی ہے کہ حقیقت اس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرے یا وہ کسی دوسرے کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اس لحاظ سے اس کا قناعتی مواد ہمیشہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے جو مستعد یا غیر مستعد سرگرمی کو ممکن کا لباس پہناتا ہے جسے لمحہ موجود تک اس نے برقرار رکھا نہیں ہوتا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں یا مجھ سے قبل جو جانتے نہیں ہیں اس کو اطلاع ہو کہ قناعت کے فلسفہ مستعدی کو سب سے پہلے "کانت" نے شروع کیا تھا۔ چنانچہ اس کی روشنی میں ہم ماضی کے اس فلسفہ کی تمام ترتیب اور طریق عمل کو "کانت" (Kant) کے فلسفہ تک کھنگال چکے ہیں۔ اس پر ہمیں معلوم ہوا کہ تلچھٹ کی بنیاد تمام فلاسفروں نے

میری قناعت کی بنیاد کو ہی قرار دیا ہے۔ (یعنی میری تلچھٹ کی بنیاد کو ہی اصل حقیقت قرار دیا ہے) جی ہاں! ہر فلسفی نے میری اس حقیقت کے سوا اور کچھ بھی واضع نہیں کیا ہے کہ سرپوش اس کی سطح جسم پر تو نظر آتی ہے۔ اس کے اندر کے فلسفہ کی گہرائی اور گیرائی کی حقیقت کو آشکار نہیں کرتی ہے۔

لیکن اب جو میں ایک بے اعتدالی کا تعارف کرانا چاہتا ہوں کہ فلسفیانہ مسائل بالکل خارجی ہوتے ہیں کہ دنیائے تاریخی میں ایک حقیقی واقع پیش آنے والا ہے جو صرف اور صرف یہ ہے کہ یورپ دنیا میں گذشتہ تین صدیوں سے حکومت کر رہا ہے اور اب اسے یقین ہو گیا ہے کہ وہ تادیر حکومت کرتا رہے گا۔ اگر اسی فارمولہ میں تھوڑی سی کمی کر دی جائے تو اس وقت کی تاریخ بیشک و شبہ ہو جاتی ہے یعنی اس پر شک کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ اس میں مثالی حد تک مبالغہ آمیزی شامل کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے ایک بار پھر سوچنا پڑا کہ میں کیا چاہتا ہوں اور کیا نہیں چاہتا کہ اس مبالغہ آمیزی میں آمیزش کی جائے۔ اگر میں مبالغہ آمیزی کو ترجیح نہ دوں تو پھر مجھے خاموش رہنا چاہیے یا پھر اپنے ذہن کو بے حس (لقوہ زدہ) کر دینا چاہیے یا پھر کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ میں "احمق" ہو جاؤں۔

اس حقیقت کے انکشاف پر مجھے یقین ہو گیا ہے کچھ اس قسم کا تاریخی منظر اس دنیا میں وقوع پذیر ہو رہا ہے ۔ اور اس احمقوں کی جنت سے جو کچھ بچا وہ اس کے انجام، صورت حال، علامت اور یا "ہونے کے لائق" یعنی پہلی شرط کے انجام پذیری کے لائق ہونے کے وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ یعنی میں نہیں کہتا بلکہ امرواقع یہ ہے کہ اس وقت یورپ کو شدید خطرے کا سامنا ہے اور اس اندیشے میں غرق کہ وہ حکومت کرے نہ کرے یا آئندہ حکومت کرے یا نہ کرے اس کے مشابہ ارضی خطوں کے دوسرے علاقوں کے عوام الناس کی ذہنی کیفیت کچھ اس سے ملتی جلتی ہے یا یہ شک و شبہ کہ تاریخ کے اس عہد میں اس پر کوئی دوسری غیر مرئی قوت حکومت کر رہی ہے یا پھر واقعتاً" کوئی اور اس پر حکومت کر رہا ہے یا پھر میرے اس خیال پر بھی یہ یقین نہیں کرتا۔

میں گزشتہ کئی سال سے زوال یورپ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سن رہا ہوں۔ مگر میں عوام سے یہی کہتا ہوں کہ اتنی سادہ دلی سے نہ سوچیں جس طرح "سپینگلر" نے یورپ کے زوال کے بعد میں سوچا یا جس طرح مغرب کے زوال کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس کی اس موضوع پر شائع ہونے والی کتاب سے پہلے عوام نے اس موضوع پر طرح طرح کی باتیں کی ہیں اور جب کہ سب کو معلوم ہے کہ اس کتاب کی کامیابی اس حقیقت کی وجہ سے ہو گی کہ لوگوں کے ذہنوں میں اس کتاب اور خیالات کے بارے میں شکوک و شبات اور چال چلن کے غیر جنس کے اسباب ان کے ذہنوں میں پہلے سے موجود ہیں۔

یورپ کے زوال کے بارے میں اسقدر بحثیں اور باتیں ہوئی ہیں کہ رہے نام اللہ کا۔ اب تو عوام نے اس کو حقیقت سمجھ لیا ہے۔ لوگوں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ انھوں نے اس حقیقت

پر سنجیدگی سے اعتماد کر لیا ہے اور اب تو اس کے حق میں دلائل بھی دینے شروع کر دیئے ہیں۔ اگرچہ وہ ایمانداری سے یہ بھی کہتے پھر رہے ہیں کہ "پتہ نہیں وہ کیوں اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ اور پتہ نہیں وہ کیوں اس حقیقت کو ماضی کی تاریخ میں کسی مناسب وقت اور مقام کا تعین نہیں کر پاتے"۔ حال ہی میں "والدو فرینک " (Waldo Frank) کی کتاب بعنوان امریکا کی دوبارہ دریافت (Re Discovery of America) جو صرف اس مفروضہ کی بنیاد پر تکیہ کرتی ہے کہ یورپ آخری سانس کی ہچکیاں لے رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود فرینک (Frank) اس پر بحث نہ تجزیہ کرتا ہے اور نہ ہی اس کی قطعی حقیقت کے بارے میں کوئی سوال داغتا ہے جو یقیناً" اس کتاب کا مقدمہ خوفناک حد تک قلمبند کیا جانا ضروری تھا۔ وہ کسی تحقیق اور مزید تفتیش کے بغیر اپنی بات یوں شروع کرتا ہے جیسے اس کی کوئی چیز تردید کے قابل نہیں ہے۔ وہ اس نے کتاب کے شروع میں بڑی بے تکلفی اور بھولے پن سے میرے سوچنے کو ممکن بنا دیا ہے کہ فرینک (Frank) یورپ کے زوال کا قائل ہی نہیں ہے یا وہ اس گناہ کے احساس سے کہیں دور کسی اور چوکھٹے پر بیٹھا کتاب لکھ رہا ہے۔ اس نے کبھی خود کوئی مسئلہ اٹھایا اور نہ کبھی کوئی سوال پوچھنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ اس نے اس غیر معمولی سوال کو بس گرام گاڑی میں کوئلہ لادنے کے سوا کچھ نہیں کیا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ پامال مضامین پر گفتگو کرنے کے لیے شعوری انتقال مقام کے لیے بڑی گرام گاڑیاں ہوتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ جو اس نے کیا ہے ویسا ہی دوسروں نے اس کے ساتھ سلوک کیا ہے۔ بالآخر اس کا کام قوموں نے خود پایہء تکمیل تک پہنچایا ہے۔ بلکہ تمام اقوام نے اپنے اپنے حصے کا کام خود سرانجام دیا ہے۔

آج کے اس تلاطم خیز عہد میں دنیا بمقابلہ جنت کا منظر پیش کر رہی ہے۔ وہ یوں کہ اگر کسی نے سکول میں یہ افواہ پھیلا دی کہ ماسٹر نے سکول میں طلبہ کو پڑھانا چھوڑ دیا ہے نوجوان طلبہ کا ایک جم غفیر وحشیانہ طور پر اپنے اپنے جوتوں کی ایڑیوں کو سڑک پر مارتے، توڑ پھوڑ کرتے ہوئے پورے سکول اور شہری نظام کا ماحول اور نظم و نسق خاکستر کر دیتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا ہوا کہ ماسٹر نے پڑھانا چھوڑ دیا ہے اور اب ہم آزاد ہوگئے ہیں۔ اور استاد کی وجہ سے ان کے ذہنوں پر جو بوجھ تھا وہ اتر چکا ہے۔ یہ طلبہ کلاس میں ماسٹر کی حکومت کا جوا اتار پھینکتے ہیں اور پھنے خاں بنے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہیں۔ لیکن جوں ہی وہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہونے کے منصوبہ کو ملتوی ہوتا دیکھتے ہیں تو پھر کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ ان کی رسمی مدفضیلت نہیں ہے۔ اوران کا مقصد ایک تسلسل اور ایک مقصد کے تحت پیروی کرنا نہیں ہوتا کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک وقت میں ایک کام کریں گے کہ وہ سر کے بل تو کھڑے ہو سکتے ہیں۔ آج کی موجودہ نسل کے ایسے مظاہرے اور غیر سنجیدہ تماشے کرنا یقیناً" قابل مذمت ہے کیونکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج کا یورپ زوال پذیری کی طرف لڑھک رہا ہے اور اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر ایرا غیرا نتھو خیرا اور بے فکری نسل نقل کرنے کی عادی ہو چکی ہے۔ سر کے بل کھڑا ہونا منظور مگر کلاس میں بیٹھ کر پڑھنا نہیں چاہتے اکڑ خاں اور بانکے بنے پھرتے ہیں۔ لڑکیوں پر آوازیں کستے ہیں "ہم

بھی ہو گئے جوان" کے گانے گاتے ہیں۔ یہ ہے وہ نسل جو اپنے مستقبل کی خود حکمران ہے۔ چنانچہ قوم پروری کا یہ منظر جو ہمارے نظریے کی دلالت کرتا ہے کہ یورپ زوال پذیری کے اندھے کنویں میں سرک رہا ہے بلکہ میرے نظریے کے مطابق ہر جگہ مناسبت رکھتا ہے۔

گزشتہ ابواب میں میں نے اس نیا آدمی کی درجہ بندی کرنے کی کوشش کی تھی کہ آج کل یہ آدمی دنیا میں اہمیت اور فوقیت رکھتا ہے۔ میرے اس عوامی آدمی اور نیا آدمی کی یہ خوبی اچھی لگتی ہے کہ اس کے احساسات عام قسم کے ہوتے ہیں اور یہ نیا آدمی بھرے بازار میں منادی کرتا ہے کہ یہ بھی اس کا حق ہے اور وہ اپنے ہر اعلیٰ اور برتر کے احکامات ماننے سے انکاری ہے۔ یہ اس کا فطری عمل ہے۔ اگر اس آدمی کی یہ ذہنیت دوسرے لوگوں سے قوی ہو تو یہ ایک ناٹک ہے۔ اور اپچک دانہ اور پچک دانہ کا کھیل ہوتا اور جب ہم ایسی قوموں کے کسی ایک گروپ کو مانتے ہیں تو عوام الناس ان عظیم تخلیق کاروں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیتے ہیں۔ یہ ان عظیم انسانوں کی ایک بڑی اقلیت ہے جنھوں نے تاریخ کو بنانے سنوارنے اور منظم کرنے میں نہایت ہی اہم کام سر انجام دیئے ہیں۔ لیکن زمانہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ہر چھوٹی بڑی جمہوریہ اپنے اپنے کونوں کھدروں میں دبکے اور سر کے بل کھڑی مرجھائی ہوئی قوموں کی طرح یورپ کی سرزنش کرنا شروع کر دی ہے اور یہ اعلان کرتی ہے کہ اس نے اپنے مقام و مرتبہ عالمگیر تاریخ میں کہیں گم کر دیا ہے۔

نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ وہ یورپ جو معیار قائم کرنے کے ایک نظام کا خالق ہے۔ جس کے مجرب اور شاندار پیداواری صلاحیتوں کا اعتراف اور ثبوت صدیوں نے ثابت کیئے ہیں۔ اس یورپ کے یہ معیار کوئی بہترین معیار کہیں دور جاکر رہنے لگے ہیں۔ ہرچند یہ کہ وہ موجود ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی صورت میں ایک دوسرے کے معیاروں کی حدبندی کی ہوئی ہے۔ یہ معیار اس وقت تک زندہ و قائم رہتے ہیں جب تک دوسرا نیا معیار قائم نہیں کیا جاتا یا کوئی بہتر معیار کے قائم ہونے کی کوئی صورت نظر آتی ہو اور یا پہلے معیاروں کے ریکارڈ کو توڑ کر کوئی نیا ریکارڈ کرنا اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ دوسرے اعلیٰ معیاروں اور قدروں کو تخلیق کیا جائے۔ اب عوام الناس کے قائم کیے ہوئے معیاروں کا جنازہ نکل چکا ہے کیونکہ اس کے اب کے معیاروں کے نظم و نسق اور قدروں کی پیروی پر پوری یورپی تہذیب عمل پیرا ہے۔ آپ یوں سمجھیں کہ اب کے بار یورپ نے دوسرے معیاروں کو قائم کرنے اور خلق کرنے کے ناقابل ہونے کا آغاز کر دیا ہے۔ اس کو کچھ سجھائی نہیں دیتا وہ کریں تو کیا کریں اور کیا نہ کریں اور اپنے پاؤں کی ایڑھیوں سے زور زور سے ٹھوکریں ماریں کہ نہ ماریں اور سر کے بل کھڑے ہونے کے قابل ہیں یا نہیں۔ یہ ہمارے سوال کے پہلے نتیجہ کااعلان کیا جاتا ہے جو کسی نو آمدہ معیار کی پیروی کرنے کے لیے خوش آمدید کہتا ہے۔ جو کسی پہلے معیار کی حکومت کو ختم کر کے نیا معیار کے تحت حکومت کرنا چاہتا ہے جبکہ دوسرے باقی ماندہ معیار تو آمادہ ء بغاوت نظر آتے ہیں کیونکہ ان کو ایسا نہ کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا اور نہ ان کو اپنی زندگی کے کسی دوسرے اعلیٰ مقصد کی خاطر کوئی نیا پروگرام شروع کرنے کی راہ سجھائی دیتی ہے۔

میری اس کہانی میں ایک خانہ بدوش ایک بات کا اعتراف کر لیتا ہے لیکن پھر پادری صاحب جی اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم قانون الہیہ کے احکامات (فرمودات) جانتے ہو۔ جس کے جواب میں خانہ بدوش کہتا ہے کہ جی حضور کہ یوں: میں انھیں جاننے اور معلوم کرنے گھر سے ضرور باہر آیا مگر میں نے اس کے احکامات کو سنی ان سنی کر کے ان سے علیحدہ ہو گیا ہوں۔

پھر وہی سوال دہراتا ہوں کہ کیا دنیا میں اس وقت ایسی صورت حال موجود نہیں ہے؟ جبکہ تصدیق شدہ افواہ بازاروں میں سرگرم عمل ہے کہ یورپی قوانین کے احکامات اب بالکل نافذالعمل نہیں ہیں اور اس منظر کا نظارہ کرنے سے یہاں کے نئے آدمیوں اور عوام نے اس وقت کی رعنائی سے لطف اندوز ہونے کا موقع ہاتھ سے کھو دیا ہے اور منادی کرتے پھرتے ہیں کہ اس کے بغیر زندگانی کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ کیونکہ یورپی عوام الناس میں جن کا وجود موجود تھا اور ہے۔ جو لمحہ موجود میں زندگانی کرنا چاہتے اور زندگی سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ ماضی میں کن نئے معیاروں نے نمو پائی اور پرانے رخصت ہوئے یا یہ کہ پرانوں میں ایک تازہ اور نئی تندیء باد مخالف اس کی جو انسانی طاقت کو جذب پذیری کے عمل سے گزار رہی ہے یا پرانے اور قدیم کے جوش و جذبہ اور ولولہ کے درجہء حرارت کو ہلکا کر رہا ہے۔ اس کے سوچنے کے یہ سارے اندازے اور عمل عین فطرتی عمل قرار پاتے ہیں۔ مزید برآں آج کے بوڑھے (بزرگ عمر) کو اس لیے بوڑھا یا پرانا نہیں کہتا کہ یہ خود اس پیرانہ سالی میں غرق ہو چکا ہے یا یوں کہیں کہ زوال پذیری کے عمل میں غوطہ زن ہے بلکہ اس لیے کہ اس نے پہلے بزرگ کے خلاف ایک نیا اصول کی ایک نئی حقیقت کا سراغ پا لیا ہے جو پہلے سے موجود بڑھاپے کی نذر و نیاز کرتا ہے۔ اگر ہمارے ہاں بچے پیدا نہ ہوں تو کیا ہمیں بوڑھا ہونا چاہیے یا بوڑھا ہونے میں کچھ دیر لگانی چاہیے۔ بالکل اسی کی مانند آج کی مشینوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ایک دس سالہ پرانی موٹر کار اس بیس سالہ ریل انجن سے زیادہ پرانی نظر آتی ہے۔ یہ سیدھی اور آسان بات ہے کہ موٹرکار کی پیداوار یعنی طرح طرح کی ایجادات میں یکے بعد دیگرے زیادہ برق رفتاری سے کام ہو رہا ہے۔ اس طرح اس کو زوال پذیری کا عمل ہی کہیں گے۔ اسی طرح یہ جواں سالی اور نوخیز نوجوانوں کی طاقت کے سرچشمہ کے ساتھ عمل وقوع پذیر ہے جو ایک صحت بخش علامت ہے۔

لیکن برخلاف اس کے اس وقت جو کچھ یورپ میں ہو رہا ہے وہ غیر صحت مندانہ اور غیر معمولی ہو رہا ہے۔ یورپی احکامات نے اپنی طاقت کو خود میں گم کر دیا ہے تاہم ہمیں اس کے کسی دوسرے افق کا واضح اشارہ نہیں ملتا ہے۔ ہمیں تو یہ بتایا جاتا ہے کہ یورپ اپنی حکومت خود ختم کر رہا ہے اور کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کے مقام و مرتبہ پر کون قبضہ کرتا ہے۔ کیونکہ یہاں یورپ سے ہماری مراد یہ ہے کہ فرانس، انگلستان اور جرمنی کلیسا کے عقیدہ تثلیث کے مطابق یہی تین اس کے بنیادی اور اصلی وارث ہیں اور حقیقی طور پر اس کی پیروی کرتے ہیں اور انھی نے اس ارضی خطے کے ایک بڑے اور کشادہ حصہ پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ اور ان کے عوام الناس کی بلوغت ان کے اسی عقیدے کے مطابق اسی دنیا میں منظم ہو کر زندگانی کر رہے ہیں اور جیسا کہ ابھی ابھی اعلان ہوا ہے کہ ان تین،

بڑے ملکوں کے باشندے زوال پذیری کی راہ پر گامزن ہو چکے ہیں اور ان کے ترتیب اور منظم کیے ہوئے زندگی کے پروگراموں (نصب العین) نے ازخود اپنی قدر و منزلت کھو دی ہے۔ تو پھر یہ عجب نہیں ہے کہ یہ پوری دنیا واقعی اخلاقی پستی کے اندھے کنویں میں گر چکی ہے۔ آج کی دنیا میں یہ ایک کھری سچائی ابھر کر سامنے آئی ہے کہ اقوام عالم کے عوام الناس کے اخلاق پست ہو چکے ہیں اور بوجوہ ان اخلاق کی تنزلی کے دوران کی ہنگامہ آرائی ان لوگوں کو اچھی لگتی ہے۔ اور ان کے لیے ایک مبہم فریب نظر کا باعث ہو گئی ہے۔ چھوٹے موٹے عہدوں پر فائز لوگ سوچتے ہیں کہ چلو اچھا ہوا کہ یہ بوجھ بھی ان کے کندھوں سے اتار دیا گیا ہے۔ دس احکامات جو شریعت موسوی (ع ص) کی بنیاد ہیں جو قیمتی پتھروں اور کانسی کے مجسموں پر کنداں کیے جاتے تھے ان کے بوجھ کو بھی ان کے عوام نے اپنے کندھوں سے اتار پھینکا ہے۔ لسانیات کے حکام بالا نے پیغام بھیجا ہے کہ اس کے بوجھ کو اتار کر اسے کسی دوسرے ہاتھوں کی نذر کردو۔ یہ وہ حاکم ہیں جو صرف یہ حکم سناتے ہیں کہ یہ بندوق خانہ بننے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہو سکتے۔ عالمگیر جہاں کے نچلی سطح میں مقید صف بندی کرنے والے حاکم اپنے حکم کا نفاذ کرنے والے حکومت کرنے والوں کے ہاتھوں تنگ آچکے ہیں۔ اب یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان پر حکمرانی کرے اور ہوائی تعطل کا شکار کے عہد کے بوجھ تلے سے آزاد ہو چکے ہیں جو واقعی ان کے لیے لازم و ملزوم تھا۔ لیکن یہ تعطیل یا تعطل دیرپا نہیں ہوتا۔ موسوی احکامات کی غیر موجودگی نے ہمیں ایک خاص فیشن میں زندگی گزارنے کے کس کس کے آوازے لگاتا ہے اور ہمیں مجبور کر دیتا ہے۔ اب ہماری زندگی ایک "بے روزگار" کی طرح ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ یہ ایک خوفناک روحانی صورت حال آشکارہ ہو چکی ہے کہ جس میں دنیا کی بہترین نسل آج کے تضادات میں گم ہو چکی ہے۔ یہ نسل خود کو بالکل آزاد سمجھتی ہے۔ پابندیوں سے آزاد یہ نسل خود محسوس کرتی ہے کہ وہ تہی دامن ہیں اور بالکل خالی خولی۔ ایک "بے روزگار" زندگانی سے بہت دور اور موت کے بالکل قریب ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ زندگی میں کوئی خاص ڈھب کا کام کرنا چاہتا ہے اور اپنے مشن میں کامیاب ہونا چاہتا ہے۔ حفظ مقدم کے طور پر زندگی میں ہم جن کاموں سے گریز کرتے ہیں اسی طرح کی زندگی اگر ہم گزار نہیں سکتے تو ہم واقعی تہی دامن ہو کر رہ جائیں گے۔ زیادہ دیر نہیں ہوئی کہ دنیا میں ایک خوفناک چیخ ہمیں سنائی دی ہے کہ ستاروں پر کمند ڈالنے کے لیے کتوں کو بھیجا جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص یا چیز سے استفسار کیا جائے کہ میاں تم ہی حکومت کرو اور تم ہی اپنے پیشہ کے بارے میں اپنے احکامات کا نفاذ کرو جو ایک احسن اقدام متصور ہو گا۔ ان احکامات کا اطلاق ان لوگوں ر نوجوانوں پر ہوتا ہے جو بچگانہ لاپروائی اور غفلت کے ملے جلے رجحانات کی روشنی میں اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ اب یورپ کی حکومت نہیں ہے۔ لوگوں کی کمان سے ہماری مراد یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ کیا جانا چاہیے کیونکہ یہ اپنے مقدر کے خود سکندر ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہ آوارہ منش، بے پرواہ اور لڑکیوں پر آوازیں کسنے والوں کو سختی سے روکتے ہیں۔ بے مقصد زندگانی اور شکستہ دلی سے زندگی گزارنے والوں کو منع کرتے ہیں۔

اگر یورپ کی کمان کو ختم کر دیا جاتا ہے تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا بشرطیکہ اس

کی موجودگی میں اس سے بہتر کوئی دوسرا حکمران اس کی جگہ لایا جائے۔ لیکن اس بہتر "حکمران" کا دور دور تک نشان نہیں ملتا۔ یورپ کے مقابلے میں ماسکو اور نیویارک کوئی اس سے بہتر چیز اور نئی چیز پیش نہیں کرتے۔ یہ دونوں جہاں یورپی نظام کی نقل بمطابق اصل ہیں بہر حال یہ دونوں دنیا کے باقی ماندہ نظام سے علیحدگی اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے خود کے نظام نے ان کی شکل و صورت کو کہیں اور گم کر دیا ہے۔ سنجیدگی اور صداقت سے کہتا ہوں کہ ہر کوئی نیویارک اور ماسکو کے بارے میں گفتگو کرنے سے خوف کھاتا ہے۔ ان کی حقیقت کیا ہے اور وہ کیا چیز ہیں کوئی نہیں جانتا۔ بس ہر کوئی اتنا ضرور جانتا ہے کہ طاقت ور دنیا نے ان دونوں کے بارے میں ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ ہر کوئی اتنا ضرور جانتا ہے کہ وہ ان دونوں کے بارے میں مکمل طور پر باخبر نہیں ہے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ صرف ان کا ہم جنس ہونے کے باعث ان کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے اور ان کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ ان دونوں کا کیا کیریکٹر ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے ناں کہ یہ بھی "قدرت کی تاریخ کے ہم رنگ زمین کے دام کے غلام ہیں۔" ان دونوں کی حقیقت کی قلعی کو مظہر قدرت نے آشکارہ کر دیا ہے جس کو ہم صاف دیکھتے ہیں کہ انھوں نے بھی حقیقت سے کنارہ کشی کرلی ہے اس لیے یہ ہمیں جو دکھائی دیتے ہیں یہ حقیقت میں وہ نہیں ہیں۔ یہ اپنے لباس کو بدلنے کی بجائے انھوں نے اپنے اپنے مواد کو ڈھانپ لیا ہے۔ چنانچہ ان دونوں کے عوام کی اکثریت کو دھوکا دیا جاتا ہے۔ دغا بازی سے وہی گریز کرتا ہے جسے پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمومی طور پر جانتا ہے کہ دھوکا دہی کی جگہ کوئی ہم رنگ چیز موجود ہے۔ یہ اسی طرح کی کہاوت ہے کہ زندگانی ایک سراب ہوتی ہے۔ مظہر قدرت ہمارے خیالوں اور بصارت کو درست کرتا ہے اور جلا بخشتا ہے۔

تاریخ کے تمام ہم رنگ زمینی نمونہ میں ہم نے دو انتہائی حقیقتوں کا نفاذ کیا ہے جو یہ ہیں:اول مستند اور دوم معقول۔ اور یہ دونوں ہمارے اندر چھپی بیٹھی ہیں۔ اس کے علاوہ عیاں اور حادثاتی ارضی صداقتیں ہوتی ہیں۔ جس طرح ماسکو میں یورپی نظریات کا نفاذ۔ مثال کے طور پر نظریہ مارکسزم کو یورپ میں تخلیق کیا جاتا ہے جس میں یورپی حقیقتوں اور مسائل کو آشکار کیا گیا ہے۔ اس خصوصی نظریے کے پس پردہ ہی عوام الناس ہوتے ہیں اور وہ بھی یورپی عوام کی طرح فرقہ واریت کے لحاظ سے امتیازی نشان نہیں رکھتے۔ لیکن اس سے زیادہ اہمیت کے عوام ہیں کہ ان کی عمریں ہم سے بہت مختلف اور کم ہیں - اور یہ لوگ ایسے ہیں جو ابھی تک اپنے ضمیر کو تڑکا لگانے کے عمل سے گزر رہے ہیں۔اس تڑکا لگانے سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ دونوں ابھی تک "بچہ لوگ" ہیں۔ اس مارکسزم کو روس میں کامیاب ہوجانا چاہیے جہاں پر کوئی زیادہ صنعت موجود نہیں ہے۔ اس کو صرف اس کے تضادات کو برداشت کرنے کے لیے "شیر" بننا پڑے گا۔ لیکن جہاں ایسا تضاد موجود نہ ہو تو وہاں پر کوئی خاص کامیابی نہیں ہوتی۔ سوویت یونین (اب مرحوم) کم یا زیادہ مارکسی ہے۔ جیسے جرمن مقدس رومی سلطنت میں صرف جرمن ہوتا تھا۔ کیونکہ نئے لوگوں کے کوئی نظریات نہیں ہوتے۔جب نیا نظریہ رکھنے والے لوگ کسی دوسرے ماحول میں شامل ہوتے ہیں جہاں پرانی تہذیب موجود ہوتی ہے یا پرانی تہذیب رہی ہو تو یہ

نیا آدمی وہاں پر اپنا نظریاتی لباس (بھیس) تبدیل کر لیتا ہے اور انکی تہذیب میں جذب ہو جاتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی خدا کی قدرت کارفرما ہوتی ہے۔ اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ جیسا کہ میں نے کسی دوسرے مقام پر کہا تھا کہ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ عوام کے ارتقاء کی بے شمار اقسام ہوتی ہیں۔ یہ لوگ ایسی "دنیا" میں پیدا ہوتے ہیں جو بے شمار تہذیبوں کو اپنے میں جذب کر لیتی ہے۔ جیسے مصری اور چینی تہذیبیں ہوتی تھیں اور ہیں۔ ایسی تہذیب کے عوام میں ایک چیز آٹو چھتھونس (Auto chthonous) موجود ہوتی ہے جو انسان کی اندرونی سرگرمیوں اور عمل کو براہ راست استعمال کرنے اور نظر رکھنے کا کشف رکھتی ہے۔ لیکن بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اسی تہذیب میں نمو پاتے ہیں اور وہاں کی تاریخ کی تہذیبی قدروں کی جلو میں جواں ہوتے ہیں اسی طرح جو بحیرہ روم کی ریاستوں میں نمو پاتا ہے، جوان ہوتا ہے وہ اسی بحری پانیوں کے یونانی۔ مشرقی حمل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ثقافت میں جنم لیتا ہے۔ اسی لیے نصف رومی عوام کے جسموں کی ساختیاتی انداز ان کی اپنی نہیں ہوتی اور مختلف ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی تربیت کی گئی ہے۔ ان لوگوں کی تہذیب کو مستند قرار دیا گیا ہے۔ جس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ اس کے حقیقی خد و خال، غیر متوازی اور افقی ہوتے ہیں اور ان میں رہبری کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ اور وہ آدمی جس نے بچپن سے سیکھا ہوتا ہے وہ غیر ملکی الفاظ استعمال کرتا ہے جس نے اپنی تہہ میں وہ مستعدی انداز چھپایا ہوتا ہے جو اصلی ہوتا ہے وہ غیر ملکی زبانوں کی اصطلاحوں کا ترجمہ اپنی زبان میں کرتا ہے۔ ہم رنگیء زمیں میں افقی یا عمودی حالت کے جھکاؤ پر ایک اچٹتی نظر ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ موجود لغت کے ترجمہ پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوا کہ نقل بمطابق اصل ہے۔ میں اس کتاب کی اشاعت کا انتظار کر رہا ہوں جو سٹالن کے مارکسزم کا روسی ترجمہ روسی تاریخ میں آشکارا کریں گے۔ کیونکہ وہ سب کچھ مواد اس کتاب میں موجود ہے مارکسی سٹالن کی روس میں طاقت ہے اور یہ کس قسم کی روسی طاقت ہے اور مارکسزم کا اس کے پاس کتنا حصہ موجود ہے۔

نیکی جانتی ہے وہ کس طرح کی ہو گی۔ وہ جیسی بھی ہو لیکن میں ایک بات دعوے سے کہتا ہوں کہ روس کو دنیا میں حکومت کرنے میں صدیاں گزر جائیں گی۔ کیونکہ اس میں ابھی تک موسوی شریعت کے دس احکامات کی شدید کمی ہے۔ نیز وہ اب بھی یورپی مارکسزم کے اصولوں کا احسان مند ہے لیکن وفاداری ظاہر کرنے میں بھی حیلہ سازیاں کرتی ہے بہر حال روس کے پاس نوجوانوں کی اکثریت ہے وہ اپنی افسانوی کہانی سے ان کے دل موہ لینے کے لیے کوشش کریں گے۔ نوجوان زندہ رہنے کے لیے اسباب کو تلاش نہیں کرتے یا انھیں ضرورت ہی نہیں ہوتی ہے وہ بس عذر ڈھونڈنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اور اب خاص واقعہ نیویارک میں رونما ہوا ہے۔ اس کو دوبارہ غلطی کہنا کہ اس کی اصل قوت وہ موسوی شریعت کے دس احکامات ہیں جن کو نیویارک یہ پوچھے کہ یورپ قیادت کرنے سے مستعفی ہو رہا ہے یا کنارہ کشی اختیار کر رہا ہے؟ کیا یہ بظاہر تنزلی کا ایک مفید بحران نہیں ہوگا جو یورپ کو کھرا اور سچا ثابت کرے گا۔ یورپی قوموں کی تنزلی کے رجحان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس کی

ترجیحی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ایک دن امریکا یورپ بن جائے تو یورپ کی اکثریت (تکثیرت) اس کے رسمی اتحاد کا متبادل نہیں ہے؟ ایک سوسائٹی میں حکومت 'قیادت اور اطاعت شعاری کے عمل کا ایک فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن کون قیادت (حکومت) کرتا ہے اور کون اطاعت شعاری کرتا ہے جتنی دیر اس پر شک رہے اس وقت با قیماندہ ارکار غیر موثر ہوں گے۔ حتی کہ خاص لوگوں کو چھوڑ کر لوگوں کا ضمیر بھی درہم برہم اور ڈگمگانے اور باطل ہو جاتا ہے۔ بیچ اس صورت حال کے اگر آدمی کو تنہا چھوڑدیا جائے اور اسے کسی خاص موقع پر دوسروں کے ساتھ میل ملاپ کرنے کے لیے پھینک دیا جائے تو شائد یہ تنہا تنہا آدمی برسر اقتدار قوت کے پیدا کردہ بحران اور عمل یا اسکی حقیقت سے ٹکرائے بغیر صحیح سلامت لوٹ آئے گا۔ کیونکہ وہ نیت کے لحاظ سے صحبت پسند ہے اس لیے اس کا ذاتی کردار تغیروتبدل کے عمل سے بالکل بدل جائے گی۔ بلکہ میں تو یہ سختی سے کہتا ہوں کہ اس کے اجتماعی کردار پر فوری اثر ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو علیحدہ کر کے اس کا جائزہ لیا جائے تو شائد ممکن ہو کہ اس سے مزید تفتیش سے اور مزید وجوہات پانے کے بعد اس کے ملکی ضمیر' حکومتی ضمیر اور اطاعت شعاری اور انتظامی امور کے بارے میں خاطرخواہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اگر ایک ہسپانوی کے چال چلن کو کسوٹی پر رکھ کر دیکھا جائے تو یہ بھی دلچسپ مطالعہ ہو گا۔ تاہم اس کی سرجری (چیرپھاڑ) ناخوشگواری'مفید اور غمگین کرنے والا عمل ہوگا اس لیے میں نے اسے نظرانداز کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اس ذاتی ہمت کی پستی'بددلی اورذلتوں کے بارے میں ایک بڑی مقدار میں واضح کردیا ہے۔ جو ہمارے ملک سپین کے اس متوسط آدمی کی حقیقت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سپین ایسی قوم کا ملک ہے جو حکومت کرنے اور اطاعت شعاری کرنے کے جھوٹے خداؤں کے احساس جرم میں صدیوں سے زندہ چلا آرہا ہے۔ یہ ذلت! یہ تنزلی! اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس کو ایک معیاری اور دستوری حالت کی بے قاعدگی میں اور وہ چیزیں جو قبول کی جا چکی ہیں اور جن کو ابھی تک درست قرار نہیں دیا گیا اس آدمی کو کیسے صحتمندانہ حالت میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا؟ کیونکہ اس شخص نے از خود فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس آدمی کی کوشش ہوتی ہے کہ'اگر وہ کسی چیز کو ویسا ہی تسلیم کرے جو کہ وہ اس جرم یا بے قاعدگی کو ویسا ہی کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ میکانیہ (میکینزم) اس مثال کو واضح کرتی ہے' کہ "جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے" تاریخ میں ایسے ممالک میں ایسا دور بھی آیا ہے کہ جب ایک شخص کو اس پر حکومت نہیں کرنا چاہیئے تھی لیکن اس نے ان پر حکومت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ ہاتھ ہوا کہ اس کی کوشش کے بر خلاف ایک شخص کی اندرونی تحریک(جبلت) کو مجتمع کیا اس کا یہ فعل ایک بے قاعدہ طاقت استعمال کرنے کی ایک بے قاعدہ کوشش تھی۔ اس ملک کے لوگوں نے اس کی بے قاعدہ کوشش کو مسترد کردیااور اس طرح انھوں نے بعد میں آپس میں میل ملاپ کیا اور اپنے اخلاقی نظم و نسق کی دوبارہ دستور سازی کی لیکن ہسپانوی کے بالکل بر خلاف کام کیا کہ اس نے ایک قسم کی مقتدرہ کی مزاحمت کرنے کی انتہائی اندرونی تحریک (جبلت) کو مسترد کرنے کی بجائے اس نے اپنی ہستی کی باقی تمام ابتدائی اور غیر حقیقی تحریک کو بد دیانتی پر

ترجیح دی ہے اور جب تک ہم میں اس قسم کی جبلتوں کا قیام رہا تو ہمیں اپنی نسل سے کسی قسم کی توقع نہیں کرنا چاہیے تو ایسی صورت میں کوئی لچکدار طاقت نہیں ہو سکتی کہ ایک سوسائٹی کی تاریخ میں اور ایک واجبی حالت میں ایک مشکل کام کو کیسے حل کر سکتی ہے جس میں پوچھا جاتا ہو کہ کس کی ریاست، کس کی حکومت ہے۔ یہ قدرتی فراڈ ہے دھوکا دہی ہے۔

اور اس حقیقت میں بھی کوئی عجوبہ نہیں ہے کہ معمولی سا شک اور ہچکچاہٹ کہ دنیا میں کس کی حکومت ہے تمام میں ہمت پست کر دینے کے لیے کافی ہے کہ دونوں عوامی اور نجی زندگی کی ابتداء ہو رہی ہے۔

انسانی حیات کی فطرت میں ہوتا ہے کہ اس میں نذرو نیاز کرنا فراخ حوصلگی، جلیل القدر، عجزوانکساری، عالی ظرفی اور کم ظرفی، ہردو مواد کے تحت زندگی گزارتا ہے۔ ہم اسی قسم کی صورت حال سے دوچار ہیں جو عجیب و غریب، بے مہر، سنگ دل اور حتیٰ کہ یہ ہماری ہست و بود کو بھی الجھانے میں مصروف عمل ہے۔ ایک طرف زندگانی ہے جو ہر کوئی خود کرتا ہے اور ظاہر ہے اپنے لیے کرتا ہے اور دوسری طرف اگر وہ میری ذات کے لیے کرتا ہے اور جو میری ذات تک محدود ہے اور وہ نہ مجھ سے کوئی ہدایت کا تقاضہ کرتا ہے، تو پھر اس کے تناؤ اور "قسم" میں کمی بیشی ہونے کی وجہ سے اس کے ہر جوڑ کو الگ الگ کر دیا جائے گا۔ گزشتہ چند سالوں میں ہمارے مشاہدے میں آیا ہے کہ بے شمار لوگوں نے اپنی اپنی خود ساختہ بھول . بھلیوں میں کھو کر آوارہ پھرنا شروع کر دیا ہے مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ بھی خود ساختہ کے خانہ بدوش ہیں اور کمال یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو وہ اپنے خود کو دیں سکیں۔ یہ لازم و ملزوم، حکومت، قیادت سب توقف کی حالت میں ہیں۔ آپ کو شاید میری یہ مثال اچھی لگے کہ انھوں نے اپنے وجود کو بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ کام کرے نہ کرے اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ اپنی دیکھ بھال خود کرے۔ یقین کریں اسی طرح بعض قوموں کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہے۔ یورپ نے اپنا دباؤ دنیا میں سست رو کر دیا ہے۔ لیکن نتیجہ اس کے برعکس جس کی امید تک نہ تھی۔ خود کو کیا دیتے کہ زندگانی تہی دامن ہو کر رہ گئی ہے۔ اور اب یہ کچھ کرنے سے رہا۔ اور جیسا کہ اس کمی کو کسی نہ کسی طرح پورا کرنا ہوتا ہے اس لیے اس نے ہرزہ سرائی کے مکدر کاروبار میں خود کو شامل کر لیا ہے۔ اور جو صادق اور مخلص لوگ موجود ہوتے ہیں ان کو کوئی پوچھتا نہیں ہے۔ یعنی پھرتے ہیں خوار کوئی پوچھتا نہیں ہر روز نیا روپ میں اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ آج کچھ اور کل بے کل ہو رہا ہے۔ یعنی اول روز سے بالکل برعکس۔۔۔۔۔۔ زندگی تنہائیوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔اور لوگ ہیں جو خود کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ انانیت (خودی) نے اپنی جون بدل کر عقیدہ میں پناہ لے لی ہے۔ مگر ایک بات طے ہے اور اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ یہ سچ قابل فہم ہے۔ سچ ہمیشہ زندہ رہتا ہے اس کی ہدایت یابی، ترقی کا حصول، مقصدیت کے لیے ہدایت اور پھر ہدایت نامہ ہوتا ہے۔ منزل مقصود سے درخواست کرنا حرکت نہیں ہے نہ میری زندگی! لیکن اس پر اعتماد کہ یہ کوئی شے ضرور ہے جس کے لیے میں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ میں اپنی زندگی اسی

کے سپرد کرتا ہوں۔ اور نتیجتاً" جو اس کے باہر رہتی ہے اور شاید بہت دور رہتی ہے۔ اگر میں خودی کے تحت زندگی بسر کرنا چاہتا تو کبھی ترقی نہ کرتا اور میں کہیں کا بھی نہ رہتااور نہ پہنچتا۔ میں دائرہ کے ایک نقطہ کے گردو پیش چکر لگا رہا ہوں۔ یہ ایک ایسا گورکھ دھندا ہے' یہ ایک سڑک ہے جو کہیں نہیں جاتی خود کو کھو دیتی ہے اور خود کے بنائے ہوئے دائروں میں گھومتی رہتی ہے۔ جنگ عظیم اول کے بعد فرنگی نسل (یورپی) نے اس انانیت (خودی) کے گرداب میں مقید کر دیا ہے۔ اس کے پاس خود اور نہ دوسروں کے لیے کوئی منصوبہ موجود ہے۔ گویا آج ہم تاریخ کی اس کچی پکی سڑک پر رواں دواں ہیں جس سے دس سال پہلے ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔

باطل کمان کرنے کی مشق نہیں کرتا۔ اس کے مشق ستم دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کا طرہ ء امتیاز یہ ہے کہ یہ تنہا ظلم نہیں کرتا۔ اگر آپ سمجھتے ہوں کہ یہ اسی کی کارستانی ہے تو پھر یہ تصادم / ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ حکومت کا نشہ دو آتشہ ہوتا ہے۔ کسی ایک پر حکومت کی جاتی ہے اور اس کے خود کو کوئی اور حکم دیتا ہے کہ وہ کچھ کرے اور بعدازاں اسے حکم دیا جاتا ہے کہ تاریخ کے مقدر میں اس کی بلند ہمتی کا معاوضہ یہ کہہ کر دیا جاتا ہے کہ جاؤ یہاں کوئی سلطنت نہیں ہے۔ جہاں زندگی میں کوئی نصب العین نہیں ہے مختصراً" یہ کہ جہاں خسروانہ اور شاہانہ زندگی نہ ہو وہاں سلطنت نہیں ہوتی ہے۔ اسی مسئلہ کے پیش نظر شیلر نے کیا خوب کہا ہے "جب شاہان کوئی تعمیر کرنا شروع کرتے ہیں تو ریڑھے بانوں کو بھی اپنی نذر و نیاز کرنے کا موقع مل جاتا ہے" اگر نہ کرے تو وہ انفرادی مخصوص گماں کرتا ہے کہ یہ تو عظیم قوموں کی سرگرمی ہوتی ہے۔ اسی طرح عظیم لوگوں کے عظیم کارنامے ہوتے ہیں۔ یہ بھی انانیت پسندی کی ایک تحریک ہوتی ہے۔ خالص انانیت پسند اتنا آسان بھی نہیں ہے جس طرح کوئی سمجھتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کو پاک و صاف کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ عظیم قوموں اور عظیم انسانوں کی محویت بالذات (خود پسندی) ایک حتمی کرختگی اور درشتگی ہوتی ہے۔ اگر کسی نے کسی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرلیا تو پھر جانے اس کا کیا حشر ہوگا۔ وہ بھگتے گا۔ ہاں' واقعی کوئی دل سے کام کرنا چاہتا ہے یا اس کے لیے خود کو وقف کر دیتا ہے تو اس سے کوئی امید رکھنا عبث ہوگا اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے اور کسی راہ گیر کی حفاظت کرے۔ اور اسے کیا پڑی کہ وہ کسی غیر سے یا اجنبی سے ایثار اور بے غرضی کا مظاہرہ کرے۔ سیاحوں اور مسافروں کے لیے سپین میں جو چیز سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث ہے اور دل کو لبھاتی ہے اور جس سے ان کو خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اگر گلی میں وہ کسی چوک یا کسی عمارت تک پہنچنے کا پتہ معلوم کرے تو وہ ہسپانوی اپنے جبلی جذبہ ایثاری سے فوراً" اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنی منزل مقصود تک خود پہنچا کر مسرت اور شاداں ہوتا ہے۔ ان کا یہ جذبہ قربانی لائق تحسین ہے اور میں ان کے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے کیونکہ یہ ایسے چند ملنسار مزاج اور برتاؤ کرنے والے باشندے ہوتے ہیں جن میں فیاضی اور سخاوت کے عناصر ان کے خمیر اور ضمیر میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ اور میں خود بھی اس وقت بہت خوشی محسوس کرتا ہوں اور نازاں ہوتا

ہوں جب کوئی غیر ملکی سیاح یا مسافر ہسپانویوں کے اس برتاؤ کا حوالہ دیتا ہے لیکن جب میں ان کے اس جذبہ ء ایثار کا کہیں پڑھتا اور سنتا ہوں تو پھر میں کبھی بھی اپنے شبہ کو دبانے اور کچلنے کے قابل نہیں ہوا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میرے ہم وطنوں کو ان سیاحوں اور مسافروں سے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے کہ کیا واقعی آپ نے ادھر جانا ہے؟ کیونکہ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ ہسپانوی کہیں بھی نہ جارہا ہو یا اس کا کوئی اور مشن یا مقصد تو نہیں ہے؟ اگر میرے اس برتاؤ سے کسی دوسرے شخص کو زندگی ملتی ہے اسی طرح مجھے بھی اچھی زندگانی ملے گی۔ لیکن میں نے اکثر دیکھا ہے کہ میرے بعض ہم وطن پہلے گھر سے باہر نکل کر دیکھتے ہیں کہ شاید کوئی غیر ملکی سیاح یا مسافر اسے مل جائے تاکہ اس کے ساتھ وہ رہ سکے۔

اسی شک و شبہ کی دنیا میں یورپ کی حکومت ہے۔ یہ نہایت ہی سنجیدہ بات ہے کیونکہ اس شک و شبہ نے دیگر قوموں کو پست ہمت اور بد دل کر دینا چاہیے۔ یہ شرط ان قوموں کے علاوہ حوالے کے لیے دی جاتی ہے جن کے پاس بھاری تعداد میں نوجوانوں کے اسباب سے قومیں قبل از تاریخ کے زمانوں میں رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس سے بھی سنجیدہ ایک اور بات ہے کہ اس عمل ترقی کو عارضی طور پر روک دینے سے یورپ خود انتہائی بد دلی اور پست ہمتی کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ میں اس پر بھی زور نہیں دیتا کیونکہ میں خود بھی یورپی نسل (فرنگی نسل) یا اسی قسم کا ایک فرنگی نسل کا باشندہ ہوں۔ میں یہ نہیں کہوں گا اگر فرنگی نسل مستقبل قریب میں حکومت کرنے کے قابل نہیں ہوتی تو میں دنیا میں یورپ کی حکومت کے سوا اور کسی کی زندگی یا حکومت میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس لیے مجھے یورپ کی قیادت نہ کرنے کی کوئی فکر نہیں ہے اور اگر کسی دوسرے ملک کے کسی ایک گروپ کے وجود (ہستی) نے اس کو ہٹا کر حکومت کرنا شروع کر دے تو وہ بھی اس ارضی خطہ پر اسی طرح حکومت کرے گا جیسے اس نے پہلے حکومت کی۔ تاہم مجھے اس کے بارے میں کچھ زیادہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ مجھے اس فکر سے مطمئن خاطر ہونا چاہیے۔ کوئی بھی حکومت نہ کرے سوائے اس نیکیوں اور خصوصیات کی فرنگی نسل کے پاس اہل متلون اور سیماب وش فرنگی نسل عوام کو ہی حکومت کرنا چاہیے۔

یادش بخیر! اگر فرنگی نسل یورپ میں حکومت نہ کرنے کے رواج میں کھو گئی تو کیا قدیم براعظم کی ایک آدھ فرنگی نسل کی حکومت کا یورپ میں وقوع پذیر ہونا ناگزیر نہیں ہو جائے گا؟ اس میں حکومت قائم کرنے کے لیے صرف فرنگی نسل کی ایک آدھ قوم ہی کیا کافی نہیں ہے؟ جو اپنے ساتھ دنیا کی تمام اقوام کو لے کر کیا اخلاقی پستی' بانجھ پن اور ہمہ گیر بربریت سمیت ایک اندھے گڑھے میں نہیں گر جائے گا۔ یہ حکومت کرنے کا ایک دلفریب نظریہ ہے جس کی ذمہ داری اس نسل پر عائد ہوگی۔ جس سے مغربی ذہنوں میں تناؤ اور کھچاؤ پیدا ہوگا۔ سائنس' فنون لطیفہ (آرٹ)' تکنیک اور باقیماندہ شعبہ ادراکی اقتدار اعلیٰ کے مقوی ماحول میں رہنے لگیں گے= اس میں اگر کمی واقع ہو جائے تو فرنگی نسل آہستہ آہستہ اپنے مقام اور مرتبہ سے نیچے گرا دی جائے گی۔ وہ اپنے شعور اور ایمان کو خود

میں زیادہ دیر تک رکھنے کے ناقابل ہوں گے۔ جو درحقیقت ان کو مستعدی جرأت مندی، بہادری اور مضبوطی سے پکڑ کر تھامنے والوں کی زندگی میں عظیم اور نیک خیالات کو برانگیختہ کر کے نئی زندگانی عطا کرتے ہیں اس طرح فرنگی نسل کا ہر ایک فرد افرادی قوت میں تبدیل ہو جائے گا اور وہ ہمیشہ اپنے گذشتہ کل اور ماضی کے رواجوں سے بندھے کام سے پیچھے ہٹ کر دوسروں کو تخلیق کرنے کے لیے خصوصی کوشش کرتا ہے اور قابل ہو جاتا ہے کہ ان کو تخلیق کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے یہ سارے رویے گھٹیا، معمولی، رواجی، ادنیٰ مخلوق، اور یونانی تنزلی اور بازنطینی عہد کے لوگوں کے رویوں اور جبلتوں کے مرکز کے گرد گھومتے ہیں۔

تخلیقی قوت کی حامل یہ زندگی ایک نہایت ہی شعوری اور ایک صحتمند عہد، ایک اعلیٰ چال چلن (کیریکٹر) اور ایک محرک ہونے کی دلالت کرتی ہے جو انسانی عظمت رفتہ کو ہمیشہ مستعد اور چاک و چوبند رکھتے ہیں۔ یہ تخلیقی زندگی ایک قوت بخش زندگی ہوتی ہے اور یہ زندگی صرف ایک یا دوسری زندگی میں سے ان دو ممکنات میں ایک ممکن میں ہے۔ ایک وہ جو خود حکومت کرتی ہے یا خود کو ایسی دنیا میں سے محسوس کرتی ہے جو کسی اور سے مستعارلی ہوتی ہے جو کسی اور سے زندگی لے کر خود حکومت کرتی ہے جس سے ہم شناخت کر لیتے ہیں کہ اس میں سے کون یہ کام کرنے کا حق رکھتی ہے ایک نہ ایک دن یورپ سوچے گا کہ وہ حکومت کرے نہ کرے اطاعت شعاری کرے یا نہ کرے۔ اطاعت شعاری سے میری مراد خودسپردگی نہیں ہے کیونکہ اس میں انحطاط کا عمل دخل ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس کہ حکومت کی توقیر کی جائے اور اس کی حکمرانی کو تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ یک جہتی اور اس کے پرچم تلے اپنے جوش و جذبہ کو اس کے رجسٹر میں اندراج کرنا پڑے گا۔

اب نہایت ہی مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اپنے پہلے مضمون کی انوکھی سچائی کی طرف ایک بار پھر نگاہ ڈالیں کیونکہ اس میں یورپ کے اس عہد کی تنزلی کے بارے میں بیشمار وجوہات بیان کی گئی تھیں۔ یہ ایک حیران کن تفصیل ہے کہ اس کی تنزلی کا اعلان پہلی بار خارجیوں نے نہیں کیا بلکہ اس کی تنزلی کے اعلان اور آگاہی کا سہرا خود فرنگی نسل، کے سر لگتا ہے۔ جب قدیم یورپی براعظم کے بیرون سے خیال نہ آیا تھا تو جرمنی، انگلستان اور فرانس کے انسانوں نے اسی خیال کو خود تخلیق کیا تھا۔ اور یہ پوچھا "کیا ہم انحطاط پذیری کا آغاز نہیں کر رہے ہیں؟" اس خیال کے سوال سے دباؤ میں اچھا خاصہ اضافہ ہوگیا تھا اور آج نوبت بہ اینجا رسید کہ ہر شخص یورپ کے انحطاط کی شروعات کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتا پھرتا ہے جیسے یہ کوئی ناقابل تردید حقیقت ہے۔

لیکن ابھی میں اس شخص جو اس تنزلی کے اعلان کا دعویٰ نہ کرنے میں مصروف عمل ہے کی توجہ مبذول کراتے ہوئے پوچھتا ہوں کہ اس نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کن ٹھوس وجوہات اور شواہد کو بنیاد بنایا ہے۔ تو ہمیں معلوم ہے کہ وہ اپنے کندھوں کو مبہم سی حرکت دے کر اور ہاتھوں سے اشارہ کر کے ہمیں کیا بتانا چاہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے بھی کائنات کو اپنی اساس بنایا ہے جب اس تباہ حال جہاز کی طبعی اور نمایاں خصوصیت ہے۔ درحقیقت وہ جانتا ہی نہیں ہے کہ وہ اس کائنات

میں کس چیز سے لپٹا ہوا ہے۔ بظاہر تو وہ ہمیں ایک سیدھا سادہ آدمی نظر آتا ہے لیکن وہ اس کی تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا اور یورپ کی تنزلی کی خصوصی وجوہات کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا نہیں چاہتا کہ یورپ کے زوال کے حقیقی معنی کیا ہیں کوشش کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ دراصل یہ تو اپنی اقتصادی مشکلات کے ذہنی انتشار اور الجھاؤ میں الجھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس میں آج کا ہر یورپی نسل کا آدم زاد مبتلا ہے۔ لیکن جب کوئی ان مشکلات کے فطرتی تناظر میں معلوم کرنے کے لیے اندر کے حوض میں داخل ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی سنجیدگی سے اقتدار اعلیٰ پر اثر انداز نہیں ہوتا اور سوچتا ہے کہ وہ دولت کیسے پیدا کرے یا یہ کہ وہ بھی اس قدیم براعظم کے منجمد نظام کے منجمد بحران کے عالم سے گزر رہا ہے۔

شاید یہی وہ سوال ہے کہ جرمنوں اور انگریزوں نے آج کے عہد میں خود محسوس نہ کیا یہ ماضی کی قدروں سے آج کہیں زیادہ بہتر خیالات رکھنے کے قابل نہیں ہیں؟ ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ نہایت ہی ضروری اور اہم بات ہے کہ جرمنی اور انگلستان میں اس وقت کی اقتصادی حالت کے شباب اور صورت حال کے بارے میں تحقیق اور تفتیش کرنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ پر فوری طور پر دھیان اور تحقیق کی تو انکشاف ہوا کہ ان کی حالت اس حقیقت سے پیدا نہیں ہوئی کہ وہ خود اس مسئلے کے بارے میں اپنی قابلیت اور اہلیت کی وسعت پذیری کے بغیر محسوس کرتے ہیں۔ بلکہ خود کو پہلے سے زیادہ اہلیت اور قابلیت محسوس کرنے کی رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض ممالک میں اس صورت حال میں پیدا کی جانے والی رکاوٹوں کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں جو ان کو حاصل کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور وہ ان کو دور کرنے میں اپنی طاقت اور قوت کو استعمال میں لاتے ہیں۔

جرمنی، انگلستان اور فرانس کی اصلی اور مہلک سرحدیں درحقیقت اقتصادیات پر مبنی ہوتی ہیں جو دراصل ان ہی ریاستوں کی سیاسی سرحدیں ہوتی ہیں اور اصلی مشکل کا حل اس کی گہری دلچسپی کے مظہر قدرت میں ہے۔ ان کی اقتصادی مشکلات کا حل اس میں اور نہ اس میں ہے جیسا کہ منظرنامہ اپنا خاکہ پیش کرتا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے ہر ملک کی اقتصادی مشکلات کا حل خود ان کے عوام کی خود انحصاری پیداوار اور لیاقت سے حل کیا جاسکتا ہے جو سراسر اس آخرالذکر کے قدوقامت میں پوشیدہ ہے۔ میرے نزدیک فرسودگی اور میلان (جھکاؤ) اور ناتوانائی اور کمزورفی جو بلاشبہ اس وقت یورپ کی اہمیت کا احساس کرنے سے حل ہوسکتا ہے۔ اور اس کا حل یورپ کی سیاسی جماعتوں کے مابین پائے جانے والے بعد کی استعداد کار اور اہلیت کی بنا پر کیا جاسکتا ہے۔ ایسے بھیانک اور خوفناک سوالوں کے پیدا ہونے کی رکاوٹوں کو دور کرنا یورپ کے آج کے تمام مسائل کے حل کا ایک خصوصی منظرنامہ پیش کیا جانا چاہیے۔ پھر اس کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ رکاوٹیں اس سے قبل ظاہر نہیں ہوئی تھیں۔ یہ رکاوٹیں آج کے چھوٹے چھوٹے آدم زادوں کے اندر پڑی ہوئی ہیں جنھوں نے ان کو برسوں سے قیدی بنائے رکھا ہے اور جس کی وجہ سے آج براعظم یورپ اس کے ذہنی انتشار کے بوجھ تلے آیا ہوا

ہے۔ آج یورپ کی حالت اسی پرندے کی طرح ہے جو جنگ کرنے کے لیے اپنے بڑے پروں کو پھیلاتا ہے اور اپنے مخالفین کے بنائے گئے پھندوں' جالوں اور رکاوٹوں سے جا ٹکراتا ہے۔ اس طرح یورپ کی عوامی یلغار نے بھی کچھ اسی قسم کی جنگ کے لیے بغاوت کرنی شروع کر دی ہے۔

اس صورت حال کی انھی صداقتوں کو زندگی کے تمام دوسرے نظام میں دوہرایا جانا چاہیے جس کی بظاہر اہم علامت اور اہم جز اس (یورپ) کی اقتصادیات سے خاصے مختلف پائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک فرنگی نسل کا روشن خیال ادیب یا دانشور آج کے اپنی اپنی جرمنی' انگلستان اور فرانس کی ہر ایک ملکی سرحدات کے اندر گھٹن محسوس کرتا ہے۔ اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے قوم پرستانہ رنگ اور قوم پرستی کے جذبہ کی قطعی طور پر احاطہ بندی کی ہوئی ہے۔ ایک جرمن پروفیسر نے جرمنی کے عوامی پروفیسروں کی امدادی دعوے کو لغو قرار دیا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ اس ایک پروفیسر کی تخلیقی کاوششوں پر لگائی جانے والی پابندیوں کو دور کرنے میں ان کا عمل دخل تھا۔ ادھر اب صورت حال یہ ہے کہ فرانسیسی دانشور اور ادیب یا انگریز مضمون نگار دانشور یا ادیب کو دی جانے والی آزادیوں کو وہی جرمن پروفیسر بہت یاد کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایرانی دانشوروں اور ادیبوں نے محسوس کرنا شروع کردیا ہے کہ اب ادبی مہاندریوں یعنی چھومنتریوں کی روایتی اور شعار پرستی (رسمیت) کا بہت جلد خاتمہ ہونے والا ہے۔ تاہم یہ اس کی چند شعائر پرستی کی خوبیوں کو ضرور ترجیح دینا پسند کرے گا۔ اس لیے کہ وہ اس جرمن پروفیسر کی چند تخلیقی خصوصیات میں وسیع تر افزوں کاری کر سکیں۔

بالکل اسی طرح یورپ میں علم سیاسیات کے اندرونی معاملات میں افزوں کاری ہو رہی ہے۔ ہم نے آج تک عظیم قوموں کی سیاسی زندگی کی مشکلات کا جائزہ لینے کا شائق اس قسم کا گھٹیا تردیدی بیان نہیں دیکھا۔ جبکہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ جمہوری اداروں نے اپنا وقار کھو دیا ہے۔ لیکن اس کا خلاصہ یہی ہے جو میں نے یہاں بیان کرنا ضروری سمجھا ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ عزت نفس اور عزت و وقار کے کھو جانے کا نقصان بہت عجیب و غریب ہوتا ہے۔ پارلیمان ہر جگہ اس کے کپڑے ادھیڑتی ہے لیکن لوگ یہ محسوس کیوں نہیں کرتے کہ کسی ملک نے بھی اس عوامی پارلیمان کا متبادل لانے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ہی کسی دوسری طرز کی ریاست کے بارے میں اپنا آدرش وادی (تصوراتی دنیا) کا خاکہ پیش کیا ہے جو ہر قیمت پر مثالی اور قابل ترجیح دکھائی دے۔ اس کے عزت و وقار کے نقصان کے مستند یا وصف ہونے پر بھی زیادہ اعتماد نہیں کیا جاتا۔ یہ ادارے نہیں بلکہ عوامی زندگانی کے چلتے پھرتے کردار نگاری کے اوزار ہوتے ہیں جن کی وجہ سے آج یورپ میں اتھل پتھل کا بازار گرم ہے۔ یہی وہ کام کے ادارے ہیں جن کی افادیت اور خدمات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ اور اس کی استعداد کاری کی وسعت پذیری میں اور موثر استعداد کاری کو یورپ کے ہر فرد کو اپنی زندگانی کو بہتر بنانے کی خاطر خود کے طرز عمل میں شامل کر لینا چاہیے۔ کیونکہ اب یہ یورپ کے ہر فرد کی ایک ضرورت بن چکے ہیں۔ مجھے تو پارلیمان میں اس "نیا آدمی" کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سن سن کر بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایک اور مثال کہ پارلیمانی امور کو روایتی طور

طریقوں پر چلانے کے لیئے قانونی ضابطہ کے مطابق درست اعتراضات کے تسلسل کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان اعتراضات کو الگ الگ جانچا جائے تو ان اعتراضات میں سے ایک بھی اس کے نتیجہ کو بطور حجت یا دلیل یہ ثابت نہیں کرتا کہ پارلیمان کو ختم یا بند کر دیا جائے۔ لیکن اس کے برعکس تمام اعتراض کنندگان نے براہ راست اور واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ پارلیمان کے تمام ضابطوں میں یہ اور یہ مناسب ترمیم کرنے کی ضرورت موجود ہے۔ چنانچہ اب انسانی ضروریات کی بہتر حصول اس سے زیادہ کبھی نہیں ہوا ہے جب تک اس کے ضابطہ قوانین کے تحت مناسب ترامیم کر دی جائیں۔ کیونکہ اس حقیقت کی قلعی کھل جانے کے بعد ایسا کرنا اور بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔ کیونکہ یورپ کی اس نئی زندگی میں یہی ایک افزوں کاری کی استعداد رکھتی ہے۔

یاد رہے کہ ۱۹۱۰ء میں بنائی جانے والی موٹر کار کے خلاف کیے جانے والے اعتراضات کے نتیجہ میں یا روشنی میں آج کی جدید اور آرام دہ موٹر کاریں بنائی گئی ہیں۔ لیکن آج کے پارلیمان کی جو بے توقیری اور بے عزتی کی جارہی ہے اس پر کیے جانے والے اعتراضات کے تحت نہیں ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں بتلایا گیا ہے کہ یہ پارلیمان موثر نہیں ہے تو اس سے ہمارا سوال یہ ہے کہ "کیا موثر نہیں ہے؟" کیونکہ اثر کاری اس کے قبضہ شدہ مشینری کا فقط ایک اوزار ہے یا فقط ایک نیکی ہے۔ جو قطعیت کی بنا پر وقوع پذیر ہوئی ہے۔ یہ مقدمہ (سوال) اپنی قطعیت کے کارن ہر قوم کے تمام عوامی مسائل کے حل کا پیش خیمہ ہے۔ اس لیے ہم اس آدمی (نمائندہ) سے مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں جو پارلیمان کی غیر اثر کاری کا دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اصلی اور عوامی مسائل کے حل کا ایک واضح خاکہ (نظریہ) رکھتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ کوئی گمان نہیں رکھتا اور جیسا کہ یہ گمان (تصور) آج کسی ملک میں موجود نہیں ہے تو پھر مفروضی (نظری) گمان بھی کیا کیا جانا چاہیے۔ اس لیے میں درست سمجھتا ہوں کہ ان اداروں کے ناکافی ہونے پر الزام تراشی چہ معنی دارد اور اس کے پس منظر میں ان کا کیا منشا کار فرما ہے۔ ہم یہ یاد دہانی کرانا مفید سمجھتے ہیں کہ تاریخ میں اس قدر خوفناک اور تاثیر بخش اور ذود اثر ریاستوں کے ادارے اس سے بہتر تخلیق نہیں کیے گئے۔ یہ انیسویں صدی کا کمال ہے کہ اس نے پارلیمان جیسا ادارہ خلق کیا ہے۔ اور حقیقت اس قدر غیر متنازعہ ہے کہ اسے بھول جانا احمقانہ پن کی دلالت کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں قانون ساز اسمبلیوں اداروں کی مکمل اصلاح اور ترامیم کرنے کے 'گمان' ممکنات اور ضرورت کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے تاکہ اس کے ذریعے سے موثر انداز میں عدم افادیت کے ناکارہ اور اثباتی دعوے میں تبدیلی لائی جاسکے۔

پارلیمانی اداروں کی جانب سے عزت و تکریم کے نقصان کا بدنام زمانہ نقائص سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا ایک دوسرا سبب ہے جو ان کے لیے انتہائی غیر ملکی ہے جس کو ایک سیاسی دستاویزات کے طور پر سمجھا گیا ہے۔ اس کا حقیقی سرچشمہ یہ ہے کہ پوری نسل بالکل یہ جانتی نہیں کہ اس کی افادیت ان کے لیے کیا ہے۔ اور اس نے عوامی زندگی کے روائتی مفادات' کے لیے عزت برباد کیوں کی ہے یا یوں کہہ لیں کہ (پارلیمنٹ) قومی ریاستوں کے متعلق امور فریبوں کی حمایت نہیں کرتے

جس میں انھوں نے خود کو قید اور محبوس کر رکھا ہے۔ عزت سادات کے کھو جانے پر اگر رتی بھر غور و فکر کر لیا جائے تو یوں نظر آتا ہے کہ ہر شہری کوئی زیادہ دیر اپنی ریاست کی عزت و توقیر کرنے کو محسوس نہیں کرتا حتیٰ کہ یہ شہری انگلستان، فرانس اور جرمنی میں ریاست کی عزت نفس کی قدر و منزلت کو محسوس نہیں کرتا ہے۔ اس لیے جمہوری اداروں کے تفاصیل میں کوئی بنیادی تبدیلی لانا فضول ہے کیونکہ یہ ادارے نہیں ہوتے جو قابل عزت نہیں ہیں بلکہ یہ خود ریاست ہوتی ہے جس کی اب بے توقیری کی جارہی ہے اور اسے ایک حقیر شے بنا دیا گیا ہے۔

یورپی عوام نے پہلی بار اپنے اپنے ملکوں کی سرحدوں کے اندر رہتے ہوئے اقتصادی، سیاسی اور شعوری طور پر اپنے اپنے منصوبوں کی جانچ پڑتال کی اور یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے یہ منصوبہ جات ان کی دسترس سے باہر ہیں اور اجتماعی تنظیم کی قد و قامت جس میں وہ مقید ہیں یہ مناسب طور پر ان کی حدود سے باہر وجود رکھتی ہیں اس طرح اس نے اپنے خود کو انگریز، جرمن اور فرانسیسی کو ایک ایک صوبہ کے طور پر یعنی ایک ایک اکائی کے طور پر دریافت کیا ہے۔ اس نے یہ دریافت کیا ہے کہ یہ پہلے سے تعداد (مقدار) کے لحاظ سے کم تر ہے کیونکہ ماضی میں انگریز، فرانسیسی اور جرمن کا ایمان کہ "وہ صرف اپنے خود کے لیے زندہ ہیں اور یہ کہ انھیں ہی ایک کائنات سمجھا جاتا تھا"۔ میرے نزدیک یہاں سے یورپ کے زوال کے آغاز کی صداقت کا احساس شروع ہوا جو آج پوری فرنگی نسل کے لیے باعث اذیت ہے۔ اس لیے یہ ایک ایسا ذریعہ ہے جو ایک طرف روحانی اور دوسری طرف خلاف قیاس بھی اور اس کے پیش نظر تنزلی کا مفروضہ اس حقیقت کے خلاصہ سے پھوٹتا ہے کہ اس کی استعداد کار بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اور اب بھی خود کو قدیم جماعت یا تنظیم میں مقید پاتا ہے۔ جس کے لیے اس کے اندر میں کوئی جگہ نہیں یعنی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔ میرے ان خیالات کو مدد دینے کے لیے آیئے کوئی ٹھوس کاروائی اختیار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر موٹروں کے بنانے کی کاروائی۔ موٹر کار کی ایجاد قطعی طور پر یورپی ایجاد ہے۔ لیکن پھر بھی آج کی بہتر اور مفید موٹر کار شمالی امریکا ہی کی تیار کردہ سمجھا جاتا ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ یورپ کی موٹر کار تنزل پذیری کے مرحلے سے گذر رہی ہے۔ لیکن یورپی کار بنانے والے ادارے اچھی طرح جانتے ہیں کہ امریکی کار کی خوبی یا خصوصیت غیر ملکی ہونے کی بنیاد نہیں ہے۔ لیکن حقیقت صرف یہ ہے کہ امریکا نے اپنی مصنوعات پر سے پابندیاں اٹھا لی ہیں اور دوسرا اس کی آبادی صرف بارہ کروڑ کے لگ بھگ ہے (اب امریکا کی ۲۷ کروڑ ہے) اور کار بنانے والے ادارے بہت کم آبادی والے ملک کو ہی کاریں فراہم کرتے ہیں۔ ذرا اندازہ لگایئے جبکہ یورپ کی ایک موٹر کار فیکٹری یورپی ریاستوں کی تجارتی منڈیوں کے علاوہ اور اپنے زیر تسلط حکومتوں اور کالونیوں کی تجارتی منڈیوں کو ان کی مالی حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی موٹر کاریں ان کو فراہم کرتا ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ موٹر کار جو پانچ یا چھ سو ملین گاہکوں کے لیے تیار کی جاتی ہے وہ یقیناً" امریکی کمپنی فورڈ ہے جو یورپ کی کار کی نسبت زیادہ بہتر اور سستی ہے۔ امریکی کار کی خوبیاں اسکی امریکی تکنیکی پختگی اور تعلقات عامہ کے گہرے اثرات جو عالمی تجارتی منڈیوں میں پائے

جاتے ہیں اس کی بنا پر اسکی مقبولیت عام ہے نہ کہ ہم نوعی یا ہم قسمی کے سبب سے مارکیٹوں میں اثر انداز ہوئی ہے۔ صنعت کی تصویب کی قدرومنزلت مارکیٹ کے خود روئی کے انجام سے اندازہ لگایا جاتا ہے۔

اسی صورت حال کے مطابق یورپ کا اصلی چہرہ کچھ اس طرح بنتا ہے۔۔ اس کے شاندار ماضی نے اس کو اس نیا مقام پر پہنچایا ہے جہاں اس نے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی اور اضافہ کیا ہے۔ لیکن اس وقت ماضی کے باقی ماندہ اداروں نے فطری اور ذہنی نشوونما میں رکاوٹیں ڈال دی ہیں اور جن کے ترقی اور پھیلاؤ میں یہ ادارے ہر طرح کی مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ یورپ میں تعمیر نو میں ایک اور صورت خرابی یہ معلوم ہوئی ہے کہ چھوٹی چھوٹی قوموں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ اس لیے اس میں اعلیٰ قومیتوں، اعلیٰ خیالات، اعلیٰ ایجادات کرنے سے اس نے خصوصی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اور جس کی وجہ سے اپنی ترقی اور خود کو پھیلانے میں بے حد تجاوزات کی ہیں۔ یہی اس قوی ہیکل ڈرامے کا خلاصہ ہے جو اس کے آئندہ برسوں میں اس کے ایک نئے ڈرامہ کی پہلی اینٹ ہے۔ سوچنا یہ ہے کہ یورپ اس قابل ہے کہ اپنی تمام باقیات کا خاتمہ کر دے گا یا پھر خود ان باقیات میں قید رہے گا؟ کیونکہ ایک بار تاریخ میں ایسا واقع پیش آچکا ہے کہ جس میں ایک عظیم تہذیب اپنے روائتی خیال کے تحت ریاست کی خاطر کوئی متبادل راستہ اختیار کرنے کے قابل نہ تھی چنانچہ وہ تہذیب اور ریاست دونوں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

میں نے اپنے اسی مضمون میں کہیں اور ذکر کیا ہے کہ یونان اور رومی کی دنیا مرض الموت کے دہانے پر دستک دے رہی ہے۔ ادھر میں نے کیا کہا اس کی خصوصی تفاصیل پر جمی تہوں کو ہٹا کر میں ایک بار پھر اپنے قارئین کو مطالعہ کرنے کی زحمت دیتا ہوں۔ لیکن ہم اس مسئلہ پر ایک نئے زاویہ سے بات کرتے ہیں۔

یونانی اور لاطینی بظاہر تاریخ میں شہد کی مکھیوں کی طرح اپنے چھتوں میں قید نظر آتے ہیں۔ اس طرح لوگ اب شہروں اور دیہاتوں میں مقید ہیں۔ یہ ایک کھری حقیقت ہے اور پراسراریت اس کا مخزن ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ ہم کسی جھنجھٹ میں پڑے بغیر اپنے موقف کا آغاز کرتے ہیں۔ یوں شروع کرتے ہیں جیسے حیواناتی ماہر لنڈورے (گنجا شخص) کے سر سے شروع کرتا ہے۔ اور یہ ایسا طریقہ ہے کہ اس میں توضیح بیان نہیں کی جاتی۔ اور یہ ہرگز نہیں بتایا جاتا کہ سپیکس (spbex) ایک تنہا اور آوارہ منش پرندہ ہے۔ اور جبکہ طلائی مکھی صرف اپنے زنبور خانہ (چھتے) میں موجود رہتی ہے۔ کھدائی کر کے ہمیں محکمہ آثار قدیم نے بتایا ہے کہ ایتھنز اور روم کی غیر موجودگی میں ان کے ساحلوں پر کس چیز کا وجود تھا۔ لیکن تاریخ سے قبل یہاں کے زمانوں اور قدرتی مظاہر کے لائے ہوئے تغیر و تبدل سے لے کر ان دو شہروں کی تعمیر تک یہاں کا ماحول بالکل دیہاتی تھا اور ان دیہاتوں میں کسی خاص قسم کی چیز کی علامت یا امتیازی نشان موجود نہ تھا۔ ان دونوں جزیروں کے ساحلی علاقوں کی مٹی سے ایک نیا "پھل" پیدا کیا گیا۔ اس کے بارے میں سب کچھ اب بھی سربستہ راز ہے۔ اور نہ ہی اب

ہمیں کوئی ایسی علامت ملی ہے کہ تاریخ سے قبل زمانوں میں مشرکوں نے کیا کیا عجیب و غریب چیزیں پیدا کی ہیں کہ انسان ششدر رہ جاتا ہے کیونکہ قدیم اور جدید لوگوں کی ایجاد کردہ اشیاء میں ہم نے دیکھا کہ، ان میں ایک حیرت انگیز تعلق آپس میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک عوامی پنڈال کی تعمیر کی اور پھر اس کے اردگرد شہر آباد کیے جو کھیتوں کے عین درمیان واقع ہوتا تھا۔ یعنی شہر کھیت کا قیدی ہوتا تھا۔ در حقیقت شہر اور دیہات کی صحیح اور مناسب تعریف ایک تفنن آمیز مسخرہ کی دو گیندی ضرب سے متشابہ ہے۔ تم صرف اس کے سوراخ پر مضبوط لوہے کی تار باندھ دو تو یہ تمہاری توپ بن جائے گی۔ اس طرح شہر اور دیہات شروع میں ایک متاجنس خلاء میں آباد کیے گئے تھے۔ میری مراد یہ ہے کہ یہ دونوں ایک خوف کشادگی اور پنڈال (چاوڑی فضاء) دونوں یکساں ہست و بود کے سایہ تلے اپنے آباد ہونے کا آغاز کرتے ہیں۔ اور باقیماندہ حیات نے صرف فضائی حدود میں اپنی منشا اور اپنے خاکوں کے مطابق رہنا شروع کیا تھا۔ شہر (Polis) ابتدائی دور میں اور مجموعی طور پر تنگ نظر رہائش کے قائل تھے۔ تاہم لوگوں کے اجتماع کے لیے ایک پنڈال ضرور تعمیر کیا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسی جگہ ہوتی جہاں عام لوگ اکٹھے ہوتے اجلاس منعقد کیے جاتے، مسائل کو حل کیا جاتا۔ جہاں جزاء و سزا کا عمل شروع کیا جاتا تھا۔ شہر کی تعمیر بس یونہی نہیں کی گئی بلکہ گنبد اور جھونپڑی کی طرح جو اپنے مکینوں کو موسموں کے تغیر اور تبدل سے محفوظ رکھتے۔ یہ گنبد اور جھونپڑے اپنے نمونوں اور اقسام کے لحاظ سے خاصے مختلف اعلیٰ قسم کے ہوتے تھے۔ یہ ذوق اور شوق بھی ان کے خاندانی لگاؤ پر منحصر تھا تاکہ وہ عوامی مسائل کو یہاں زیر بحث لاتے۔ ذرا اس پر غور کیجیے کہ اس چوپال نے ایک نئی روشن فضا کے ماحول کے دائرہ کی قسم کو ایجاد کیا ہے۔ اور یہ چوپال آئن شٹائن کی فضائی چوپال سے کہیں زیادہ خوبصورت تعمیر کیا ہوتا تھا۔ اس وقت صرف ایک فضا موجود تھی۔ اور وہ بھی ایک کشادہ ملک کی طرح کشادہ فضاء اور ماحول ہوتا تھا۔ ان تمام اسباب کے نتیجہ میں انسانی وجود کو شامل کیا ہے۔ کھیتوں میں رہنے والا شخص اب بھی ایک سبزی قسم کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ہستی جو کچھ سوچتی، محسوس کرتی اور خواہش اسی طرح کرتی ہے۔ یہ اپنی ساری چاہتوں اور احساسات کو اب بھی توانائی سے محروم غنودگی کی حالت میں اپنے پودے کی چوکھٹ میں محفوظ رہتے ہیں۔ افریقہ اور ایشیا کی عظیم تہذیبیں اسی نکتہ کی روشنی میں ایک بھاری تشبیہ یا تجسیمی سبزہ کی روئیدگی کے عمل کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی ہیں لیکن یونانیوں اور رومیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کھیتوں (سبزوں) سے علیحدہ رہیں گے یعنی نباتاتی حیات سے الگ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ گویا یوں کہیے کہ قدرت اور نباتاتی کائنات نے جدا جدا رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ انسان کھیتوں سے کیسے علیحدہ ہو سکتا ہے؟ وہ کہاں جائے، یہ تو ایک بڑا ارضی گولہ ہے جس کے کھیت لامحدود ہیں؟ اس کا آسان حل ہے کہ وہ اس کے ایک حصہ کو دیواروں کے خط کھینچ دے جو عمودی حالت میں بند کر کے ایک محدود اور، بدشکل فضاء قائم کی۔ اسی کو عوامی چوپال یا عوامی اسٹیڈیم کہتے ہیں۔ یہ چوپال گھر کی طرح نہیں ہوتا بلکہ اس کا اندرونی حصہ اوپر کی فضاء میں مقید ہے جیسے غاریں ہوتی ہیں جو کھیتوں کے اندر موجود ہوتی ہیں اور یہ سراسر کھیتوں کی تردید

کرتی ہیں۔ یہ گولہ نما چوپال جو دیواروں کے بکرے کی وجہ سے اس میں بند ہے اس کا مضافاتی حصہ بن جاتا ہے۔ اور اپنی پشت کو دوسروں کی باقیماندہ زندگی کی طرف موڑ دیتا ہے اور باقیات کو ختم کر دیتا ہے اور بالکل عمودی حالت میں اس کی مخالف سمت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ کم تر باغی کھیتوں کی حدود سے باقاعدہ طور تعلق توڑنے کا اعلان کرتا ہے جو خود کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔ یہ اس کی منفرد، بے مثل، اور انوکھی قسم کی شکل کا پرتو ہے۔ جس سے آدم زادوں نے نباتات اور جانوروں کے طبقات سے خود کو آزاد کر کے خارجی حصہ میں زندگانی شروع کر دیتی ہے اور ایک ایسی احاطہ بندی کی تخلیق کرتی ہے جو بالکل عین انسانی فطرت یعنی ہم اس کو مدنی خلاء کا نام دیتے ہیں اسی وجہ سے قصباتی عرق ریزی کرنے والے اور شہری مملکت کے روح رواں اور معلم خالق اور مدبر سقراط فرماتے ہیں "مجھے کھیت کے درختوں سے کیا غرض میں تو شہر آباد کرنا چاہتا ہوں۔" لیکن اس سے قبل ہندو، ایرانی اور مصری اس کے بارے میں کیا جانتا ہے؟ میں تو اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔

سکندر اعظم اور قیصر کے بالترتیب زمانوں تک یونان اور روما کی تاریخ ان دو خلاؤں یعنی استدلالی شہر اور سبزہ ملک کے مابین قانون سازی یعنی شہر اور دیہات کے لیے قانون سازی۔ یہ قانون سازی کا ادارہ شہری قانون بنانے والوں اور کسانوں کی جدوجہد پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس شہری ملکیت کا ماخذ میں نے دریافت نہیں کیا بلکہ یہ ایک ایسی علامتی سچائی ہے جس نے یونانی اور لاطینی شہروں کے سکونتی شہریوں نے اپنے ایک انوکھے اور مسلسل عمل کے ساتھ اس کے یکساں نرمادہ تولیدگی کے مادہ کے مجموعہ کو اپنے دماغ کی تہوں کی بنیادوں میں ایک تسلسل کے ساتھ محفوظ کر رکھا ہے۔ اس لیے اس کے نصابی کتاب سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اس کا آسان سادا سا ترجمہ ہی کافی ہے کہ سینیائی کسموس (Synoi Kismo) کی ایک ساتھ رہنے کی ایک قرارداد سمجھیں جس کے نتیجہ میں ایک اسمبلی وجود میں آتی ہے یہ صرف دو لفظوں پر محیط ہے۔ ایک عدل گسترانہ اور دوسری طبیعیاتی۔ دیہاتی انتشار کی روئیدگی قصبہ میں شہری اجتماع یا ارتکاز قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ یہ شہر ایک بڑے گھر کی مثل ہے۔ جس کے تحت انسان کی قدیم رہائش گاہ کو ہٹا کر اپنے رہائشی شہر کی بنیاد ڈالی یعنی مادہ کی صفوں میں سے ایک بڑی صنف نے ایک غیر مرئی مادہ کو ہٹا کر ایک اعلیٰ خاندان کی ہست و بود کو تخلیق کیا ہے۔ اسے رس پبلیکا (Res Publica) اور دی پولٹیا (The Politela) کہتے ہیں جو آدمی اور عورتوں کی خود ساختہ ہے۔ لیکن یہ شہری خود ساختہ ہے۔ اور ایک مخصوص سمت میں ایک بعد جو قدیم کے ساتھ ناقابل خستگی پذیر ہو کر جانور سے باہم ہونے سے انسانی ہستی کو پیش کش دی اور ان میں سے جو پہلے آدم زاد تھا اس نے اپنی بہترین صلاحیتوں اور استعدادکار سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح ایک شہری مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے۔

اما بعد بحیرہ روم کے ساحلی علاقوں میں سکونتی باشندوں نے خود بخود فیشن کے طور پر ایک رجحان، اور شان و شوکت سے اس شہری مملکت کو قائم کرنے کا رواج جاری کیا۔ شمالی افریقہ میں شہری مملکیت حادثاتی طور پر وجود میں آئی یعنی کنداں نقوش برابر ہے شہری جو کم و بیش پاکیزگی کی آمیزش

کے ساتھ ایک تصادم/طبعی حادثہ کے نتیجہ میں شہری مملکت کو وجود میں لاتا ہے۔ اٹلی نے تو اس شہری مملکت کو انیسویں صدی تک ترک تعلق نہیں کیا تھا۔ اور ہمارے مشرقی ساحل والے آسانی سے خود چھاؤنیوں کے علاقائی ضلعوں میں تقسیم ہو گئے کیونکہ اس نے قدیمی تخلیق کے کام کی تحریک جو دل سے پیدا ہوئی کے ذائقہ سے پورا پورا استفادہ کیا۔

یہ بتانا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ کیٹالونیہ میں ان رجحانات کی مخالفت کرنے کے لیے ایک باہمی اتحاد قائم کیا گیا ہے جسے پوری قوم پرستی اور بارسلونا کی شہرپرستی جہاں بحیرہ روم کے قدیم انسان کے باقی ماندہ ڈھانچوں کی دریافت پر ان کے رجحانات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ میں نے کسی اور جگہ بھی لکھا ہے کہ ہمارے مشرقی ساحل کے قصہ ہائے پارینہ کے یکساں قد و قامت کے دمدار پرزوں کی لویں (گوشے) رکھنے والے جدید انسان کے تمام مجانس رئیسہ حیوانات قدیم باقیات اس جزیرہ سے دریافت کی گئی ہیں۔

شہری مملکت اپنے کوتاہ پن مواد (مسالہ) کی وجہ سے ہمیں اپنے شہری مملکت کے اصول کی خصوصی فطرت کو واضح طور پر دیکھنے کی اجازت دی ہے۔ ایک طرف یہ ایک لفظ "مملکت" اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ اس نے تاریخی طاقتوں کو توازن اور پائیداری کی کیفیت تک پہنچا دیا ہے۔ یہ اس کی حس آوری کی بنا پر تاریخی تحریک کے اضافی معنی دیتا ہے۔ یہ مملکت زندگی کی ایک صنف ہوتی ہے۔ جو حقیقی طور پر مستحکم، آئینی اور جامد (ساکن) ہوتی ہے۔ لیکن غیر متحرک کا تعین، قطعیت اور ناقابل تبدیل قسم کا یہ کیفیت نامہ (یاداشت) رازدارانہ طور پر تمام صنفوں میں توازن اور نظریہ قومیت پیدا کرتا ہے اور مملکت کو پیدا کرنے کی حمائت و تائید کرتا ہے۔ ہمیں یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ یہ آئینی مملکت گزشتہ تحریک کی جدوجہد اور کوششوں کے نتیجہ کی خبرگیری کے لیے قائم کی گئی ہے۔ آئینی مملکت کی جگہ آئینی ریاست نے لے لی ہے اور بس یہی تحریک کا اصول اور ہمارا اخذ شدہ نتیجہ۔

میری مراد یہ ہے کہ ریاست سوسائٹی کی ایک صنف نہیں ہے۔ یہ گروہی (نمونی) قبیلہ، یا کسی دوسرے معاشرے جو آپس میں قرابت داروں کی طرح ہوتے ہیں یہ کسی انسانی کوشش یا تحریک سے پیدا نہیں ہوئے بلکہ یہ تو فطری اشتراک کے ایک صنف سے خلق کی جاتی ہے۔ ریاست کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب آدم زادوں نے فطرتی سوسائٹی سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کے خون کا وہ ایک رکن ہوتا ہے۔ وہ خود اس کو تخلیق کرتا ہے۔ اور جب ہم خون کا ذکر کرتے ہیں ۔۔۔۔ مثال کے طور پر زبان۔۔۔۔۔ اس کے ماخذوں۔۔۔۔

اس کے علاوہ وہ کسی دوسری صنف کا نہ سوچیں جس کا پہلے کوئی وجود نہ ہو۔ یوں یہ ایک حقیقی اور مستند تخلیق قرار دی جاتی ہے۔ اس طرح ریاست اپنی قطعیت کے ساتھ اپنی قوت متخیلہ کا

کام شروع کر دیتی ہے۔ قوت متخیلہ یا پرواز فکر ہی انسان کی آزادی حاصل کرنے والی قوت بن جاتا ہے۔ اور یوں ایک آدم زاد بھی ریاست بننے کے قابل اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ کسی حد تک اور کتنے اعلیٰ درجے حرکت دے کر خیال آرائی کرتا ہے۔ اس کو رعنائی خیال بھی کہتے ہیں۔ اس لیے یہ ریاست ہی ہوتی ہے جو تمام لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنی ریاستی حدود کی سمت کا ارتقائی سفر کا آغاز کرتی ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ ریاست بھی عوام کے خیالات کے خلاف اپنی غیر فطرتی حدود کا تقرر نہیں کرتی ہے۔

یونانیوں اور رومیوں نے اپنی قوت متخیلہ سے شہر کو تخلیق کیا تھا۔ جس نے دیہاتوں کی انتشاریت پر کامیابی حاصل کر لی ہے۔ جس نے شہری دیواریں تعمیر کر کے دیہاتوں کو جدا کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں بعض ایسے لوگ تھے جو دوسرے یونانیوں اور رومیوں سے کہیں آگے نکل جانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اور شہری پابندیوں سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ لیکن یہ ایک بے بنیاد فراخ حوصلگی کے مصداق ایک کوشش تھی۔ رومیوں کی پر تخیل حدود کے تعین کرنے کی وجہ سے بروٹس (Brutus) بمعنی سنگدل نے خاکہ بنا کر از خود قیصر کو قتل کر دیا تھا۔ اسے قدیم رسوم یا آثار کی ایک عظیم قوت متخیلہ کہتے ہیں۔ ہم آج یورپی نسل کو اس کہانی کی یاد دہانی کراتا ایک سخت ضرورت سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ہماری آج کی نسل بھی اس وقت اسی وحشیانہ اور سنگدلانہ سطح پر پہنچ چکی ہے۔

غالباً" میں اسی ذہنی کشمکش کے تناظر میں قدیم زمانوں کے دو بڑے سیاست دانوں شامسطوکلیس (Themistiocles) اور قیصر (Caesar) کو یاد کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ بلاشبہ ان زمانوں میں زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو دوسرے کئی مسائل پر گہرا ادراک رکھتے اور واضح خیالات رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر حساب دان، فلسفی اور فطرت پسند بھی موجود تھے۔ لیکن ان کے خیالات سائنسی بنیادوں پر شستہ، واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ وہ غیر مرئی چیزوں سے متعلق اپنے اپنے خیالات رکھتے تھے۔ سائنس ہمیں جن مسائل اور یا مسئلے کے بارے میں آگاہ کرتی ہے ان کی سائنس کیسی بھی ہو وہ قائم الغیر اور غیر مرئی سائنس ہوتی ہے اور یہ غیر مرئی چیزیں ہمیشہ شفاف اور پاکیزہ ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ ان کی شستہ وضاحت سائنسدانوں کے ذھنوں میں اس طرح کی واضع تین ہوتی جس طرح کہ وہ سمجھتے ہیں۔ اصل آمیزش، پیچیدگی اور مشکل کیا ہے دراصل یہ ہی ایک اہم اور ٹھوس حقیقت ہوتی ہے جو کہ ہمیشہ ایک منفرد چیز کی حقیقت ہوتی ہے۔ یہ آدم زاد جو اس کو واضع ہدایت دینے کے قابل ہوتے ہیں۔ اور وہ جو اس ہیولی کو فہم و فراست اور سمجھ بوجھ دیتا ہے جس ریاست، خاندان، طبقات اور زبانوں کی آمیزش پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ اصناف سوسائٹی کی چسکی (لقمہ) ہوتے ہیں۔ اور ان کی خوبی یہ ہے کہ یہ نسل انسانی صفات کی جلیپائی اور کثیر زبانوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔

اس عمل نے ثابت کیا ہے کہ اس کے یہ شہر گوناگوں اور متنوع لوگوں کے دوبارہ میل جول زقند لگانے کے عمل سے وجود میں آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اتحاد تمنائیں کرتا کہ

ریاست کی تخلیقی تحریک کی تاکید کی جائے۔یہ تحریک صرف قانونی جوازیت سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور یوں یہ منصوبہ ایک بڑی اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے اور وہ عظیم تر ہے جو اپنے چھوٹے چھوٹے گروپوں کا تعلق اپنے خون کے قرابت داروں سے قائم رکھتے ہیں ہم تو ریاست کے آغاز کے بارے میں اس کے چہرے مہرے، حرکات و سکنات، طور طریقوں اور جسمانی حرکت دینے سے اس کے اصل کی شناخت کر لیتے ہیں۔

اگر ہم ریاست کی پیدائش کے فوری بعد اس کے تاریخی تناظر کا مطالعہ کریں تو ہم اس کے نقش پا اور ترقی کی منزلون کا ایک خاکہ تیار کر لیتے ہیں کہ یہ کئی چھوٹے چھوٹے گروپوں میں موجود ہیں۔ جنگلی سماجی بناوٹ (ساخت) کا اس طرح نقش بنایا جاتا ہے کہ ہر خلیہ (گروپ) اپنے وجود کے اندر ہی زندگانی کرتا ہے اور اس کے ہر خلیہ کی صنف اپنے اندرونی وجود کی یکساں خدمت کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ماضی میں وہ خلیے دراصل جدا جدا رہتے تھے۔ یعنی وہ خود زندگانی کرتے حتیٰ کہ وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کسی قسم کا تعلق بھی نہیں رکھتے تھے اور زندہ رہتے تھے۔ لیکن اس کی انتہائی موثر تنہائی و وحدانی خارجہ زندگی وجود میں آنے میں کامیاب ہوگی اور حتیٰ کہ وہ اپنے لیے بالاخر اقتصادی حلقہ اثر کا قیام عمل میں لایا ہے اور ہر ایک خلیوں (گروپوں) میں ہر فرد اپنے گرددوی میں زیادہ دیر نہیں رہتا اور اس کی زندگانی کا ایک حصہ دوسرے خلیوں کے افراد سے جڑ جاتا ہے۔ جس کے بعد وہ اپنے سے پہلے موجود خلیہ کے ساتھ تجارتی یا ذہنی تعلقات خود بخود قائم کر لیتا ہے۔ اس طرح دو مشترک (باہم) خلیوں کے وجود کے درمیان غیر مساویانہ مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یوں ان کی "اندرونی" اور "بیرونی" کیفیت کے درمیان غیر مساویانہ مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تسلیم شدہ معاشرتی تفاوت ــــ قوانین، رواج اور مذہب یہ "اندرونی" زندگانی کی کریمانہ بخشش ہوتی ہے۔ اور "بیرونی" کو مشکل میں ڈال دیتے ہیں جو کہ تازہ ترین اور کشادہ تر وجودیت ہے۔ ایسی صورت حال میں ریاست کا اصول ایک ایسی تحریک بن جاتا ہے جو "اندرونی" وجود کی سماجی شکل و صورت کو فنا کرنے پر مائل ہو جاتی ہے۔ اور اس کے لیے نئی زندگی میں مناسب سماجی شکل و صورت عطا کرتا ہے۔ اور جو "بیرونی" ہیں ان کی نئی زندگی کے لیے ایک سماجی نظام کا متبادل فراہم کرتا ہے۔ ان اصلی شرائط کو کو اگر یورپ پر لاگو کریں تو یہ استدلالی اظہار یہ اس کی شکل و صورت اور رنگوں پر قبضہ کرلیں گے۔

ریاست کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک چند لوگوں کے ذہنوں نے متوسط زندگی سے ایک روائتی بناوٹ سے دستکش ہونے کے قابل نہیں ہو جاتے۔ کہ ان کی تحریک کی تہہ میں کس چیرپھاڑ کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ یہی وہ آدم زاد ہے جو در حقیقت بالکل واضع اور پاکیزہ ذہن کا مالک ہوتا ہے اور اپنی تہی زندگی میں بھی شکست خوردہ نہیں ہوتا۔ یہی وہ آدمی ہے جو حقیقت میں بالکل صاف ذہن رکھتا ہے۔ آپ بھی اپنے گردوپیش ان لوگوں کو تلاش کریں جو اپنی زندگی میں سے گمشدہ چیزوں کی تلاش میں اس نیند میں چلنے والے آدمی کی طرح جو اپنی اچھی یا بری قسمت کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے اور جسے کسی بات کا شبہ نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ آئندہ چند لمحوں میں کس واقعہ سے دوچار ہوگا۔ یا

اسے نہیں معلوم کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آ چکا ہے۔ آپ خود اس کی باتیں سنیں گے کہ وہ اپنے گرد و پیش لوگوں کے بارے میں باتیں کرتا ہے جس سے وہ اس مسئلہ کے حل کے لیے کوئی خیال اپنے تئیں رکھتا ہے۔ لیکن آپ اس کی باتوں کے خیال کا اگر جائزہ لینا شروع کریں تو آپ کو اس کے دیے گئے حوالہ کی بمشکل سمجھ آتی ہے۔ یا اس کی حقیقت جاننے کا عکس فہم میں نہیں اترے گا۔ لیکن اگر تم اس کی گیرائی اور گہرائی میں جاؤ گے تو تم آسانی سے سمجھ جاؤ گے کہ اس نے اپنے خیالات اور باتوں کو حقیقت کا جامہ یا توازن پیدا کرنے کی رتی بھر کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن اس کے برعکس اس کی باتوں اور خیالات کی روشنی میں اسی فرد نے حقیقت سے اپنی بصارت سے خود کو منقطع کرنے کی سعی کی ہے اور اپنی تہی دامن زندگی سے منقطع کرنے کی سعی کی ہے۔ کیونکہ ابتداء میں زندگی ایک ہیولٰی (مادہ) ہوتی ہے جس میں وہ پوشیدہ رہتا ہے۔ کوئی بھی فرد اس پر شک و شبہ کر سکتا ہے لیکن جب وہ اس خوفناک حقیقت سے دوبدو ملاقات کرتا ہے تو اس سے ڈر جاتا ہے۔ اور خود کو اس کے قوت واہمہ میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے جہاں سے اسے ہر چیز کا عکس صاف دکھائی دے سکتا ہے۔ اسے یہ فکر نہیں ہوتی کہ اس کے "خیالات" صادق نہیں ہیں۔ وہ انھیں اپنے وجود کے دفاع کے لیے مورچہ بندی کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ جس طرح پتلوں سے حقیقت کو خوفزدہ کیا جاتا ہے۔

جس آدمی کا ذہن پاک صاف ہو وہ خود کو اکڑباز یعنی مغرور "خیالات" سے خود کو آزاد کرلیتا ہے اور زندگی کو خود اپنے سامنے موجود دیکھتا ہے۔ اور یہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں موجود ہر چیز مشتبہ ہے۔ اور چنانچہ وہ اپنے خود میں گم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ یہ ایک کھری حقیقت کہ زندہ رہنے کے لیے خود کو گم کرنا پڑتا ہے۔ جو کسی نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے گویا اس نے خود کو پہلے سے ہی پہچان لیا ہے۔ کیونکہ اس نے پہلے سے خود کو پانے کا آغاز کر چکا تھا۔ یہ معاملہ اسی طرح طے پاتا ہے جیسے تیار شدہ جہاز، جبلی طور پر عمل کرتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی تباہ ہونے سے قبل اپنے گرد و پیش کسی نہ کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور وہ بھی اپنے خوفناک المیہ اور اچٹتی نظر سے اپنے گردوپیش دیکھنے کی قطعی سعی کرتا ہے۔ اس کی یہ کوشش بھی مخلصانہ ہوتی ہے کیونکہ یہ بھی اس کی زندگی (تحفظ) کا سوال ہوتا ہے اور یہ اس کی زندگی میں ہیولٰی پیدا کر کے اس کی زندگانی کی ترغیب دیتا ہے۔ یہی وہ مستند خیالات ہیں جو تباہ شدہ جہاز کے پسماندگی کے خیالات ہوتے ہیں اور باقیماندہ خیالات ایک ادنیٰ قسم کا ناٹک، عالمانہ طرز ادا اور اس کے انداز ہوتے ہیں۔ جو حقیقت میں خود کو گم شدہ محسوس نہیں کرتا۔ جنھیں وہ تخفیف کیے بغیر ضائع کر دیتا ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ کبھی خود کو نہیں پاتا اور اپنی حقیقت کے برخلاف معاملہ پر بات کرنا نہیں چاہتا۔ یہ صداقت سائنس کے تمام شعبوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ باوجود یہ کہ سائنس میں بھی زندگی سے فراریت کی فطرت پائی جاتی ہے۔ (سائنسدانوں کی اکثریت نے زندگی کا سامنا کرنے کو خوف سے منسوب کیا ہے۔ کیونکہ ان کے ذہن بھی پاکیزہ نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی بدنام عدم استعداد کسی ٹھوس شکل میں موجود نہیں ہے)۔ ہمارے سائنسی نظریات کی قدر و منزلت اس درجے تک ہوتی ہے جس میں ہم نے خود کو ایک سوال کے سامنے گم

ہوتے محسوس کیا ہے۔ اس کی مبہم فطرت کو دیکھا اور محسوس کیا کہ ہمارے تجرباتی تصورات، ضرب المثال، تحریریں، ضوابط اور لفظوں میں یہ کوئی مدد و معاونت نہیں کرتے۔ جس آدمی نے ایک نئی سائنسی سچائی کو دریافت کیا ہے۔ اس نے ماضی کے تمام علوم کے تمام زرات کو جدا جدا کر کے اس نتیجہ پر آن پہنچا ہے اس نئی سچائی پر آپہنچا جس کے ہاتھوں پر ہزاروں فرسودہ باتوں خونی دھبے یا خونی لکیریں چپکی ہوئی ہیں جن کو اس نے دریافت کیا ہے۔

سیاست سائنس سے زیادہ بڑی حقیقت ہے۔ کیونکہ یہ منفرد صورتوں اور بناوٹوں سے تخلیق کی گئی ہے۔ جس میں آدمی خود اچانک غوطہ لگا کر خود کی پہچان کرتا ہے کہ آیا وہ خود ہے کہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ ایک امتحان ہے جو ہمیں پاکیزہ ذہن اور بھٹکتی روحوں کے درمیان بہتر امتیاز یا خط امتیاز کھینچنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس سلسلہ کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے میں جولیس سیزر کی مشہور زمانہ مثال دیتا ہوں کہ اس نے حقیقت کے ماخذوں تک پہنچنے کے لیے مہیب بزدلی اور پریشانی کے عالم میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ حالت انتشار کے عہد تھے جن میں انسانیت زندگانی کرتی تھی۔ اور یوں محسوس ہوتا کہ تقدیر (مقدر) نے اس پر دباؤ ڈالنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ اسی مقدر نے قیصر (Caesar) کے پہلو کے اندر ایک دانشور سیسرو (Cicero) کو ہم نشین کر دیا۔ اس دانشور آدمی نے اپنی ساری زندگی چیزوں کو گڈ مڈ کرنے میں صرف کر دی تھی۔ چنانچہ قسمت کی یاوری نے جب سیاسی کل پرزوں کو روم سے نکال باہر کیا تو اس کے نتیجہ میں یونانی اور رومی ساز سے شہر روم، اٹلی، سپین، شمالی افریقہ، قدیم رومی اور یونانی ادبیات اور ہیلنی مشرق (Hallenistic east) جدا جدا ہونے کے انجام تک پہنچ چکے تھے۔ اس کے حکومتی اداروں کی خصوصیات جو بلدیاتی نظام سے متعلق تھی شہر روم سے ناقابل علیحدگی سمجھتے تھے اسی طرح جیسے شجر دیوی درختوں کے تلے تحلیل کے درد سے منسلک ہوتی ہے جو اس کی (روم) سرپرستی (اتالیق) کی صورت میں موجود ہوتی ہے۔

جمہوریہ کی خواہ کوئی قسم ہو اور خواہ کوئی بھی اس کا دائرہ ہو اس کی صحت کا دار و مدار بد بخت تکنیکی شرح پر ہوتا ہے یعنی اس کے انتخابی طریق عمل پر منحصر ہوتا ہے۔ اور باقی تمام صنفوں کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ اگر انتخابات میں حکومت کامیاب ہو جاتی ہے۔ اور اگر انتخابات حقیقی ہوئے تو پھر سب اچھا ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو باقی ماندہ کی پرورش (نشو و نما) خوبصورتی سے کی جاتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سب کچھ غلط ہوتا ہے۔ پہلی صدی عیسوی کے آغاز سے روم زور آور (طاقتور) اور دولت مند تھا مگر اس کے مقابل کوئی دشمن نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود قریب المرگ تھا کیونکہ وہ ایک احمقانہ انتخابی نظام پر کاربند اور ثابت قدم رہتا تھا۔ انتخابات اگر غلط طریق پر منعقد کرائے جائیں تو یہ نظام ہی باطل ہو جاتا ہے۔ صرف شہر کے اندر ہی ووٹ ڈالے جاتے اور دوسری ملکی لوگوں کو ووٹ ڈالنے کا حق نہیں تھا۔ بلکہ ان ملکی لوگوں کو انتخابات میں حصہ لینے کا حق بھی نہیں دیا گیا تھا۔ اس رومی دنیا میں لوگ کم اور بکھر کر رہنے پر مجبور ہو گئے۔ اور جیساکہ مستند انتخابات کروانا ناممکن تھا، اس لیے ان کے نتائج میں غلط ردوبدل کیا جاتا۔ انتخابات میں حصہ لینے والے امیدوار اپنے اپنے غنڈوں،

بدمعاشوں، بہادر سپاہیوں اور سرکش کھلاڑیوں کو منظم کر کے دوٹروں (رائے دہندگان) کو ڈرا اور دھمکا کر اپنے حق میں ووٹ ڈالنے کا بندوبست کیا جاتا اور اس طرح کی بدمعاشی کرنے سے وہ کامیاب قرار دیے جاتے۔

جمہوری اداروں کے مستند رائے دہندگان کی تائید لیے بغیر انتخابات کے نتائج کا ہوائی اعلان کر دیا جاتا۔ گویا وہ الفاظ ہوا کی مخلوق قرار دیے جاتے ہیں اور جمہوری حکومت ایک لفظ کے سوا اور کچھ بھی نہ تھی۔ یہ قیصر (Caeser) یا سیزر کا اسلوب بیان ہے۔ مجسٹریٹ کے پاس کوئی اختیارات نہ تھے۔ دائیں اور بائیں کے جرنیلوں میری یوزز اور سلاس (Sullas) ایک آمرانہ نظام میں ایک دوسرے کو خواہ مخواہ پریشان کرتے رہتے۔ یہ وہ قدامت پسند اور ترقی پسند جرنیل تھے جنھوں نے جمہوری حکومت کو ایک حقیر شے بنا دیا تھا۔

قیصریا سیزر نے اپنی پالیسی کی تشریح یا اپنے نظریے کی وضاحت کبھی نہ کی لیکن اس کے باوجود وہ اپنی پالیسی پر عملدرآمد ڈٹ کر کراتا رہا ہے۔ یہ قیصر کی اپنی ذاتی پالیسی نہ کہ قیصریت کا دستورالعمل تھا جو بعد میں شائع ہوا۔ اس میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں بتایا گیا۔ اگر ہم اس پالیسی کو سمجھنا چاہیں تو پھر ہمیں قیصر کی استعداد کاری کو دیکھ کر اس کو کوئی نام رکھ دینا ہو گا۔ قیصر کے اس راز کا اس کے معرکے اور کارناموں کے اس استحصال میں پنہاں ہے۔ "گالش صوبے کے باشندوں کو فتح کرنا اس کی پالیسی تھی" اس مہم کو سر کرنے کے لیے قیصریا سیزر نے اس دستوری طاقت کے خلاف خود بغاوت کرنے کا اعلان کیا۔ کیوں؟ قوت تو جمہوریت پسندوں کے پاس تھی یعنی قدامت پسندوں کے قبضہ میں تھی یہ وہ لوگ تھے جو شہری مملکت/ریاست کے وفادار یا حامی تھے۔ ان کی سیاست کا خلاصہ ان شقوں میں بیان کیا جاتا ہے۔

---

۱) گالز (Gauls) قدیم رومی صوبے کے باشندوں (جن کی کلتی زبان تھی) کو گالشریا گالز کے نام سے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ان کی زبان کلتی اور بڑے ڈھنگے یعنی وکھری ٹائپ کے لوگ تھے۔ (مترجم)

اول روم کی عوامی زندگی میں کھلبلی اور افراتفری اور اس کی کشادگی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ کیونکہ ان لوگوں کا دعویٰ تھا کہ یہ شہر روم اپنی بہت ساری قومیتوں کی وجہ سے ان کے نظام و انصرام چلانے کے ناقابل ہے اور یوں کنٹرول بھی کر نہیں سکتا۔ ہر نئی مہم جوئی عوامی جمہوریہ کے خلاف ایک سنگین جرم ہوتا ہے۔ دوم ریاست کے جمہوری اداروں کو تحلیل ہونے سے بچا کر شہزادگی کے منصب کو اہمیت دی گئی۔ لیکن ہمارے لیے لفظ پرنس رومن زبان کے لفظ پرنسپس کے برخلاف معنوں میں مستعمل ہے۔

اس سے وہ ایک شہر کو خالصتاً" باقی دوسرے شہریوں کی طرح سمجھتا تھا لیکن وہ انتہائی بااختیار ہوتا ہے جس سے وہ مملکتی اداروں کے نظام کو منظم کرتا تھا۔ سیسرو نے اپنی کتاب بعنوان ڈی ری پبلیکا (De Re-Publica) اور سالسٹ (Sallust) نے اپنی یادداشتوں میں قیصر سیزر کے عہد کے سیاستدانوں کے خیالات کا تذکرہ کیا جس کا لب لباب یہ ہے کہ پرنسپس شہری تمام شہریوں کا انچارج ہوتا ہے وہ ٹیکس کی وصولی کرتا اور دیگر تمام اختیارات، سہولتیں اور حقوق رکھتا مگر اعتدال پسند ہوتا تھا۔

قیصر کا تجزیہ قدامت پسندوں کے خیالات کے بالکل مخالف تھا۔ اس نے اپنی گزشتہ فتوحات کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ اپنی مہم جوئی کا سلسلہ جاری رکھے۔ اس کے سوا اس کو کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ جابر ہونے کے ناطے سے مقدر کا سکندر بننے کی راہ پر چل نکلا۔ سب سے پہلے اس نے مغربی علاقوں کے نئے لوگوں کو مسخر کرنا ضروری سمجھا جو مستقبل میں مشرقی حصوں کے فرسودہ لوگوں سے زیادہ اس کے لیے خطرے کا باعث تھے۔ سیزر نے مغربی علاقوں کی وحشی اور سنگدل قوموں کو مکمل طور پر لاطینی بنانے کے عمل کو تیز تر کرنا ضروری خیال کرتا تھا۔

سپینگلر (Spengler) نے کیا خوب کہا "یونانی اور رومی لوگ نظریہ وقت اور نظریہ وجودیت کے قابل نہیں ہیں۔ اس لیے وہ وقت کے دھاروں میں بہہ گئے تھے۔ ان کی ہست و بود حقیقی لمحہ کے قیدی ہیں۔ یونان اور روم کے لوگ مستقبل کی غیر معمولی تاریکی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ وہ کسی چیز کو اس طرح نہیں دیکھ سکتے۔ رنگ ناشناس سرخ کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن دوسری طرف وہ ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں بستے ہیں۔ کوئی کام شروع کرنے سے پہلے آدمی ایک قدم پیچھے ہٹتا ہے۔ اسی طرح جیسے چھپکلی کو مارنے سے قبل کوئی شخص پہلے ایک قدم پیچھے ہٹتا ہے۔ دراصل وہ آدمی ماضی کی دنیاؤں میں خود کا نمونہ تلاش کرنے کے لیے ایک قدم پیچھے جاتا ہے۔ جو خود کی مدنیات میں شامل ہو کر اصلیت میں گر جاتا ہے اور خود کو ماضی کے بہروپ میں غوطہ خوری کا لباس پہن کر حال کے وجود میں ڈبکیاں لگاتا ہے۔ اس طرح اس نیا آدمی کی زندگانی کی تجدید ہو جاتی ہے۔ اسی آدمی کو دقیانوسی سانچا یا ڈھانچا کہا جاتا ہے اور یقیناً" ماضی کے لوگ بھی اسی ڈھانچے میں رہا کرتے تھے۔ لیکن وقت نے اس کو بے شعور ہونے کی دلالت نہیں کرتا۔ اس کا آسان مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی ماضی کا نامکمل، کہنہ مریض اور مستقبل کا کمزور بدن آدمی ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہم یورپی نسل نے ہمیشہ مستقبل کی طرف رخ کیا ہے اور محسوس کیا کہ جوہر میں وقت کا بعد پایا جاتا ہے اور ہم اس "بعد" اور نہ "پہلے" سے شروع کرتے ہیں۔ بہرحال وقت امر ربی ہے اس لیے ہم جب یونانیوں اور رومیوں کی زندگانی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ سب بے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔

اس آدمی نے حال کی ہر چیز کو زنبور سے نتھی کر کے اور ماضی میں اپنا نمونہ باندھنے

کے یہ خبطی ماضی کے ان منفرد آدم زادوں سے لے کر ہمارے حال کے جدید ماہرین لسانیات کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ لسانیات کے ماہر حضرات بھی کیا چیز ہیں جو ہمارے مستقبل سے شناسائی نہیں رکھتے۔ یہ بھی ایک قدم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں اور ہر چیز میں کھری صداقت کی بے مثل کھوج میں ہر دم لگے رہتے ہیں۔ جیسے آج اس نے ہمیں ایک خوبصورت اور پیارا لفظ "سرچشم یا ماخذ" عطا کیا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ قیصر کے اولین سوانح نگاروں نے بھی اس دیو قامت شخصیت کو سمجھنے سے پہلو تہی کرتے ہوئے اسکندر اعظم کے بہروپ اور مفروضوں کی بنیاد بنا کر اس کے نقش کو نقل اتارنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یکسانیت ناگزیر تھی اگر سکندر کو ملتیادیس (Miltiades) کے لارل کا تاج سر پر رکھنے کی فکر میں نیند نہیں آتی تھی تو اس کے مقابلہ میں قیصر کو بھی اپنی پالیسی کے حصول کی خاطر فکر سے رات بھر نیند نہیں آتی تھی کہ یہ بے خوابی کا مریض تھا۔ اسی طرح تاریخ میں اور بھی کئی شخصیات تھیں جن کو اسی طرح کے روگ سے واسطہ پڑا ہے۔ حال میں ایک قدم پیچھے گھوم جانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ نے گذشتہ کل کے نقش پا کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ یہ جدید علم اللسان کے کلاسیکل سوانح نگار کی ایک صدائے بازگشت ہے جو آپ سب کی نذر و نیاز ہے۔

فرض کریں قیصر اس بات کا آرزو مند ہے کہ وہ کوئی ایسا منفرد کام کرے جس طرح سکندر نے کیا تھا۔ تو آپ یقین کریں کہ تقریباً" تمام تواریخ نویس اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہ وہ اس کو قطعی طور پر سمجھنے سے دست بردار ہوتے ہیں۔ قیصر سکندر کا بہت قریبی تضاد تھا۔ عالمگیر شہنشاہیت کا خیال ہی دونوں کو ایک مقام عطا کرتا ہے۔ یہ خیال بھی سکندر کا نہ تھا بلکہ یہ ایرانی خیال ہے۔ سکندر کے خیال نے قیصر کو مشرق کی طرف رجوع کرنے کے لیے برا نگیختہ کیا ہو گا۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ مشرق کا ماضی آبرومندانہ تھا۔ اس کا مغرب کی طرف ترجیحانہ فیصلہ عیاں کرتا ہے کہ وہ مقدونی خیال کی تردید کرنے کا عزم کیا ہوا تھا۔ تاہم عالمگیر شہنشاہیت کا تصور قیصر کے پیش نظر نہ تھا اس کے خیال میں گہری مقصدیت تھی۔ وہ ایک ایسی رومی سلطنت کا آرزومند تھا جو صرف روم تک محدود نہ تھا بلکہ وہ اس کے مضافاتی علاقوں اور صوبوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ جو اس بات کی دلالت کرتی ہیں وہ صرف شہری مملکت/ریاست پر مکمل قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ خیال ایک شہری مملکت کی دلالت کرتا ہے۔ جس میں گوناگوں قسم کے لوگ آپس میں مل کر کام کرتے ہوں اور جس کے نتیجہ میں وہ تمام شہری باہمی اتفاق سے رہیں۔ اس خیال میں کوئی مرکزیت نہیں ہے۔ جہاں کوئی مرکز نہیں جو حکومت کرے ایک مضافات ہو جو اس کے احکامات کو تسلیم کرے بلکہ صرف ایک سماجی تنظیم ہو جس میں ہر ایک شہری ریاست کا ایک سرگرم اور مستعد اور غیر متحرک رعیت رہتی ہو۔ وہ اسی کو جدید ریاست کہتے ہیں اور یہی قیصر کے مستقبل کی فطری اہلیت کی افسانوی آمیزش سے ایک تصوراتی اور مبہم امید لیکن یہی

قیاس رومیوں کی غیر معمولی طاقت جو شہنشاہیت کے برخلاف، امراء طبقہ کی حکومت سے کہیں بلند تر حکومت اور روما کی شہزادگی سے ارفع و اعلیٰ تصور ہے۔ عالمگیر جمہوریہ کی نمائندہ یہ طاقتور انتظامیہ صرف اسی صورت میں شاہی حکومت قائم کی جا سکتی جب اس کی ایک نشست روم سے باہر بھی ہوتی۔ جمہوری یا شاہی حکومت! تاریخ میں دو الفاظ ایسے ہیں جو اپنے معتبر اور مصدقہ ناموں کے معنوں کو ہمیشہ بدلتے رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہر لمحہ موجود کو فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کب تک اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کمزور کر دینے کی کوشش کی جاتی رہے گی تاکہ وہ اس کے اصلی جوہر کے لیے پڑتال کرے۔

قیصر کے ہمراز اور پیروکار، اس کی اہم دستاویزات اور دقیانوسی خیالات کے عالم فاضل شہر روم سے برتر نہ سمجھے جاتے۔ لیکن یہ ایک نیا آدمی، صوبہ جاتی، صاحب عمل، مستعد اور لائق افراد ہوتے۔ اس کے خصوصی وزیر کارنیلس بلبس (Cornelues Balbus) جو کاؤز کا تاجر اور بجیرہ اوقیانوسی ذہن کا مالک تھا اور نئی ریاست کی امیدی کرن انتہائی ترقی یافتہ مگر سست روی سے کام کرنے والے عالم، فاضل اور دانشور ایک قدیم نظریہ کی موجودگی میں وہ کیسے دور افتادہ لاطینیت نظریہ کی جانب جلدی سے وہ کوئی دیوار پھلانگ نہیں سکتے تھے۔ شہری مملکت کا یہ واضح تصور کہ مادہ ہی سب کچھ اور روح مادہ کی پیداوار یہی وہ خاص بات تھی جس سے رومیوں کو اس نئی سیاسی جماعت کا ادراک کرنے سے باز رکھا۔ ان نظریات کے حامل لوگ سے کوئی کیا امید رکھے کہ وہ ایک نئی ریاست کے قیام میں معاون ثابت ہوں گے جب کہ وہ کسی ایک شہر کے سکونتی بھی نہ ہوں؟ یہ کس قسم کی نئی واحدانیت ہے جو اس قدر بلند خیال، مجرد اور کیسی پر اسرار ریاست ہے؟ میں اس کو واضح کرنے کے لیے ایک بار پھر دہراتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے جس کو ہم ریاست کا نام دیتے ہیں۔ یہ انسانوں کے بلا ارادہ قرابت داری کے اتحاد کے نتیجہ میں وقوع پذیر نہیں ہوئی ہے۔ ریاست کا آغاز یوں ہوتا ہے جب گروپ جو قدرتی طور پر منقسم ہونے اور باہمی طور پر رہنے کے احسان مند ہیں۔ یہ ذمہ داری، ہوس پرستی کی نہیں ہے لیکن یہ ایک برا نگیختہ مقصد کی دلالت کرتی ہے۔ یہ یکسانیت کا کام ہے جو ٹکڑے ٹکڑے، جدا جدا گروپوں کے پیش نظر تھا۔ اس سے قبل ریاست ایک ایک عمل اور ایک باہمی پروگرام کا منصوبہ ہوتا اور لوگوں کو اس طرح بلاوا دیا جاتا کہ وہ باہمی طور پر کوئی کام کر سکتے ہیں۔ ریاست کی بذات خود نہ قرابتداری، نہ زبان کا اتحاد اور نہ سرحدی یگانگت اور نہ ہی سکونتی رشتہ داری ہوتی ہے۔ یہ ذرا بھی مادی، غیر متحرک، بے عمل، مضبوط اور محدود نہیں ہوتی ہے یعنی ریاست ایک پاکیزہ نظریہ قواہیت رکھتی ہے۔ یہ مشترکہ طور پر کام کرنے کی خواہشمند ہوتی ہے۔ میں اس بات پر خوش ہوں اور ممنون بھی کہ ریاست کا یہ خیال مادہ (طبعی) سے قانوناً" اور اخلاقاً" بندھا ہوا نہیں ہے۔ ساویدرا فجردوا نے کہا

Scanned by CamScanner

ریاست میں سیاست کی علامت اور ہنرمندی پائی جاتی ہے۔ اس نے ایک تیراور اس کے نیچے یہ کندا کرایا کہ "ایسی بلندی، ایسی پستی" اور وہ اسی کو ریاست کہتے ہیں۔ لیکن یہ ایسا اور قطعی طور پر ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ایک تحریک ہوتی ہے۔ ریاست ہر لمحہ کے بعد نئی چیز میں گم ہو جاتی ہے جو پوشیدہ اور خفیہ رہنے کے بعد حد سے بڑھ کر ظاہر ہوتی ہے اس کی سرحد کا اپنے سند کا پروانہ جواز ہوتا ہے اور اس کے پاس اپنی سرحد کا از خود کوئی پروانہ جواز نہیں ہوتا۔ کسی وقت، کسی موڑ پر اگر ریاست کی واقعتاً" چیر پھاڑ (سرجری) کر دی جائے تو اس سے مشترک (باہمی) زندگی سے تعلق کا سراغ مل جاتا ہے۔ کسی نہ کسی خون کے رشتے داری، زبان کا تعلق یہ اشتراک کی ایک نوع ہوتی ہے۔ اور یہی ریاست کی "قدرتی سرحدات" ہوتی ہیں۔ لیکن سکونیاتی شرح ہمیں یہ کہنے پر ترغیب دے رہی ہے کہ یہی بس ایک ریاست ہے لیکن ہمیں جلدی اس بات کا ادراک ہوا کہ ریاست میں ایک انسانی گروہ دوسرے لوگوں کو مشترکہ طور پر فتح یابی سے اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے اور نئی بستیوں کو اس کے وفاق میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ اس سے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ ریاست ہر گھنٹہ بعد اپنے اتحاد کے طبعی اصولوں سے انحراف کر کے وفاق اور تازہ یا نئی فتح یاب بستیوں اور علاقوں کو اپنے قبضہ قدرت میں شامل کر لیتی ہے۔ اس کی یہ حکمت عملی اس کی صوبہ جاتی اور نئے علاقوں کو وفاق پر شامل کرنے کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئی۔ جو خالصتاً" ایک کھری ریاست ہو گی۔ جس کی یگانگت یعنی اس کی وحدانیت۔ توحید کسی معروضی وحدایت کے ساتھ سازش وغیرہ کر کے خود جانشیں ہو جاتی ہے اور جب اس کی تحریک کے آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ پیش آئے تو ریاست اپنی طبیعت ہی میں اس سے دب جاتی ہے یا مطیع ہو جاتی ہے۔ اس میں جو پہلے سے اتحاد موجود ہوتا وہ اس کی مادی ضرورت ہوتی ہیں اور نسل، زبان اور قدرتی سرحدیں اس کے لیے بے کار ہو جاتی ہیں اور ریاست جدا جدا، ایک ایک، منتشر اور جوہرانا ہو کر رہ جاتی ہے۔

ریاست میں ہر لمحہ کے صرف دو پہلو ہیں: وحدانیت (یگانگت) اور منصوبہ بندی (تجویز) جو اس میں پہلے سے موجود ہوتی ہیں اور جن سے ہم قومی ریاست کے جوہرانا (روح) کو تھوڑا بہت سمجھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ابھی تک ایک قوم کی کامیاب تعریف نہیں کر سکے جس سے اس لفظ کو جدید دنیا میں قبولیت اور مقبولیت حاصل ہوتی لیکن اس شہری مملکت کے بارے میں ایک بڑا واضح خیال تھا کہ جو آنکھوں کو بھی نظر آتا ہے کہ حکومتوں کا نیا اتحاد جرمنوں اور گالز کے اندر سے ظہور پذیر ہوا ہے اور یہ مغرب کی سیاسی القا (فیض) کا مرہون منت ہے جو بہت زیادہ غیر یقینی اور کم دورا نیے کا نظر آتا ہے۔ لسانیات نویس جو آج کا تاریخ نویس بھی ہے اس کی فطرت دقیانوسی ہوتی ہے۔ یوں اس خوفناک حقیقت کی موجودگی میں اسی انجمن میں رہتا ہوں جیسے قیصر ٹیسٹس کو رات

بھر نہیں آیا کرتی تھی۔ انھوں نے ریاستوں میں رومی ریاست کی ابتدائی (فطرتی) سرحدات میں اصلاحات (خصوصاً" اطالوی نقطہ نظر سے) جس طرح ماورائے اپس میں، رائن کے نشرلاضعاء میں جب تبدیلی لانے کی کوشش کی یا اس کی ہسپانوی زبان میں آشکارا کرنے کی سعی کی تھی۔ یعنی وہ اسی لفظ "قوم" کو قدیم دور میں مدنیت کے جین (جراثومہ) خاندان، قبیلہ اور نیشو (Natio) یعنی لفظ قوم کی اصطلاح میں استعمال کرتے تھے۔ بے شک انھیں علم تھا کہ وہ ان میں سے کوئی ایک لفظ کے نام سے مناسبت نہیں رکھتا ہے۔ اس کی وجہ مدنی بھی نہیں ہیں کیونکہ وہ شہر میں نہیں رہتے لیکن پھر بھی اس اصطلاح کو مبہم اور اس کا محدود کشور (علاقہ) کا حوالہ دیے بغیر آگے نہیں جانا چاہیے۔ نیا آدم زاد اپنی اراضی کو بڑی آسانی سے تبدیل کرتا ہے یا کم از کم اس زمین کو کم یا بڑھا سکتا ہے جس پر اس کا قبضہ ہے۔ اس لیے یہ علاقائی یگانگت اور نہ وہ قوی ہوتی ہیں۔ تاہم ہم جس قدر ماضی کے دور دور اندر تک کا جائزہ لیا تو ہمیں نئی ریاستیں ہمیں کسی نہ کسی شکل یا گروہوں میں اور کمال یہ کہ پیدائش سے جدا جدا وجود میں تھیں۔ یقیناً" وہ مختلف نسلی ذخیروں کا مجموعہ ہیں۔ اگر اس میں نسلی، گروہی، علاقائی اور نہ ہی کوئی فطرتی تعلق ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوم کیا چیز ہے؟ میں نے ہمیشہ کی طرح اس سوال کو بھی حقیقتوں اور صداقتوں کی چابی لگا کر عقدہ کشائی کی ہے۔ یہ کیا چیز ہے۔ اس کو ہم واضح طور دیکھ لیتے ہیں جب ہم کسی جدید قوم کے ارتقاء کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مثلاً" اس وقت یہ تین جدید ریاستیں فرانس، جرمنی اور اسپین کیا چیزیں ہیں؟ یہ سوال بھی ایک وقت اور ایک قومی رنگ کو واضح کر کے اس کے مقام کا تعین کرتا ہے۔ لیکن بعد کی تاریخ میں کسی اور وقت اس کے قومی رنگ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ پہلے قوم ایک قبیلہ نظر آتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کوئی قوم نہیں ایک قبیلہ نظر آتا ہے۔ تب جا کر دو قبیلوں (خاندانوں) کے پہلو میں ایک خود ساختہ "قوم" کا لفظ تشکیل پاتا ہے۔ پھر اسی قوم کے دو ساختہ قبیلے ہوتے ہیں بعد میں یہ ایک اقلیم بن جاتی ہے پھر اس کے بعد بھی ایک ملک بن جاتا ہے۔ جیسے ڈیوک کا ملک یا جسے روحانی سلطنت بھی کہا جاتا ہے۔ لیون (Leon) ایک قوم لیکن قستالیہ قوم نہیں ہے۔ اس طرح لیون اور قستالیہ یکجا ہوتے ہیں لیکن اراگون (عنکبوتی) نہیں ہوتے۔ یہاں دو قسم کے اصول نمایاں نظر آتے ہیں۔ اول۔ ڈیوک کا ملک، قبیلہ، علاقہ، زبان یا لہجے آپس میں باہمی رنجشوں کے باعث تواتر سے ایک دوسرے کو ہجرتوں پر مجبور کر دیتے رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے علاقے اور تخت و تاج چھین لیے جاتے ہیں اور خود مسند نشیں ہو جاتا ہے۔ دوسرا اصول مستقل ہوتا ہے کہ یہ تمام سرحدوں کو پھلانگتا ہے اور مشروط طور پر تقرریاں کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی متحدہ جماعت ہوتی ہے۔ قصہ مختصر کہ جیسے پہلے اصول میں فطرتی پہلو کی بنیاد کو جانچا گیا۔

علم اللسانیات۔ یہ میرا نام ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے منسوب کیا جاتا ہے جو آج

"تاریخ نویس" کے خطاب سے نوازے گئے ہیں یا پھر خود ساختہ دعویدار ہیں۔ یہ ایک احمقانہ اور مسرت بخش کام کرتے ہیں۔ جب انھوں نے تاریخ کے عصری دورانیے اور خاص طور پر گذشتہ دو تین صدیوں میں مغربی قوموں نے اس مفروضہ پر کام شروع کر دیا ہے کہ ورسینگٹاریکس (Vercingetorix) یا سڈ کیمپیڈر Cid Campeader پہلے ہی سے فرانس کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ وہ سینٹ مالو سے لے کر سٹراسبرگ (Strasburg) تک اپنی زمینی علاقہ کو وسعت دینا چاہتے تھے یا پھر سپین کو فیسٹرری سے لے کر جبرالٹر تک اپنے زمینی علاقوں کو بڑھانا چاہتے تھے۔ صاف گو ڈرامہ نویس کی طرح لسانیات کے ماہر نے بھی آج کل اپنے بہادروں کے جنگوں کے دورانیہ کو کم کر دیا ہے۔ سپین اور فرانس کس طرح وجود میں آئے یہ سمجھنے اور اس کی تشریح کرنے کے لیے ہمارے ماہرین یہ فرض کرتے ہیں کہ سپین اور فرانس قدیم تاریخ سے قبل اپنی جدا جدا وحدانیت کی طرح ایک ہسپانوی اور ایک فرانسیسی کی روح میں پہلے سے موجود تھا اور جیساکہ سپین اور فرانس کے وجود میں آنے سے قبل بھی کوئی فرانسیسی اور ہسپانوی وہاں موجود فرض کر لیتے ہیں اور جیساکہ فرانسیسی اور ہسپانوی سیدھی سادی شے نہیں تھے اس لیے ان دونوں کا سراغ لگانے کے لیے ان کے مدت ارتقاء کو دو ہزار سال قبل تاریخ کے پتھروں کو ہتھوڑے سے کوٹ کوٹ کر مشقت کرنے کے دعوے کو فرض کر لیتے ہیں۔

آسان اور سادہ صداقت یہ ہے کہ جدید قومیں وقت کی متحرک اصول کے زقند لگانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ "دائمی" کو ہٹا کر خود جنم لینے کا عمل کیا ہے۔ ظاہر ہے اب یہ اصول نہ نسل کا اور نہ زبان کا ہے بلکہ فرانس اور سپین کی نسل اور زبان کی تاثیر نہ کہ ایک ریاست میں اتحاد کا سبب ہے۔ اس لیے اس وقت کا یہ اصول "فطرتی سرحد" کی پیدائش کرتا ہے۔ اس سبب کے باعث سفارتکار کو خطرہ ٹلنے کا اشارہ مل جاتا ہے کہ وہ اپنی استعداد کے پھندے کو فطرتی سرحدات کے خیال کو اس طرح منطبق کرے جیسے اس کی دلیل نے بہت دور کی نسبت کو لاگو کیا تھا۔ لیکن تاریخ نویس خود کو اس چلمن کی اوٹ کے پر محفوظ نہیں کرتا بلکہ یہ ایک بار پھر ایک مستقل قلعہ بند ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ درحقیقت یہ مستقل یکر نہیں ہے اور نہ ہی یہ ایک مخصوص حکم کی تعمیل کرتا ہے۔

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ سوال کیا ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ ہم اب بھی اس بات کا سراغ پانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قومی ریاست کیا ہے اور آج ہم اس ایک قوم سے کیا مراد لیتے ہیں اور یہ کسی دوسری ریاست کی نوع سے کسقدر نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہ کیسے شہری مملکت یا کسی اور قطعی نوعیت کی بعید ترین نوع سے کس قدر امتیازی حیثیت پر قدرت رکھتی ہے۔ مثلاً" آگسٹس (Augustus) نے سلطنت کو کیسے سانچے (ڈھانچے) میں ڈھالا تھا۔

۱۔ یہ بہت مشہور ہے کہ آگسٹس کی سلطنت کو اس کا لے پالک پادری قیصر کی مملکت کی ضد میں وجود میں لایا تھا۔ لیکن ہمیں تو آگسٹس پومپئی Pompey کے نقش قدم پر چل کر اپنی سلطنت کے لیے "لکیریں" کھینچتا نظر آتا ہے۔ یہ وہی آگسٹس ہے جو قیصر کے دشمنان میں سے ایک تھا۔ اس سلسلہ میں جو اعلیٰ کتاب اس وقت دستیاب ہے وہ ای میئر (E Meyer) کی کتاب بعنوان "دی منارکی آف سیزر اینڈ دی پرنسی پیٹ آف پومپئی (۱۹۱۸ء) یعنی "سیزر کی قیصریت اور پومپئی کے اصول ۱۹۱۸ء دستیاب ہے۔ یہ ایک اچھی کتاب ہے لیکن مجھے یہ ناکافی لگتی ہے۔ کیوں کہ اس نے مجھے ورطہ حیرت میں بھی نہیں ڈالا اور یہ بھی ایک حقیقت کہ آج کے دور میں وسیع النظر اور مستند تاریخ نویسوں کی خشک سالی (قحط) ہے۔ میور کی یہ کتاب مومسن کی کتاب کے متضاد رقم ہے۔ میور ایک خوفناک تاریخ نویس ہے۔ جس نے قیصر کو ایک قطعی شخصیت میں تبدیل کرنے کا جواز فراہم کیا ہے۔ میرے نزدیک مومسن نے قیصر کی پالیسی کے جوہری مواد کو میور سے حاصل کیا تھا۔ مومسن دنیا کے مستقبل کے بارے میں واضح نظریہ رکھتا تھا۔ (مترجم)

اگر ہم اس مقدمہ کو واضح اور مختصراً" بیان کرنا چاہیں تو اس کو ہم یوں بیان کرنا پسند کرتے ہیں۔ جیساکہ ہم جانتے ہیں کہ فرانس، انگلستان، سپین، اٹلی اور یا جرمنی میں ایسی کونسی قوت (طاقت) کارفرما ہے کہ جس نے ان ممالک کے کروڑوں انسانوں کو عوامی حکومت کے تحت باہمی طور پر رہنے کے لیے کیوں ثمر آور کیا ہے؟ جبکہ یہ کوئی ماضی کی نسلی جماعت یا گروہ نہیں تھا کیونکہ ان ممالک کی اجتماعی حکومتوں میں سے ہر ایک حکومت نے غیر موافق نسلی ندیوں سے اپنے جوہرانہ مادے ذخیرے کیے ہوئے ہیں اور نہ ان کی کوئی لسانی وحدانیت ہے کیونکہ ان ممالک کے عوام الناس آج بھی اپنی اپنی ریاست میں مشترکہ طور پر رہتے ہیں۔ اپنی اپنی زبانوں میں بولتے اور لکھتے ہیں اور مزید برآں یہ کہ وہ اپنی اپنی نسل اور زبان میں یکسانیت سے شاداں اور نازاں ہوتے ہیں۔ اگر یہ تمام اجزاء خوشی اور مسرت کا باعث ہیں تو پھر یقیناً" ماضی کے مختلف سیاسی اتحاد یا وحدانیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی یہ قومیں سچ ثابت ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے نسل اور نہ زبان نے قومی ریاست کو جنم دیا۔ جبکہ یہ ان کی قومی ریاستیں ہی ہیں جو کئی خون کے سرخ جسموں اور حرف بہ حرف اپنی اپنی بولی کی آوازوں کے اختلافات کو یکسانیت عطا کرتی ہیں۔ اس طرح یہ عمل صدیوں سے نافذالعمل ہے۔ یہ شاذ و نادر ہوا کہ ریاست کے ماضی کی نسل اور زبان نے اتفاقاً" شناخت کیا ہو۔ آج سپین قومی ریاست نہیں ہے کیونکہ ہسپانوی زبان پورے ملک میں بولی جاتی ہے۔ اور نہ آراگون اور کٹالونیہ قومی ریاستیں تھیں کیونکہ اس

کی ریاستوں میں کسی خاص عہد میں اور کسی خاص علاقوں کے اقتدار اعلیٰ کو اس کی خاص علاقائی حدود تک پابند کیا جانا پسند کیاجاتا تھا۔ کیونکہ قتالون آراگون کے باشندے اتفاقاً" اور اپنی اپنی ایک ہی بولی بولتے تھے اس طرح ہم اس سچائی کے بہت قریب پہنچ جاتے ہیں اور اگر ہم استدلالی لفاظی سے موافقت پیدا کرلیں تو ہماری لہر ایک سچائی کشادہ دلی کی دعوت فکر دیتی ہے۔ اسی لیے ہم اس مفروضہ کو پیش کرنے کے لیے آمادہ ہیں کیونکہ ہر ایک لسانی وحدت کسی ایک علاقہ کو کسی حد تک اپنی آغوش میں لینے کا آورش رکھتی ہے۔ یقیناً" پھر اس کی وحدت (یگانگت) ماضی کے کسی عہد میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔

یہ ریاست ہمیشہ سے ایک رہبر یا کارندہ کی حیثیت سے چلی آتی ہے۔ یہ ماضی کی نسبت زیادہ طویل دورانیے کو ظاہر کرتی ہے جو کہ نسل اور زبان کو قوم پرستانہ جذبات کی بنیاد کو تسلیم کرنے کے لیے عجیب و غریب قسم کی سرکشی تواتر کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ اس قسم کے گمان اور قیاس میں میں بہتّ زیادہ ناسپاسی اور بے ربط تضاد محسوس کرتا ہوں۔ کیونکہ ایک فرانسیسی ایک حقیقی فرانس اور اسپین کا ہسپانوی دونوں اپنے ملک کے بنیادی قوانین کے دسویں حصے کے بنیادی قانون کے پابند ہوتے ہیں۔ جن کے ترنگ کو تنگ نظر جماعت یا گروہ،کی نسل اور زبان کی بنیاد کو زبردستی ہٹا کر جگہ حاصل کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اس استدلال کی روشنی میں فرانس اور سپین ایک دوسرے کے بعد کے نتیجہ میں تشکیل پاتے ہیں۔

میرے ذہن میں بھی اس سے ملتا جلتا ایک خیال ابھرتا ہے کہ جب ایک قوم کے خیال کی بنیاد کو ایک علاقائی شکل میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس سے وحدت کے اصول کا سرچشمہ نظر آتا ہے جو نسل اور زبان کو جغرافیائی عرفان میں "قدرتی سرحد" کی لکیریں کھینچنے میں معاونت کرتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اس وقت اسی فریب نظر خیال کا سامنا ہے۔ اصل واقعات کا اندیشہ ہمیں یہ آگاہ کرتا ہے کہ نام نہاد قومیں براعظم کے وسیع و عریض علاقوں یا اس کے مدمقابل جزیروں اور عام زمینوں پر ضابطہ تحت کے مطابق حدود کا تعین کیا جاتا ہے۔ ان اصلی سرحدوں کے غور و فکر کے نتیجہ میں ان کو مستقل اور روحانی طور پر قبول کیا گیا ہے۔ کیونکہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ قدرتی حدود ہیں اور ان کا "قدرتی عمل دخل" ہماری اس گواہی کی سچائی کی دلالت کرتا ہے کہ اس نوع ارضی نے تاریخ کا یہ جادوئی فیصلہ سنایا ہے۔ لیکن یہ فرضی داستان اس وقت غائب ہو جاتی ہے جب نئی استدلال کسی قبیلہ کی نسل اور زبان کے قومی منتظمین کو باطل قرار دینے کے لیے درخواست کرتے ہیں۔ اگر ہم ایک بار پھر ماضی کی چند صدیوں کے مطالعہ پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں آشکارا ہوا کہ فرانس اور سپین نے ایک دوسرے سے فروتر ہو کر "قدرتی حدود" کے ناگزیر ڈھانچوں (سانچوں) میں سرائت کر کے ایک ایک اکائی بن گئی ہیں۔ خدا کرے پہاڑوں کی ان حدود کے مقابلہ میں الپس یا پائیرنیز' دریائے کاڈیم' رود

بار انگلستان اور جبرالٹر کی اُبناؤں سے کم پرسکون نہ ہوں۔ دراصل ثابت یہ کرنا مقصود ہے کہ حدود کی برجستگی (ہمواری) کا یہ صرف قرب ہے۔ جو عہد کے تدبر کی اقتصادی اور اکڑفوں ہونے پر منحصر ہے۔ "قدرتی سرحد" کی معروف تاریخی صداقت اس کے ہست و بود میں موجود ہے۔ کیونکہ (الف) یہ لوگوں کی وسعت کی مزاحمت کرتی ہے کیونکہ لوگوں کے سمجھنے کی قوت اہلیت سے باہر ہوتی ہیں۔ (ب) کیونکہ یہ ایک قابل فہم رکاوٹ ہے۔ کیونکہ یہ عوام الناس کے ہست و بود میں مشترک پائی جاتی ہیں یا جنگجویانہ طریق عمل میں باہم ہوتی ہیں۔ کیونکہ الف ب کا دفاع کرتا ہے۔ "قدرتی حدود" تب سے پہلے فرض (قیاس) کرتی ہے۔ جیسے کوئی چیز اپنی حد (سرحد) سے بھی زیادہ قدرتی ہے۔ جس سے لوگوں کے درمیان پائی جانے والی وسعت کے احتمال یا امکان پذیری اور بے حد اتحاد (وحدت) میں بے حد اتفاق پایا جاتا ہے۔ عوام الناس تو بس ایک مادی رکاوٹ ہوتی ہیں جو اس کی جانچ پڑتال کرتی ہے۔ گزشتہ کل اور اس سے قبل کل کی حدود آج ہم پر عیاں کرتی ہیں جس طرح فرانسیسی یا ہسپانوی قوم کی مستقل بنیاد ہمیں کچھ بھی آشکارا نہیں کرتی۔ لیکن اس کے برعکس ہمیں رکاوٹیں ہمیں ضرور نظر آتی ہیں جو قومی خیال کے اتحاد کے عمل میں رکاوٹوں سے ہمکنار ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود ہم آج کی حدود کی بنیادی اور قطعی عمل کی تصویر کشی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ نقل و حمل اور جنگ و جدل (نبرد آزمائی) کے نئے طریقوں نے بہ مثل رکاوٹوں کے ان کی تاثیر کو فسخ کر دیا ہے۔

امابعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قومیتوں لی پیدایس میں حدود نے کیا کردار ادا کیا جبکہ اس نے اس کے مستقبل کی بنیادی ساخت میں کوئی مثبت یا کوئی قطعی کام نہیں کیا؟ اس کا جواب واضح ہے اور اہم اہمیت کا حامل ہے کہ اس قومی ریاست کے مقابلہ میں شہری مملکت کو لاکھڑا کرتے ہیں اور وہ کونسا اہم اور مستند خیال اس کے پس پردہ کار فرما سمجھتے ہیں؟ جبکہ قدرتی حدود نے ہمیشہ ہر سطح اور ہر مقام پر اور اپنے پہلے تمام عملوں سمیت سیاسی اتحاد کو منظم اور مضبوط کرتی ہیں۔ بدیں وجہ وہ قوم کے نقطہ آغاز میں شمار نہیں ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ اس کی پیدائش میں ایک رکاوٹ تھی اور اس کے بعد جب غلبہ پا لیا جاتا ہے تو پھر وہ اس مضبوط اتحاد کے لیے ایک مادی ذریعہ بن جاتی ہیں اور بالکل اسی طرح نسل اور زبان بھی اسی قسم کا کردار ادا کرتی ہیں۔ بہرحال ان میں سے کوئی بھی قدرتی جماعت نہیں ہوتی جس نے قوم کا تعین کیا ہے جبکہ قومی ریاست نے خود روئیدگی میں طاقت کو مضبوط کر کے اس کے اتحاد کی طرف کوششیں کی ہیں جس کے قبیلوں اور زبانوں کی تکثیریت نے اس کی رکاوٹوں کی صورت میں اس کی مخالفت کی ہے۔ اس طرح ایک بار پھر مستعدی سے ان پر غلبہ حاصل کر لیا تو قبیلوں اور زبانوں کی متناسب اتحاد (وحدت) کو کامیاب اور مضبوط کیا ہے۔

امابعد اس کے لیے ادھر کرنے کے لیے کچھ نہیں رہتا بجز اس کے کہ وہ روایتی غلط فہمی

جو قومی ریاست کے خیال سے منسلک ہو گئی کو دور کرے اور خود کو خوگر کرنے پر غور کرے جیسے قومیتوں کے لیے بنیادی رکاوٹیں یعنی یہ کہ وہی تین چیزیں جس میں یہ خیال متجانس ہو گیا تھا۔ (بلا شبہ اس غلط فہمی کو پاش پاش کرنے میں یہ میں خود ہوں جو اس ایک اذیت اور کرب سے گزر کر اس حقیقت کو آشکارا کر رہا ہوں) قومی ریاست کے گم شدہ راز تلاش کرنے کے لیے پہلے ہمیں اپنے ذہنوں کو اچھی طرح تیار کر لینا چاہیے اور پھر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس ریاست کے مخصوص القا یا فیض کیا ہیں۔ ظاہر ہے یہ اس کے خود کی پالیسی ہوتی ہے اور ہمیں اس کے غیر متعلق خارجی اصولوں کی خوبیوں میں حیاتیاتی اور جغرافیائی نہ ہونے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔

آخرکار جدید قومیتوں کی حیران کن حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہمارے لیے یہ سوچنا ضروری ہو گیا ہے اور یہ خیال کرنا کیوں ضروری ہوا کہ نسل، زبان، علاقہ (کشور) پر توجہ دی جائے؟ اس کا آسان جواب ہے کہ فرد اور عوامی حکومت کے مابین گہری دوستی اور مشترکہ طور پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ یہ وہی عوامی حکومت ہے جس سے قدیم زمانوں کی ریاست ناواقف ہے۔ ایتھنز میں اور روم میں صرف محدود بے چند افراد کی ریاست تھی ان حاکموں کے علاوہ باقی سب غلام، اتحادی، صوبہ جاتی اور نو آبادیات کی رعایا ہوتے تھے۔ انگلستان، فرانس اور سپین میں کسی بھی ریاست کی کوئی رعایا نہیں ہوتی تھی۔ لیکن پھر بھی اس میں شرکت کرنے والے چند اشخاص ہونے اور ہر ایک کے ساتھ ایک ایک غلام ہوتا تھا اور اس کا نظم و نسق چلانے، عدل گسترانہ کرنے اور ان کا آپس میں اتحاد برقرار رکھنے کے لیے اور تعلق قائم رکھنے کے لیے ریاست کے ساتھ مختلف ادوار اور مختلف اوقات میں مختلف ہوتا تھا۔ عہدہ اور ذاتی مقام و مرتبہ کا لحاظ ”بستا“ مراعات یافتہ اور ”بستا“ غیر مراعات یافتہ طبقوں میں خط امتیاز کا خیال رکھا جاتا تھا۔ لیکن اگر ہم ماضی کے ہر عصر کی سیاسی صورت حال اور نہایت ہی عام اور موثر صورت حال اور اس کی روح دوبارہ مطالعہ اور شرح کریں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ ہر ایک فرد ریاست کا ایک مستعد رعیت، اجلاسوں میں شریک ہونے والے چند افراد اور محنت و مشقت کرنے والے عوام الناس نظر آتے ہیں۔

ماضی کی ریاست کی کوئی ایک قسم یا شکل و صورت خواہ وہ قدیم، قرون وسطیٰ یا جدید عوامی گروپ یا جماعت ہو سب نے منجملہ بعد میں آنے والی جماعتوں اور گروپوں کو مشترکہ طور پر کار اہم کرنے کی دعوت فکر دیتے رہے ہیں۔ یہ کار اہم خواہ یہ دو فریقین کے مابین صلح کرانے والا ثالث ہی کیوں نہ ہو وہ اپنا فیصلہ اس طرح کرے گا کہ آئندہ مستقبل میں کسی منتظم ثالث کو اس کے قدیم فیصلہ کی روشنی میں فیصلہ کرے۔ ماضی میں اس قسم کے کیے جانے والے فیصلے مستقبل کے تمام گروپوں اور جماعتوں کی باہمی زندگی کے لیے کچھ نہ کچھ اپنا اپنا حصہ منتقل کرتے رہے ہیں۔ مثلاً ”ریاست کے وجود

کا منصوبہ یا انسانوں کو مستعد رہنے اور ہدایات کا پروگرام یہ سب کچھ جدا ہونے والی اصلاحات ہیں۔ ریاست کی بے شمار انواع مختلف طریقوں سے پیدا کی جاتی ہیں جس میں موئید گروپ دوسرے گروپوں سے ہمکاری (رفاقت) کرنے کے میدان عمل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ پرانی ریاست اپنی ہمعصر ریاستوں کے ساتھ مشترکہ طور پر رہنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی ہیں۔ روم صرف اطالویوں اور صوبوں پر حکومت کرتا اور تہذیب کی تعلیم دیتا تھا۔ لیکن اس نے ان کو اپنے ساتھ ملانے کی یعنی اپنے ساتھ اتحاد کرنے پر کبھی ترغیب نہیں دی۔ اسی انداز میں شہر میں بھی شہریوں کو بھی سیاسی اتحاد نہیں کرنے دیتا تھا۔ یہ بھی نہ بھولیے کہ اس جمہوریہ میں شہر روم ایک نہیں بلکہ دو شہر روم تھے۔ یعنی سینٹ اور شہری۔ سلطنت روم نے صرف ان دو گروپوں سے اپنا اتحاد قائم رکھا اور ان دونوں کو آپس میں میل جول پیدا کرنے کی کبھی اجازت نہ دی جس کی وجہ سے یہ دونوں گروپ ایک دوسرے کے لیے اجنبی کے طور پر زندگی کرتے تھے۔ طرفہ تماشا یہ ہوا کہ جب روم کی سلطنت کو خطرہ لاحق ہوتا اور دھمکی دی جاتی تو یہ سلطنت تنہا ہو کر رہ جاتی۔ اسی ریاست کے دوسرے محب الوطن لوگ اس کو اپنے معیار پر پورا نہ اترتے ہوئے دیکھ کر اس کو گھاس بھی نہ ڈالتے تو ایسی صورت حال میں تن تنہا اپنی سینٹ کی بیوروکریسی اور فوجی مہروں کو حرکت میں لاکر اپنا دفاع کرتی تھی۔

یونانی اور رومن گروپوں کی نااہلیت اور ناقابلیت کے بے شمار اسباب قلمبند کیا جا سکتا ہے لیکن صرف ایک نقطے میں ایک سبب کا خلاصہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو یہ ہے کہ ریاست بھی عین فطرت کے مطابق حاکموں اور رعیت میں دوئیت کی فطرت کی بنیاد پر یکساں اور بیک وقت ہم وجود رہتی ہے۔ دراصل یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں یعنی عامل اور رعایا اور حکومت کرنے کا صرف حق روم کو حاصل تھا اور باقی سب کو اطاعت شعاری کے پابند تھے۔ عوام الناس اطاعت کرنے کے لیے ہوتی ہے نہ کہ حکومت کے فرائض ادا کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نظریے اور طریقے سے ریاست کو فن ثمربانی کی مادی شکل میں بدل دیا گیا اور شہری جماعتوں (گروہوں) کو طبعی طور پر دیواروں کے اندر تک محدود کر دیا گیا۔ لیکن حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ نیا عوام کی وقوع پذیری ہی نے ریاست کے ایک کم تر مادی شکل کی تشریح کی ہے۔ جب یہ ایک اہم مشترکہ منصوبہ ظہور پذیر ہوا تو اس کی حقیقت بالکل متحرک ہو گئی اور کچھ نہ کچھ کرنے ہمہ وقت کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ اس طرح جماعت کا مستعدی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس تجویز یا رائے کو ہر ایک ریاست نے اپنا ایک حصہ تصور کیا ہے۔ یہ ایک سیاسی رعایا ہوتی ہے جو اپنی نسل، خاندان، جغرافیائی حالت اور معاشرتی طبقات کی ہر چند مدد کرتی ہے۔ لیکن یہ تمام انواع ثانوی طور پر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ ماضی کے کسی گروہ یا جماعت کی طرح نہیں ہوتے جو اپنی قومیتی حیثیت اور حقیقت کو سینہ بہ سینہ محفوظ کرتے ہیں اور نہ یاد کرتے

ہیں۔ قصہ مختصر کہ یہ حقیقت اٹل اور ناقابلِ تبدیل ہے جو اپنی سیاسی رفاقت داروں کو اعزازات اور خطاب بھی عطا کرتی رہتی ہے۔ لیکن دوسری طرف قبیلوں کو ایک واضح اور شفاف مستعدی عمل پر گامزن کر دیتی ہے۔ اور ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ہم گذشتہ کل میں کیا نہیں تھے۔ ادھر ہم مستقبل کے کل میں سب کچھ کرنے کے لیے بالکل تیار بیٹھتے ہیں اور یوں ہم سب مل کر یگانگت کے ساتھ ریاست کے اندرونی ڈھانچہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ریاست جس آسانی اور آرام کے ساتھ اور سیاسی اتحاد کے ہمراہ مغرب کی تمام حدود قیود پر زقند لگاتی ہے اور خود کو اپنی پرانی ریاست میں بند کر لیتی ہے۔ اسی طرح یہ آدمی یورپی نسل کی تمام انسانی انواع کی پارینیت یا دقیانوسیت کے درمیان پائی جانے والی تفاوت کے باوجود زندگانی کرتا ہے۔ یہ وہی نیا آدمی ہے جس نے مستقبل کا سامنا کرنا ہے جو شعوری طور پر زندگانی کرتا ہے۔ اس کے اس موقف کی وجہ سے چنانچہ یہ نیا آدمی اپنے حال کے چال چلن سے متعلق بھی فیصلہ کرتا ہے۔

اس طرح کا سیاسی رجحان وحدتوں کی وسعت کو مزید ترقی دینے میں عین فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ کیوں کہ اس کے انحراف میں کوئی اصول بھی کار فرما نہیں ہوتا۔ اتحاد میں وسعت لامحدود ہوتی ہے اور یہی کشادگی ایک عوام کی پذیرائی دوسرے عوام تک محدود نہیں کرتی۔ بلکہ اس کے اتحاد کی وسعت میں قومی ریاست کی خصوصیات کو اور نمایاں طور پر عیاں کرتی ہے۔ مختصراً" یہ کہ تمام معاشرتی طبقات ہر ایک سیاسی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جس طرح قوم اپنی نسلی اور علاقائی وسعت کا پھیلاؤ کرتی ہے اس طرح اندرونی رفاقت میں مزید اتحاد پیدا ہو جاتا ہے۔ قومی ریاست بنیادی طور پر جمہوری ہوتی ہے۔ یہ اپنے تمام فیصلے خود کرتی ہے اور عقلمندی سے کرتی ہے اور حکومت کے کئی اقسام کے فیصلوں سے کہیں بہتر طور اور فیصلہ کن فیصلے کرتی ہے۔

ریاست یہ مشاہدہ یا مطالعہ کرنے کے لیے اس وقت ضرور متجسس ہوتی ہے جب قوم ماضی کی کسی جماعت کی کسی مثال کو بنیاد بنا کر کوئی حد کا تعین کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت عوام ریلنن (Renon) کے بہترین پالیسی فارمولا کو ہمیشہ سے تسلیم کرتے ہوئے اور اس پر عمل کرتے ہوئے اس کو ختم کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس میں نسل، زبان اور مشترکہ وراثتی روائتیں اس کے اندر کے وجود میں ہوتی ہے اور ہمیں ایک اور وصف جو بتایا گیا ہے کہ یہ روزمرہ کاموں کی براہ راست رائے شماری بھی کراتی ہے۔ لیکن کیا اس اظہاریے کا مطلب واضح طور پر آشکارا ہوا ہے؟ اور کیا اب ہم ریلنن (Renon) کے تجویز کردہ کے اشارہ کے مخالف تعبیر نہیں کر سکتے خود اس سے بھی زیادہ حقیقت پسندانہ ہے؟

ماضی کی مشترکہ عظمتوں کے خاص رشتہ سے منسلک رہنا، حال میں مستقبل کے لیے

خصوصی استعداد کار رکھنا' مشترکہ طور پر اعلیٰ اور غیر معمولی قدروں کو یکجا رکھنا' یہ تمام ضروری شرائط اور قول و قرار کے نتیجہ سے عوام کے ظہور کا زمانہ وجود میں آتا ہے۔ ماضی میں عوام کی میراث کے نشان اور بزرگی کی شان کبریائی اور پچھتاوے اور مستقبل میں بھی یک جان اور دو قالب کے مصداق اپنے پروگرام کو آخری دم تک جاری رکھنے کا عزم اس طرح یہ تمام عناصر یک جان ہو جاتے ہیں تو ایک قوم وجود میں آ جاتی ہے۔ یوں اس کی روزانہ کی براہ راست رائے شماری کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس قسم کی مصروف شرح ر ینن (Renon) نے کی ہے۔ ہم اس کی غیر معمولی کامیابی کی کیسے توضیح کریں؟ بلاشبہ اس کی آخری ضرب المثل ایک خوش وضع مرکز کے گرد گھومتی ہے۔ یہ خیال کہ قوم روزانہ براہ راست استصواب رائے کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔ ہمیں آزاد کرانے کے عمل جراحی میں کام آتی ہے۔ نسل' زبان اور مشترکہ ماضی کے سکونیات' مہلک' کرخت' غیر متحرک اور ست روی سب اس کے اصول ہوتے ہیں اور یہ سارے اس کے اصول اس کے قید خانے ہوتے ہیں۔ قوم اگر ان اصولوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ کوئی نہ کوئی چیز ہماری پشت پر موجود ہے یعنی کوئی ایسی چیز جس کے ساتھ ہمارا بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر قوم ایک چیز ہے اور کوئی ایک اور کوئی نہیں ہے کہ کوئی ایک کام کرتا ہے جب اس پر حملہ کیا جاتا ہے تو اس کو اپنے دفاع کے لیے اپنی کوئی حس آوری بھی نہیں ہوتی ہے۔

ہم اسے پسند کریں نہ کریں یہ حقیقت اپنی جگہ کہ انسانی زندگی مستقبل کے ساتھ ایک تسلسل کا تعلق اور استغراق رکھتی ہے۔ اس خالص لمحہ موجود میں ہم آئندہ کے لمحہ کے لیے پریشان رہتے ہیں۔ اس لیے جیتی جاگتی زندگی ہمیشہ اضطراب کے انجام تک پہنچنے کے لیے بے چین رہتی ہے۔ پھر یوں کیوں نہیں محسوس کیا جاتا کہ یہ تمام عمل پذیری کرخت اور سخت مستقبل میں کچھ کرنے کے عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی دلالت کرتی ہے؟ اس سوال میں یہ مقدمہ بھی شامل ہے جس کو ہم نے جان بوجھ کر بیان نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم یہاں صرف ایک یادداشت کو ایک بار پھر واضح کرنا چاہتے ہیں جو کسی چیز پر تاثیر رکھتا ہے اور لمحہ موجود کی پیروی کرتا ہو خواہ یہ حیات نو کا ایک خوشگوار لمحہ ہی کیوں نہ ہو یا ماضی کا کوئی خوشگوار لمحہ ہو' بہرحال اس لمحہ موجود میں اس باحیا' منکسرمزاج اور مخفی خوشی نے خود کو میرے حوالے کیا ہے۔ لمحہ موجود جو ابھی گزر گیا جیسے مستقبل میں کسی چیز کی خواہش کی تھی یہ لمحہ بھی ماضی کے دریچوں میں اور لوح قلم میں محفوظ ہو گیا ہے۔ مجھے ذرا اس کی وضاحت کرنے کی اجازت دیجیے کہ یہ آدمی کے لیے کوئی حس کی چیز نہیں ہے ماسوائے اس کے کہ اس کو بھی مستقبل کے لیے ایک ہدایت نامہ دے کر رخصت کر دیا جائے۔

جس طرح ر ینن (Renon) کی معروف ضرب المثل کہ آواز گونج کی شکل میں واپس آ

جاتی ہے، اسی طرح قوم بھی اپنے مستقبل کے لیے آج پروگرام ترتیب دیتی ہے۔ مستقبل کا فیصلہ استصواب رائے کیا جاتا ہے۔ اس مقدمہ کا مطالعہ کرتے ہوئے عقدہ یہ کھلتا ہے کہ مستقبل کے ماضی کے جاری و ساری رہنے کی صورت میں ہم وجود ہوتا ہے۔ یہ مقدمہ کم از کم ہمارے سوا کوئی ترمیم نہیں کرتا ہے۔ فقط یہ ظاہر کرتا ہے۔ ریلنن (Renon) کی تعریف بھی فطرت کے لحاظ سے دقیانوسی ہوتی ہے۔ لہٰذا قومی ریاست کو ایسا اصول وضع کرنا چاہیے جیسے قدیم عربی مملکت میں قبیلہ کو ہی نسل تک محدود کیا جاتا تھا یہ زیادہ ریاست کے قریب ترین نظریہ کا حامل ہے اور یہ حقیقت کہ قومی خیال دراصل ساحل اور نسل کے ساتھ رابطے یا میل جول کا معمولی عنصر بھی اپنی ذات میں محفوظ نہیں رکھتی۔ لیکن اس کے سبب کو دیکھ کر میں بہت حیران ہوا کہ انسانی اتحاد (وحدت) پر روحانی اصول کیسے فتح یاب ہو جاتا ہے جبکہ اس کی موجودگی کا یہ پروگرام اپنی اساس ورغلانے اور دل موہ لینے پر قائم کرتا ہے بلکہ مجھے اس سے زیادہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ماضی کے فالتو بوجھ کی نسبت مادی اصول میں مجبوری نہیں پائی جاتی اور نہ ہی مغربی روح میں مکمل طور اور بلا تحریک شامل ہوتی ہے۔ یہ نظریہ روحانی طرز انشاء کے عالموں نے اس خیال کو قومی خیال کی شرح و بسیط سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اگر انیسویں صدی کا نظریہ عوامی قومیت ازمنہ وسطیٰ کے عہد میں پیدا ہوتا تو انگلستان، فرانس، سپین اور جرمنی کی پیدائش نہ ہوتی۔ کیونکہ اس کی یہ شرح، شوق اور لگن کو درہم برہم کر کے ایک قوم مرتب (تشکیل) کی جاتی ہے۔ جس کی ہمراہی میں خود کو محفوظ اور مستحکم کرتی ہے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں کہ قوم کو حب الوطنی نے ترتیب نہیں دیا۔ اس کے برعکس اس کی عقلمندی کا ایک ثبوت یہ ہے اور سچ بھی یہی ہے کہ میں نے خود بھی سبز باغ (کالا نہیں) دکھائے ہیں اور جس طرح ریلنن (Renon) نے اپنی قوم کی شرح کرنے میں خود تسلیم کیا ہے کہ اگر اس طرح ایک قوم زندہ ہو تو عوام کے کسی ایک گروپ (گروہ) کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس قابل ہو کہ وہ اپنے مشترکہ ماضی پر نہ صرف نگاہ ڈالے بلکہ اچھی طرح غور کرے۔ چنانچہ میں خود سے پوچھتا ہوں کہ ہم اس گروپ کے آدمیوں کو کیا کہیں جبکہ حقیقت میں وہ حال میں رہتے ہیں جو آج کے نظریہ یا حوالے سے ایک ماضی ہوتا ہے۔ اس مشترکہ موجودگی کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ وہ مرجھا جائے گی تو وہ ایسی صورت میں وہ یوں کہنے پر کیوں مجبور ہوا ہے۔ "ہم ایک قوم ہیں" کیا ہم نے علم اللسان کے تمام قبیلوں، تدوین بندی (صوت بندی) اور پیشہ ورانہ بصارتی نقص کو یہاں صاف طور پر بیان نہیں کیا۔ جو دوسروں کو حقیقت تسلیم کرنے سے روکتی ہے۔ اس وقت تک کہ وہ ماضی میں لوٹ جائے؟ عالم لسانیات وہ محقق ہوتا ہے جو ایک زبان کا عالم فاضل ہونے کے ناطے اس کو ماضی کے ہست و بود سے تعلق جوڑنے کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن اس طرح قوم تقاضا نہیں کرتی۔ اس کے برعکس اگر وہ ایک مشترکہ ماضی رکھتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ

مشترکہ وجود کو تخلیق کرے اور اس کو خلق کرنے سے پہلے اس کو ایک خوبصورت خواب دیکھنا چاہیے جس میں وہ خواہش کرے اور اس کی تعبیراس کا منصوبہ قرار پائے۔ بس ایک قوم کو زندہ رکھنے کے لیے یہ کافی ہے کیونکہ اس کا مستقبل کے لیے کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے بے شک اس کا مقصد پورا نہ ہو، کوئی پروا نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی اس کا مستقبل کے لیے ایک منصوبہ، ایک لائحہ عمل کا خواب بننا چاہیے۔ یہ مایوسی کے عالم میں ہی اپنے انجام/منزل تک پہنچ جائے گا۔ اس قسم کا واقع تاریخ میں ایک دوبار سے زیادہ ہوا ہے۔ اس لیے اس مقدمہ میں ایک قوم برگنڈی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ قوم وقت سے پہلے ہی علیحدہ ہو کر رہنا شروع کر دیا تھا۔

وسطی اور جنوبی امریکا اور سپین کے لوگوں کا ماضی میں ایک مشترک قبیلہ، زبان رکھتے مگر خود کو قوم نہ کہتے یا ایک قوم نہ بن پائے۔ کیوں نہیں؟ اس میں بھی ایک چیز کی کمی رہ گئی کہ اس قبیلہ نے ایک مشترکہ مستقبل کے بارے میں کبھی خیال نہیں کیا۔ سپین جانتا نہیں کہ مشترکہ مستقبل کے لیے ایک اجتماعی پروگرام کیسے ترتیب دے کہ وہ اپنے حیاتیاتی گروپ سے یہ کہہ سکے کہ جہاں اس مسئلہ میں تمھاری خصوصی توجہ اور دلچسپی لینے کی ضرورت ہے۔ مستقبلیت کا استصواب رائے سپین کے حق میں نہیں ہوا اور اس وجہ سے محافظ خانے، یادداشتیں، آباؤ اجداد اور مادر وطن کے باوصف سپین کے لیے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جہاں اول الذکر زندہ رہتی ہے اور موخرالذکر بطور استحکامی قوتوں کے اطاعت شعاری کرتے ہیں لیکن اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

ماضی کی تاریخ کے اسی زمانے میں متعین ایک قومی ریاست کا ایک سانچہ جو خصوصیت میں استصواب رائے رکھتا ہے، کو دیکھا۔ مجھے تو علیحدہ ہونے کا منظر نظر آیا ہے کیونکہ اس کی چند روزہ زندگی قدر (وصف) میں ایسی تبدیلی کا خاکہ پیش کرتا ہے کہ مَوادی قناعت یا نوع اور یا الحاق ظاہر کرنے ہر وقت آمادہ اور استصواب رائے کا تقاضا کرتی ہے۔ رینن (Renon) نے کیا خوب لفظ "جادوئی" دریافت کیا۔ اس کو روشنی سے ذخیرہ کرتے ہوئے مجھے اجازت دیں کہ ہم اس کی زیر برقیرہ کرنوں کا معائنہ اور مطالعہ کریں جو ایک قوم کے اندرونی سلطنت کا ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ اس کے دو اجزا ہوتے ہیں۔ اولین یہ کہ ایک مشترکہ زندگی کا مستقبل کے لیے ایک مشترکہ منصوبہ پر کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اور دوئم یہ کہ اس پرکشش ارادہ سے عوامی وابستگی کا اظہار ہو۔ یہ عمومی لگاؤ اس کے اندرونی جمود کو جگاتا ہے جو قومی ریاست کو مثالی ریاستوں سے امتیاز کرتی ہے۔ جس میں سے وحدت جنم لیتی ہے اور ریاست کے خارجی دباؤ کو غیر متساوی گروپوں پر مصر ہوتی ہے یعنی دباؤ کو جاری رکھنے کا اسرار کرتا ہے۔ چونکہ ریاست کی یہی توانائی بلا تحریک آغاز کر دیتی ہے اور رعیت کے درمیان اتصال پیدا کرتی ہے۔ اس طرح حقیقت یہ عیاں کرتی ہے کہ عوام الناس ہی دراصل ایک ریاست ہوتے ہیں

اور اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہ ایک نیا اور ایک انوکھی مافوق العادت شے ایک قومیت میں ابھر کر ظاہر ہوتی ہے اور غیر متعلق بھی ہوتی ہے۔ اس توضیح کے بعد ر ینن (Renon) قریب قریب اپنی متذکرہ شرح کی کامیابی کی تنسیخ کرتا ہے اور اس کو زمانہ ماضی میں نافذ ہونے والے ایک قوم کے استصواب رائے کی ایک جز اور لازوال ہونے کا حوالہ دیتا ہے۔ بہرحال مجھے اس کے اس اشارہ کو تبدیل کرنے کو ترجیح دینی چاہیے اور قوم کے لیے ایک ضابطہ اور نوزائیدہ مقام و مرتبہ کو قانوناً" مکمل کرنا چاہیے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے کیونکہ حقیقت میں ایک قوم کبھی تصور نہیں کی جاتی۔ اس طریق سے یہ ریاست کی دوسری نوع سے اختلاف کرتی ہے کیونکہ قوم ہمیشہ یا تو تشکیل کرنے کا عمل کرتی ہے اور یا یہ اس کی تشکیل نہیں کرتی۔ یعنی قوم ایک ایسی شے ہے جو کسی نہ کسی طرح دو چیزوں سے متعلق ہوتی ہے لیکن دونوں سے علیحدہ بھی یعنی دو چیزوں یا دو افراد کے درمیان ایک واسطہ ہوتی ہے یہ یا تو کامیاب رفیق ہوتے ہیں یا تو اس سے شکست خوردہ۔ اس طرح کہ ایک ریاست کسی معروضی وقت ایک ارادہ کا اظہار کرتی ہے یا پھر نہیں کرتی۔ چنانچہ ان حیرت انگیز ارادوں، ہمتوں کے وحدتی تسلسل کو دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ انھوں نے مغرب کے انسانی گروہوں سے ولولہ اور جوش و خروش پائے جانے میں خاطرخواہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اس طرح سے دیکھا جائے تو یورپی باشندے اس کی وجہ سے وظائف ضروریہ ادا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ انھوں نے یہ اہلیت اپنے زندگی کے گہرے تجربات اور دلی لگاؤ کے تعلق کے باعث یہ مرتبہ حاصل کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تربیت کے دوران اپنے بلبلے (کمزوری) پیدا ہو گئے تھے۔ کیونکہ اندریں حال میں کوئی تسلسل کی کرن (بینائی) نظر آ رہی ہے اور نظر نہیں آ رہی تھی۔

ہمارے اس مطالعہ کے ایک اور نقطے کو مثالوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ قدیم زمانوں میں ریاستوں نے اپنے ہم وطنوں اور قبیلوں میں اپنے ارادوں، ہمتوں اور استقامت، استواری پیدا کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی کیونکہ ان کے مہم جوئی کے ایسے ہی لچھن نظر آتے ہیں۔ بلکہ ماضی کی اس ریاست نے اپنی غیر شائستگی اور وحشیانہ طرز زندگی نے ریاست کی حدود کو پابندیوں میں جکڑ دیا تھا۔ یعنی قبیلوں اور شہر کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ دراصل اس قسم کی عملی کاراندازیوں اور مہموں نے ریاست کو محدود کر دیا۔ شاید اسی وجہ سے ایرانی، مقدونیہ اور روم کے عوام الناس نے اس ارضی خطہ کے کسی اور، اور ہر ایک اکائی کے اقتدار اعلیٰ میں استخراج کر دیا تھا۔ جیساکہ ایک اکائی اندرونی اور قطعی طور پر مستند نہیں ہوتی اس لیے اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بجز اس کے کہ وہ حالات کی سنگینیوں کے پیش نظر فاتح کی فوجی اور انتظامی کارکردگی اور اقتدار اعلیٰ کے تسلسل کو تسلیم کر کے برقرار رکھا جاتا۔ لیکن مغرب میں قوموں کے متحد کرنے کے عمل نے ایک سنگین تسلسل کی پیروی کرنے پر

مجبور کر دیا تھا۔ ہمیں اس پر زیادہ تشویش کرنا چاہیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی اسکندر، کسی ایرانی اور آگسٹس نے یورپ تک اپنا اپنا قلمروئی کا دائرہ کار نہیں بڑھایا۔

یورپ میں قوموں کے خلق کرنے کے عمل نے ہمیشہ ان واقعات کے تسلسل کی پیروی کی ہے۔ تحریک اولین مغرب کی مخصوص جبلت جس نے ریاست کے مختلف عوام کے سیاسی اور اخلاقی ہستی کو ایک اکائی کا سوچنے کی ترغیب دی اور عمل کیا یہ اس سب سے پہلے گروپوں کے قریب ترین قبیلہ (برادری) نسل، جغرافیائی اور لسانی گروپوں میں عمل در آمد کرانا شروع کیا یہی نہیں کہ یہ لگاؤ قوم کی بنیاد ہے بلکہ اس لیے کہ اکائیوں (پڑوسی) کے گوناگوں تفاوت پر آسانی سے قابو پایا جاتا۔ تحریک دوم ایک استحکام، اس میں نئی ریاست کے خارجی عوام کو اجنبی یا کم و بیش دشمنوں کی نظر سے دیکھا جاتا۔ یاد کرو یہ وہ زمانہ تھا جب قومیانے کے عمل نے خلوت پسندی کے لیے ذائقہ رویہ کو ریاست کے اندر چاروں جانب سے بند کرنے کا عمل اختیار کیا۔ قصہ مختصر ہم آج کے عہد میں اس کو قوم پرستی کہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی اثناء میں دوسروں نے سیاسی طور پر خود کو اجنبی اور دشمن سمجھنا شروع کر دیا جہاں پر ان کے ساتھ اقتصادی، شعوری اور اخلاقی عمل اشتراک کیا جاتا ہے۔ قومی جذبے سے سرشار جنگوں نے تکنیکی اور ذہنی ارتقاع کے عمل کی پیمائش کر دی ہے۔ باقاعدہ دشمنوں نے آہستہ آہستہ اور تاریخی طور پر آپس میں متجانس ہو گئے۔ بتدریج بااصولی کے افق پر ظاہر ہونے لگے کہ دشمن عوام اسی انسانی دائرے سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ہمارے خود کی ریاست ہے۔ اس کے باوجود ان کو غیر ملکی اور دشمن گردانا جاتا ہے۔

تحریک سوم۔ ریاست بستگی اور پیوستگی میں لطف اندوزی ہوتی ہے۔ پھر جا کر ایک نیا کاروباری مہم نے از خود دعوت دی کہ گذشتہ کل کے دشمنوں کو متحد کیا جائے۔ یہ یقین کامل ہے۔ یہ آگے بڑھتا ہے اور بتلاتا ہے کہ وہ ہمارے اخلاقیات اور مفادات میں قرابتداری ہے اور یہ کہ ہمیں ان کے ساتھ مل کر دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے گروپوں کے خلاف ایک قومی گروپ تشکیل دیتے ہیں۔ اس سے ہمیں اس خیال کے بلوغت (بالیدگی) کے نتیجہ میں ایک قومی خیال پیدا ہوتا ہے۔

ایک مثال دے کر اپنا مدعا بیان کرنا چاہتا ہوں۔ وثوق سے کہنا آج کل بس ایک رواج سا ہے کہ قبیلہ سڈ (Cid) کے زمانہ میں سپین کا قومی خیال پہلے سے موجود تھا اور اس اصولی نظریہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس اصولی نظریہ کو سب سے زیادہ اہمیت صدیوں قبل سینٹ عیسڈورنے مادر وطن (سپین) کی ضرورت اور اہمیت پر موثر انداز اور خطیبانہ انداز میں گفتگو اور تقاریر کیا کرتا تھا۔ میرے نزدیک اور تاریخی تناظر کے لحاظ سے اور ظاہری طور پر ایک فاش غلطی تھی کیونکہ سڈ کے زمانہ

میں لیون کاسٹائل (Leon Castile) ریاست کی تشکیل میں مصروف تھا اور ان دونوں کے درمیان اتحاد اس زمانے کی اولین ضرورت اور قومی خیال تھا جو حقیقت میں ایک مجرب خیال ہے۔ اس کے دوسری طرف سپین کا ایک مبہم خیال تھا۔ بہرحال رومی سلطنت نے ان مفید اور مجرب مشوروں سے اور تصورات میں سے ایک مبہم تصور کا بیج مغرب میں بویا گیا۔ سپین کے باشندوں نے روایتی طور پر روم کے انتظامی وحدت میں یکسانیت کی بنیاد پر باہم منسلک ہو گئے تھے یعنی اپنی مرحومہ سلطنت کی دو جنس، متجانس میں ضم ہو گئے لیکن یہ جغرافیائی، انتظامی امور کا گٹھ جوڑ خارجی طور پر تسلیم کیا گیا۔ دراصل یہ مستقبل کی طرف نہ کوئی اندرونی فیضان، طرز ادا اور نہ کوئی چاہت تھی۔

چنانچہ گیارھویں صدی عیسوی میں اس نظریہ کو حقیقت کے رنگنے میں اجازت ملی اور ان معنوں میں اس حقیقت کو منظور کیا گیا کیونکہ یہ بھی استعداد کے طور پر بھی یہ فیصلہ درست نہ تھا بلکہ ہیلس (Hellas) نے تو یونانیوں کے لیے اس قسم کا نظریہ چوتھی صدی عیسوی میں دیا تھا۔ بہرحال یہ خیال اس نظریہ سے زیادہ وزنی تھا۔ اور اس کے باوجود ہیلس (Hellas) کا یہ قومی خیال کبھی ہم آہنگ نہ ہوا تھا۔ چنانچہ اس کا برمحل اور تاریخی طور پر تقابلی جائزہ کچھ اس طرح کیا جاتا ہے: ہیلس (Hellas) صرف چوتھی صدی عیسوی کے یونانیوں کے لیے تھا اور سپین گیارھویں صدی سے لے کر چودھویں صدی عیسوی تک ہسپانوی باشندوں کے لیے اور اسی طرح یورپ انیسویں صدی کے یورپی باشندوں کے لیے مخصوص تھا۔

ان حقائق سے ہمیں اندازہ ہوا کہ قومی وحدت (اتحاد) کی ترقی کے حصول میں اسی طرح کی کوششیں کی جاتی رہی ہیں جس طرح خوش آئند یا خوش آہنگ آوازوں کے تسلسل کے لیے آبنائے سے گزرنا پڑتا ہے۔ گذشتہ کل کے اس رجحان کو آئندہ کل کے اس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب یہی انتہائی اظہار جذبات کل کے قومی القا (فیض) کے آخری سانچے میں بہہ نہ جائیں اور دوسری طرف ہمارا ایمان کامل ہے کہ آئندہ کل میں ایسا وقت ضرور آنے والا ہے۔ اب یورپی باشندوں پر منحصر ہے کہ وہ یورپ کو از خود قومی خیال کے دھارے میں بدل ڈالیں۔ میرے اس مثالی ریاست (معیاری) کے تصور کو ہرگز کم تر نہ سمجھا جائے کیونکہ اس پر یقین کرنے کے لیے ہمیں اس گیارھویں صدی عیسوی کی اس الہامی گفتگو کو بھی مدنظر رکھنا ہو گا جس میں سپین کی وحدت پر الہامی گفتگو کی جاتی تھی۔ مغرب کے باشندے اس قومی ریاست کے خیال سے جس قدر زیادہ ثابت قدم اور نمک حلالی کریں اور القا کو اور زیادہ برقرار رکھنے کی کوشش کریں تو مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یورپ میں ایک براعظمی ریاست تشکیل پائے گی۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور کے مصداق مغربی اقوام نے بھی بڑی مشکل

سے اس مستند خیال کو ترقی دینے میں کامیاب ہوئی ہیں ان کے گرد و پیش اور ایک تصوراتی پس منظر کے خواب کی تعبیر کا آغاز اس یورپ نے کر دیا ہے۔(یعنی آغاز تو اچھا ہے انجام خدا جانے) یہ ہیئت ارضی کے اتحاد کا منظر نامہ ہے۔ نشاۃ ثانیہ سے یہ آگے بڑھتا چلا آیا ہے حتیٰ کہ یورپی پس منظر میں آ پہنچا ہے جس نے از خود قوموں کے ساتھ صلح نامہ کر لیا ہے۔ اگرچہ یہ ان سے بے خبر ہے جنھوں نے اپنے غصیلوں/جھگڑالوؤں کو جمع میں ہونے کی کیفیت سے واپس بلا لیا ہے۔ انگلستان، فرانس، سپین، اٹلی اور جرمنی آپس میں جھگڑتے ہیں۔ ان کے باہمی اتفاق (اتحاد) کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کو سدھانے کے لیے روکا جاتا ہے تاکہ ان کو نئی تہذیب و تربیت میں ڈھال سکیں لیکن اس قسم کا ادھر جھگڑا اور ادھر امن یہ دونوں کے مساویانہ طور پر زندگانی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ ایک ایسا رویہ روم نے سیلٹیبیرین (Celtiberian)، گالش، برطانوی اور جرمنی کے ساتھ کبھی ایسا سلوک نہیں روا رکھا تھا۔ تاریخ نے تنازعات کی تصویر کا سامنے کے منظر سے پردہ ہٹا دیا جاتا ہے۔ ان تمام مناظر میں آخری سرا ہمیشہ سیاست پر موقوف ہوتا ہے جہاں سے وحدت بیج بو کر جنم لیتی ہے۔ لیکن جس وقت جھگڑا ایک کھیت (میدان) میں ہوتا ہے تو دوسری طرف کئی مقامات پر دشمن سے لین دین بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ اور دوسرے کئی دشمنوں کے ساتھ کاروبار حیات میں تبادلہ خیالات، فنون لطیفہ کی تمام انواع اور مذہبی عقائد پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں یا پھر مصروف عمل ہیں۔ کوئی یہ اعتراض کرے کہ مزاحمت کا یہ تصادم صرف چلمن کی لوٹ سے عیاں ہوتا ہے جبکہ امن دشمن قوموں کے مابین تنازعات میں آمیخت کرنے میں مصروف ہوتا ہے۔ ہر ایک نئی نسل میں عوام کی حیات نو میں بلوغت کا جوہر یکساں طور پر اگتا ہے۔ میں اس کی قطعیت اور انتباہ کے طور پر یوں پیش کرتا ہوں کہ فرانسیسی، انگریز اور ہسپانوی کی روحیں (جوہر) ایک ہیں اور ایک ہوں گے تم ان کو کم یا زیادہ مختلف بتلا سکتے ہو لیکن ایک بات طے ہے کہ ان سب کی نفسیاتی سائنس (فن تعمیر) ایک ہی ہے۔ بس یہی کافی نہیں ہے وہ آہستہ آہستہ آسودہ خاطری (قناعت) میں بھی ایک دوسرے کے مانند ہو رہے ہیں۔ مذہب، سائنس، قانون، آرٹ، سماجی اور جذباتی قدروں اور دکھ درد میں مشترکہ اور یکساں طور پر حصہ لے رہے ہیں۔ اب یہ روحانی چیزیں ہیں کہ جس کی وجہ سے انسان زندہ رہتا ہے۔ پھر ہم نوعی (یک رنگی) یکساں طور پر بڑھتی ہے بشرطیکہ تمام روحیں خود بخود ہم شکل سانچوں کے قالب میں پھینکنے یا ڈھالنے کے عمل میں مصروف ہوں۔ اگر آج ہم اپنی اس نسل کے سامان کی فہرست تیار کرنا چاہیں مثلاً" رائے، معیار، خواہش اور مفروضے ہمیں لگ پتہ جاتا ہے کہ فرانسیسی کو فرانس سے نہیں اور ہسپانوی کو سپین سے سارا سامان نہیں ملتا بلکہ یہ سارا سامان نہیں ملتا بلکہ یہ سارا سامان یورپ کی مشترکہ منڈیوں سے حصہ آتا اور ملتا ہے۔ اور آج حقیقت بھی یہی ہے کہ ہمارے اندر بھی ایک یورپی انسان چھپا بیٹھا ہے۔ اس کی تاثیر

تمامؑ فرانسیسیوں اور ہسپانیوں سے زیادہ ہے۔ اگر اس کے اس خیال "قومی" کو گمان میں بھی تصور کریں تو یہ حضرت انسان اس فرانیسی کی تمام چیزیں، سوچیں، فکریں، احساسات کو براعظم کی حدود سے باہر نکال دیا جائے یا محروم کر دیا جائے تو یہ انسان دہشت زدہ ہو جائے گا اور وہ خود محسوس کرتا ہے کہ وہ صرف اپنے ملک کی چیزوں کے سہارے زندہ نہیں ہے بلکہ اس کی روحانی دولت بھی پانچ حصوں میں سے چار حصے یورپ سے حاصل کرتا ہے اور یہ یورپ کی مشترکہ جائیداد ہے۔

یہ ادراک کرنا ممکن ہے کہ ہم میں سے وہ جو اس زمین کے اس حصہ پر رہنے والے عوام ہیں وہ اس لفظ یورپ کے سوا اس کا اور کیا صحیح مصرف عمل میں لائیں بجز اس لفظ یورپ کے ان کو اس سے وہ وعدہ پورا کرنا چاہیے جو انھوں نے اس سے گذشتہ چار صدیوں سے کیا ہوا ہے۔ اس گماں (قیاس) پر صرف پرانی "قوموں" کے اس تعصب اور بدظنی برخلاف ہے جو قوم کے خیال کی اساس ماضی پر قائم کرتا ہے۔ بالفرض ہم بہت جلد دیکھتے ہیں فرنگی نسل (یورپی) قسمت کی دیوی کے بچے ہوتے ہیں اور جو اپنی بات پر ثابت قدم رہتے ہیں اور جو اپنے ذہنی استعداد کار سے تاریخ کو مخالف سمت یعنی اسی راستہ پر واپس بھیج دے گی، ہمارے حوالے نے خاص طور پر روم اور عمومی طور پر قدیم دنیا کے آدم زادوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ اس خاص اور مشکل قسم کے عوام کو یہ وارننگ دی ہے کہ وہ ریاست کے اس قدیم خیالی سے دست کشی کرے جو اس کے دماغ میں خرم و سنداں، قومی ریاست کا یہ نظریہ جس کو فرنگی نسل (یورپی) نے شعوری اور لاشعوری طور پر دنیا میں متعارف کرایا ہے یہ خیال ماہرین لسانیات کی فضیلت کی خودنمائی سے متعلق نہیں ہے جنھوں نے اس کو نصیحت (تلقین) کی ہے۔

اب میں اپنے مضمون کے مقالہ کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ آج کی یہ دنیا ایک اخلاق خراب کرنے کے سنگین مرض میں مبتلا ہے جس نے دوسری علامات کے علاوہ ایک غیر معمولی مرض "عوامی بغاوت" کو آشکارا کیا ہے اور بدقسمتی سے اس مرض کا یورپ میں آغاز (ابتدا) ہو چکا ہے۔ اس آخرالذکر کے اسباب بکثرت ہیں ان اسباب میں سے ایک طاقت کا سرکاؤ ہے جو پہلے ہمارے براعظم کے توسط سے خود اور باقی ماندہ دنیا پر نفاذ کرتا تھا اور اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ یورپ کو یقین نہیں ہے کہ وہ زیادہ دیر حکومت کرے گا اور نہ ہی باقی ماندہ دنیا کو یقین ہے کہ کوئی اس پر زیادہ دیر حکومت کرے گا۔ گویا تاریخی لحاظ سے اہم اقتدار اعلیٰ نے خود کو انتشار (پراگندگی) کے گڑھے میں پہنچا دیا ہے۔ آپ اب یوں سمجھیں کہ اس کے پاس فراواں وقت کی قلت ہو گئی ہے اور اس نے انیسویں صدی عیسوی کی طرح اس نے اپنے مستقبل کے لیے ایک پاکیزہ، واضح، پہلے سے مقرر وقت اور غیر یقینی صورت حال کے نظریے کو فرض کر لیا یعنی تجویز کر لیا ہے۔ بنابریں عوام الناس سوچا اور جانا کہ آئندہ

کل میں انھیں کس صورت حال سے نمٹنا ہو گا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے لیے ایک نیا افق نے نامعلوم سمتوں کی طرف اپنے دروازوں کی درزوں کو وا کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں کسی کو کچھ خبر نہیں ہے کہ ان پر آئندہ کل میں کون حکومت (راج) کرتا ہے اور دنیا میں راج کرنے کے لیے مقتدرہ خود کو کیسے منظم کرتی ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ کون، کس قسم کے عوام اور یا کس قسم کے عوامی گروپ حکومت کریں گے اور یا کس قسم کے گروہی، نسلی اور کیسی قوم کن نظریات کی حامل عوام (لوگ) ہوں گے اور ان کے نظم و نسق کی کیا ترجیحات، معیار اور معروف تحریکیں ہوں گی جو آئندہ راج کریں گی۔

کسی کو کچھ خبر نہیں ہے کہ کیا ہونے والا ہے اور یہ کہ انسانی نظم و نسق کے مستقبل کے مرکز کا کون تعین کرے اور کس وجہ سے زمینی کشش مستقبل پر اثر پذیر ہو گی اور وہ وجوہات کیا ہوں گی جن کی بناء پر دنیا ہنگامی اہانت آمیزی کرے گی۔ کسے معلوم کہ آج کی دنیا میں ہر ایک چیز کو حکومت اور نجی شعبہ کی باندی بنا دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ انسانی ضمیر کا سودا بھی حکومت یا پھر نجی شعبہ کرتا ہے۔ کسے معلوم کہ یہ کیفیت یا صورت حال عارضی اور ہنگامی ہوتی ہے کسے معلوم کہ اس کی ہست و بود کو بھی مختلف سائنس کے چند خاص شعبوں میں تقسیم کر کے کس شعبہ کی بھینٹ چڑھایا جائے گا اور نجانے کیا کیا ہو گا کسی کو کچھ خبر نہیں ہے۔ وہ عقل مند آدمی ہو گا جو ان تمام دعوؤں پر بھروسہ نہیں کرتا اور اس پر سلام پہنچے جس نے اس عوامی علم کو بلند رکھا، جدوجہد کی اور جس نے آج کے دن کے موقع پر مناجات کی ہے۔ لوگو! یہ سب کچھ آندھی کی طرح آیا اور بگولہ کی طرح غائب ہو جائے گا۔ یہ سارے طبیعی کھیل تماشوں سے لے کر سیاسی تشدد تک "نیا آرٹ" کی رنگینیوں سے لے کر بے ہودہ شمسی غسل گاہوں تک منجملہ جسمانی نمائش کا حصہ ہیں اور لطف کی بات کہ اس فسادی خبط کی کوئی بنیاد (جڑ) نہیں ہے۔ یہ تمام ایجاد کیے گئے اور من گھڑت مشاغل ہیں۔ میں ان تمام مشاغل کو بے چین (ناپائیدار) تخیل کی جولانی کا نام دیتا ہوں کیونکہ یہ اسی کھیل کا اعجاز ہے کہ اس کی زندگی کے تحت طبق کوئی ٹھوس بنیاد نہیں رکھتی ہے۔ یہ نہ کوئی مستند تحریک ہے اور نہ کوئی ضرورت ہے۔ ان تمام باتوں سے میری مراد یہ ہے کہ اس زندگی کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عمل دروغ گوئی ہے۔ ہم تضادات کے مجموعوں اور منافقانہ طور طریقوں کی جلو میں رہتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں جو فیشن پرستی کا شکار ہو گئی ہے۔ جو ایک طرف تو راست بازی سکھاتی ہے اور دوسری طرف اسی لمحہ موجود میں دھوکہ دہی سکھاتی ہے۔ صرف ہست و بود ایک کھری سچائی ہے جو سمجھتی ہے کہ اس کی ساری سرگرمیاں ناقابل تنسیخ ضروریات ہیں۔

آج یہاں کوئی ایسا سیاستدان موجود نہیں ہے جو اپنی پالیسی، انتہا پسندانہ رویہ اور غیر

سنجیدہ رویہ اور مقدر کو روح پر خود کو کم تر سمجھتا ہو۔ اس کی زندگی کی جڑیں اسی خطہ میں پیوست ہیں۔ یہی اس کے اصلی باشندوں کی زندگانی کا ثمر ہے۔ جس کی سرگرمیاں فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہمارے قبضہ قدرت میں ہے کہ کسی کو قابو کریں، چھوڑیں اور یا کسی اور چیز سے تبدیل کریں باقی ساری زندگی سراب ہے اور ایک بے مغز (تہی دامن) اور تاریخی حکومت کے درمیان آج کی زندگی ایک زمانہ فطرت کا ثمر ہے۔ جیسے تھی، ہے اور ہو گی اس وجہ سے یہ خالصتاً" عارضی اور ہنگامی ہے یہ نہیں جانتے کہ کس ادارے کو کس سچائی کے تحت کونسا کام کرتا ہے اور خواتین یہ نہیں جانتیں کہ انہیں کس قسم کے آدم زادوں کی سچائی کے تحت خدمت گزاری کرنا ہو گی۔

یورپی باشندے بے چین روح ہیں۔ یہ جب تک کسی عظیم کار جوئی کو شروع نہ کر دیں یہ نچلے نہیں بیٹھتے۔ لیکن جب ان میں محتاجی در آتی ہے تو یہ شرافت کھو دیتے ہیں یعنی یہ کاہل ہو جاتے ہیں۔ ان کی روح بے بس (لقوہ) ہو جاتی ہے۔ اس سارے المیہ کا آغاز ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ وہ قوم ہے جو صدیوں سے اپنی وسعت پذیری کے باعث مشہور چلی آ رہی ہے۔ ہم اس کے ساتھ اور کیا سلوک کر سکتے ہیں کہ ان کو ایک برتر ارتقاء کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اور اب صورت حال یہ ہے کہ فرنگی نسل کے باشندوں نے تمام یورپ میں یہ اپنی ماضی کی عزت مساوات کو جمع کرنے کی ٹوہ میں لگے ہوئے ہیں یعنی اس کو کم تر بنا کر اس "مائی" کو قید کرنے کی سعی میں ہیں اور ہم ایمانداری سے یوں محسوس کرتے ہیں کہ اب یہاں جتنا مشکل ہو گیا ہے یہ قومیں بڑی، بدتمیز اور ہوشیار ہو گئی ہیں کیونکہ یہ قومیں بھی ایک بدمزہ اور بے ذائقہ (غیر مرئی) فضا میں قید ہیں۔ اس سے قبل اس قوم کو صرف جنت کی ہوائیں اور نعمتیں بس کافی تھیں اب یہ قومیں اپنے علاقائی تعصبات میں کہیں کھو گئی ہیں جو چاروں جانب سے بند ہے۔

ہر شخص اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک نیا اصول گھڑنے کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ لیکن اکثر جیسے ہوا کرتا ہے کہ بعض لوگ اپنے بناوٹی اصول کی شدت کے باعث صورت حال پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کے اصولوں کی وجہ سے زوال پذیر (فرسودہ) ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں کے اچانک اور شدید ہیجان "قوم پرستی" کے معنی یہی ہمیں سمجھ میں آئے ہیں۔ میرا کہنے سے مراد یہ ہے کہ ایسی اشیاء (تدبیر) کی یہی حکمت ہے کہ اپنے متعین کے گئے راستہ پر چل پڑی ہیں۔ میں پھر دہراتا ہوں تاکہ سند رہے کہ یہی چیزیں انسانی فہم و تجربے سے ماورا ہے اور شے ملا کر بن نہیں سکتی۔ یعنی آخری شعلہ طویل اور وسیع ہوتا ہے۔ جس طرح آخری لمحوں میں بھری ہوئی آہ و فغاں سب سے زیادہ معنی خیز ہوتے ہیں۔ ان سب چیزوں کے غائب ہونے سے سرحدات کی افزائش، فوج اور اقتصادیات کے بحرانوں میں شدید اضافہ ہوا ہے۔

لیکن ان تمام قومی ترقی اور خود مختاری کی خواہشوں کی بے شمار بصارتی کی کئی بند گلیاں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک منصوبہ بنانے کی کوشش کیجیے اور انتظار کریں کہ کیا ہوتا ہے کیونکہ بظاہر اس کے نکاس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ قوم پرستی ہمیشہ ایک ایسی سمت اختیار کرتی ہے جو ہمیشہ ان اصولوں کے برخلاف ہوتے ہیں جو اکثر قومیں تخلیق کرتے ہیں۔ رجحان میں اول الذکر تنہا پسند ہے اور موخر الذکر مشمولہ ہوتا ہے۔ بستگی اور پیوستگی کے زمانہ میں قوم پرستی ایک اثباتی قدر ہے اور معیار میں ارفع ہوتا ہے لیکن یورپ میں ہر ایک چیز انضمام سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ قوم پرستی مالیخولیا (خبط) کے سوا کچھ بھی نہیں ہے یعنی کسی نئی چیز کے ایجاد کرنے سے بچنے کے لیے حیلہ سازیاں کرتا ہے یعنی وہ جو کام کر رہا ہے وہ صفر کے کام ہے۔ اس کی سرگرمی کا قدیمی طریق کار اور وہ کس قسم کے عوام کو یہ سرفراز کرتا ہے اور یہ صاف طور پر منکشف کرتا ہے کہ یہ تاریخی تخلیق کے سخت مخالف ہے۔

براعظم کے عوام الناس کے گروہوں میں سے ایک بڑی قوم بنانے کے ایک مصمم ارادے نے یورپی باشندوں (فرنگی نسل) کی نئی زندگی میں ارتعاش پیدا کر دیا ہے۔ اس نے ایک بار پھر اپنی ذات پر بھروسہ کرنا شروع کر دیا ہے اور اس خودکاریت سوچ کے تحت اس نے عزم کیا ہے کہ وہ آئندہ خود کے نظم و نسق کا پابند ہو گا۔ لیکن ہم عمومی طور پر یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ صورت حال گھمبیر اور مشکل میں ہے۔ سال یوں ہی گزر رہے ہیں اور خطرہ محسوس کیا جاتا ہے کہ کہیں فرنگی نسل میں یہ رواج پا نہ جائے انھیں اس بات سے بھی غرض نہیں کہ اس نے خود حکومت کرنا ہے یا کسی اور نے ان پر راج کرنا ہے' بڑے بے درد ہو گئے ہیں' کوئی کسی کی پروا نہیں کرتا۔ مجھے تو اس مقدمہ میں یوں لگتا ہے کہ یہ (یورپ) اپنی تمام خوبیوں' فراخی اور وسعت کے باوجود کہیں ہواؤں میں تحلیل ہو جائے۔

جونہی فرنگی نسل اپنی قوم کی تعمیر نو میں مصروف عمل ہوتی ہے تو یورپ کے قدامت پسند طبقات اس کے اتحاد کی بھرپور مخالفت کرتے ہیں جس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان کی تباہی کے دن بھی جلد آ جائیں گے اور یورپ کے لیے ایک خطرہ اخلاقی پستی کا بھی ظہور پذیر ہونے کی نوید سنائی دیتا ہے یعنی یورپ اپنی تمام تر تاریخی قوتوں کو سمیٹ کر ایک نیا یورپ کی شکل میں پیدا ہونے والا ہے۔ اسی طرح کیمونزم نے جب روس میں اپنے پنجے گاڑھ دیے تو روس کے بعض قدامت پسندوں نے واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ اب سارا یورپ سرخ انقلاب کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ مگر میں ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کے برعکس میں نے لکھا کہ روسی کیمونزم ایک ہیولیٰ ہے جس کو فرنگی نسل کبھی اپنے میں جذب نہیں ہونے دے گی کیونکہ یورپین ایک ایسی نسل ہے جو اپنی تمام تر کوششوں اور توانائیوں کو بروئے کار لا کر اپنی انفرادیت پسندی کو ہمیشہ برقرار رکھیں گے۔ وقت گزرتا گیا جب

لوگوں نے دیکھا کہ اس لمحہ موجود کے بزدلوں نے یورپ میں سکون کو بازیافت کر لیا ہے قصہ مختصر کہ انھوں نے اپنے سکون اور اطمینان اس وقت بازیافت کیا جب ان کو اس کو پانے کی کوئی نہ تھی لیکن بلاشبہ وہ وقت بھی آن پہنچا ہے جب فتح یاب اور غالب کیمونزم اب خدا کرے سارے یورپ میں پھیل جائے۔

مجھے کسی حد تک یہ درست دکھائی دیتا ہے جس طرح مجھے پہلے دکھائی دیتا تھا کہ روسی کیمونزم کا مسلک (دھرم) یورپی نسل کے ساتھ لگاؤ اور جوہر کشش بالکل نہیں رکھتا اور ان کو پر کشش مستقبل کی دعوت تجویز بھی نہیں دیتا۔ اس مخصوص حجت کی بناء پر نہیں کہ کیمونزم کے حواری اس حقیقت کے سرکش' ضدی' بے پرواہ اور اجنبی ہیں بلکہ یہ ان کی عادت سی ہو گئی ہے کہ وہ دوسروں پر الزام لگاتے ہیں۔ آج کے مغرب کا بورژوا اچھی طرح جانتا ہے کہ کیمونزم کے بغیر بھی اس آدمی کے اچھے دن آنے والے میں جو خاص طور پر ذاتی آمدنی سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنا ہے۔ صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ جو یورپ روسی مسلک (دھرم) کو تحفظ دیتا ہے اس کا خوف اب کم ہو گیا ہے۔ بے باکانہ اساس جس پر سورل (Sorel) بیس سال قبل اپنے تشدد کے داؤ پیچ کو اظہار کیا آج ہمیں بہت حد تک احمقانہ لگتے ہیں۔ جیساکہ سورل (Sorel) نے تفکر کیا اور اب اس حقیقی لمحہ میں بورژوا مزدور کارکن سے زیادہ تشدد کرنے پر مائل نظر آتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر روس میں بولشو یکیت کی فتح اس لیے ہوئی ہے کہ روس میں بورژوا زادے نہیں تھے۔ فسطائیت جو ایک قانونا" بالغ بورژوائی تحریک ہے نے از خود تمام مزدور تحریکوں سے زیادہ شدید جذباتی ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اس تمام بے حقیقت نے بھی کسی یورپی نسل کو (اشتراکیت) سے ترک تعلق کرنے سے روکا نہیں ہے اس کی بڑی آسان وجہ یہ ہے کہ یورپی نسل نے اشتراکیت تنظیم میں انسانی خوشیوں میں کبھی اضافہ ہوتے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن میں پھر بھی دوہراتا ہوں کہ مجھے یہ ممکن دکھائی دیتا ہے کہ یورپ آئندہ چند سالوں میں بولشو یکیت کے مقابلہ میں زیادہ پر جوش ہو جائے گا۔ یہ صرف اپنے لیے ایسا نہیں کرے گا بلکہ یہ اس کے ہست و بود کی ضرورت ہو گی اور نجانے یہ اور کیا کیا ہے۔ ذرا سوویت یونین (سابق) اب روسی فیڈریشن کے اس صبر آزما پانچسالہ منصوبے پر دھیان دیں کہ جو ان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرے گا اور جس نے سوویت یونین (اب مرحوم) کی اقتصادی حالت کو نہ صرف بحال کیا ہے بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ بہتر بنایا ہے۔ اس کار خیر میں بولشو یکیت کا کتنا مواد کیوں نہ ہو یہ عظیم لوگوں کا کار عظیم ہے۔ اس میں عوام نے بڑی ثابت قدمی سے سماجی اصلاح کے مقصد کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ عوام کے اس جوش و جذبہ میں اگرچہ فطرتی قوتوں نے ان کی کوششوں کو رائیگاں نہیں جانے دیا ہے۔ بشرطیکہ انھوں نے مگر عوام الناس کو اس تفکر میں روپ یا سوانگ بھرنے کا موقع فراہم کیا اور اگر انہیں اس

کار عظیم میں کھل کر پنپنے کا موقع دیا تو یقیناً" یہ عوام اس براعظمی افق پر ایسے جگمگائیں گے جیسے نیا ستاروں کا جھرمٹ ٹھنڈی ٹھار روشنی چھوڑتا ہے۔

اس دوران مین اگر یورپ اپنی ہست و بود کی نموئی (رویئندگی) میں اگر کمی (کمزوری) محسوس کرے تو اسے بھی اپنی نئی زندگی کے آئندہ منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے اس کے آلودہ اثر و رسوخ اور حیران کن کار عظیم کی خاطر کیا مزاحمت کرنے کی پیش بندی کرنی چاہیے؟ یہ یورپی نسل کی کم فہمی/کم عقلی ہو گی اگر یہ توقع کریں کہ وہ کسی نیا دعوت فکر پر کٹھور (غیر متزلزل) ہو سکتے ہیں جب کہ ان کو ایسا کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ اس تہہ در تہہ پیسر کی گتھی کو کھول (سلجھا) دیں گے۔ یہ ان کی ایک قسم کی خدمت گزاری کا عمل ہو گا جس کے یہ معنی ہوئے کہ اس کی ہست و بود برقرار رہے گی تو پھر یہ ناممکن ہے کہ یورپی نسل اشتراکیت پر کیے جانے والے اعتراضات کو ہڑپ نہ کر سکے' یہ خود محسوس کرے گا کہ یہ اپنے ایمان کے اس مسالہ (مادہ) کو زقند لگانے کی ضرورت پڑ گئی بلکہ اس کے چال چلن کے حوالے سے اس کی روح کو تسکین ملتی ہے۔

میرے نزدیک یورپ کی تعمیر نو کر کے اس کو ایک عظیم قومی ریاست بنانا ایک کار عظیم ہو گا جو اس مساوی "پانچسالہ منصوبہ" کی طاقت کو مسخر کرے گا۔ سیاسی اقتصادیات کے ماہرین نے ہمیں یقین دہانی کرائی ہے کہ اس قسم کی کامیابی کے امکان بہت کم ہیں لیکن یہ بلاشبہ ہستی میں کم مرتبہ ہو جائے گا اگر اشتراکیت کے مخالفین اپنی ہر چیز کے حصول اور اپنی دوسری مادی مشکلات پر قابو پانے کے لیے اور اپنے حریفوں کے خلاف سرکوبی کرنے کی کوشش نہیں کرے گا تو اس کی ناکامی اس آفاقی آدمی کے برابر متصور ہو گی۔ اشتراکیت ایک اخلاقی قانون کا بے جا مجموعہ ہے لیکن اخلاقی قانون سے ہرگز کم تر نہیں ہے کیا یہ زیادہ لائق تحسین نہیں ہے اور سلاوی قانون سے زیادہ مفید نہیں ہے اور کیا نیا یورپی قانون ایک نیا پروگرام زندگی اور کیا اس کا القا (فیض نہیں ہے؟

باب-۱۵

حقیقی سوال کا بے مثال نتیجہ

یہ وہی سوال ہے کہ جس سے یورپی تہذیب بغیر کسی اخلاقی قانون و ضابطہ کے بنیادی رویوں میں تبدیلی لانا چاہتی ہے اور یہ وہی عوام الناس نہیں ہیں جنھوں نے قدیم النسل کو چھوڑ کر ایک نیا آدمی اس کے تبادلہ میں پیش کر کے اسے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ اس تہذیب نے اس کی زندگی کے خفیہ منصوبے کو حسب حال بنایا پھر کلیسا کے رسم و رواج کے مطابق اخلاقی اور قانونی ضابطہ کی غیر موجودگی، اور زندگی کی اپنے اندر چھپی ہوئی خواہش کی تشریح کی پھر اس کی زندگی کے ایک واضح راستہ کو متعین کر دیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ یورپ کے کسی نوجوان سے پوچھیں یا سنیں تو اس کا جواب ناقابل اعتبار اور ناقابل اعتماد ہوگا۔ میں قطعی طور پر اس سے انکار کرتا ہوں کہ آج کے عہد میں اس یورپی براعظم کے کسی کونے کھدرے میں چھپا ہوا کوئی گروپ ہو اور وہ ایک نیا نظام اخلاقیات جس کے اپنے قانون اور ضابطے ہوں سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اور جس نے اپنی ماہیت میں اخلاقی اور قانونی ضابطہ کے بنیادی رویوں میں تبدیلی لانے کی علامتیں ظاہر نہ کرتا ہو۔ جب عوام نیا نظام اخلاقیات کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات (برادری) کے تحفظ کی ضمانت کو صرف اسی "نیا نظام اخلاقیات" کی نظر کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور ہر وقت اس کی جستجو میں رہتے کہ وہ اس غیر قانونی شے کی ترسیل کرنے کے کون سے طور طریقے اختیار کریں۔ یہ ایک بہتان اور الزام تراشی ہے جس سے یہ لاتعلق ہو گیا ہے یا پھر اس رویہ کی کاسہ لیسی کر کے اور بالکل اسے نشان عبرت بنا دیا ہے۔

میں اس مفروضہ کو تسلیم نہیں کرتا کہ اس دنیا میں کوئی دو درجن لوگ کل کو ظہور پذیر ہونے والے اخلاقی اور قانونی ضابطوں میں بنیادی تبدیلی کے تصوراتی خاکہ (ڈھانچہ) شناخت کر لیں گے۔ اور یہی لوگ اصلی وقت کے ادنیٰ نمائندہ ہوں گے۔

اس طرح ایک خلافِ تہذیب تصور نے ایک پامال تصور کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہر ایک اور

سب نے اس پر لاف زنی کے عمل کی مشق شروع کر دی ہے۔ اس لیے سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ہم اس غیر اخلاقی رویہ کو تنہا چھوڑ دیں۔ جیسا کہ ہم نے اپنے اس مضمون میں ابتدا میں سلوک کیا ہے عیسائی، مثالیت پسند اور قدیم آزاد خیال روحیں جو ماضی کے کسی ایک عہد باقیات کی دلالت کرتی ہیں اپنے عہد کی نمائندہ نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ متذکرہ گروہوں میں سے ایک زندگی کے بارے میں بنیادی رویہ پر قدغن لگانے پر یقین نہیں رکھتے۔ اس کے نزدیک تمام حقوق اس کے لیے ہیں اور کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو معمولی اور غیر اہم مبدلی ہے۔ اسے خواہ انقلابی یا رجعت پسند کا روپ دھارنا پڑے خواہ مستعد یا غیر متحرک ہونا پڑے اس نے اپنے ادراک میں تمام ذمہ داریوں سے قطعی طور پر لاتعلق ہو کر لامحدود حقوق پر کیوں قبضہ کیا ہے؟ اور ان تمام سوچوں کو اس مخلص آدمی نے نظر انداز کر دیا ہے۔ جس طرح اپنے اساسی جوہر پر قبضہ کر لیتا ہے اسی طرح اس رویہ کا نتیجہ بھی یہی نکلتا ہے کہ وہ اپنی ہست و بود اور کردار کے ٹھوس مقصد کے لیے خود کو حیلہ سازی کے رویہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اگر اس کی رجعت پسندانہ یا آزاد خیالی کے برخلاف رویہ نمودار ہوتا ہے تو اس کا یہ عمل بڑے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ریاستی نجات تمام دوسرے معیاروں کو یکسانیت کا حق اور تحفظ دیتی ہے حتیٰ کہ یہ ریاست ہی ہے جو اپنے کسی ایک ممتاز پڑوسی ملک اور کسی ممتاز شخصیت کے ساتھ زبردستی کا (برا سلوک) کا حق رکھتی ہے۔ لیکن اسی وقوعہ کی طرح ریاست اپنے کسی اخلاقی رویے کے خلاف سخت ایکشن کرنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اسی طرح ریاست کا یہ رویہ مزدور کارکنوں، مظلوموں اور سماجی انصاف فراہم کرنے اور اس انقلابی کے حقوق کے لیے ریاست بطور نقاب (ماسک) کام لیتی ہے۔ اسی طرح ریاست دوسری تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برا یا دشواریوں اور مشکلات کو کم کرنے کے لیے فیصلہ کر سکتی ہے ایسے ہی جیسے خوش اخلاقی، صدق گوئی، سب سے اعلیٰ اور برتر عزت نفس کے لیے عوام کا عزت و احترام کرتی ہے۔ جیسے وہ اپنے برتر اور منفرد اور اپنی مشینری کے اعلیٰ کارپردازی کی تعظیم و تکریم کرتی ہے۔ میں ذاتی طور پر چند مزدور تنظیموں اور انجمن کاروں کو جانتا ہوں جو اپنی ذہانت کا بھیس بدل کر ان میں شامل ہوئے ہیں اور اپنے ادراکی لباس کے نقاب کے باعث رفعتیں پائی ہیں۔ اور اس کو خراج تحسین پیش کرنے کے بجائے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک دوسری قسم کی ڈکٹیٹر شپ کا تعلق ہے۔ ہم نے دو اعلیٰ حاکموں کو دیکھا ہے۔ کہ انھوں نے بھی عوام الناس کی کاسہ لیسی کرنے کے لیے کیسے کیسے مضحکہ خیز طور طریق اور انداز اختیار کیے ہیں۔ ہر اس چیز کو بھی کچل دیا ہے۔ جو بظاہر ان کو بھی عام سطح کی چیز دکھائی دیتی تھی۔

ہر ذمہ داری سے (فرائض) سے گریز کرنے والا یہ آدم زاد اپنے عجوبہ صورت رویہ کی جزوی تشریح اور وضاحت اور کچھ مضحکہ خیز اور شرمناک حد تک کرتا ہے۔ یہ جواں سال آدم زاد بھی جواں نسل کے پلیٹ فارم پر تقریر کرتے ہوئے مدلل دلائل دیتا ہے۔ اور ان کو قائل کر کے ان سے درخواست گزار ہوتا ہے کہ میری مانو، میری مانو اسی میں تمہاری بھلائی اور آشتی ہے۔ اور شاید ہمارے عہد سے قبل ایسا بھدا، بے ڈھنگا اور مضحکہ خیز تماشا کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ جس پر بالغ نظر لوگ

ظریفانہ مسکراہٹ یا رمزیہ طور پر یہ کہہ کر اپنی جان چھڑاتے ہیں کہ جاؤ کم سن ہو اور کم عمر ہو۔ ہم تجھے معاف کرتے ہیں اور جاؤ اور جو چاہو کرو۔ کیونکہ ان بزرگوں کے ذہنوں میں یہ بات ودیعت کی گئی ہے یا کسی سے سن لیا ہوتا ہے کہ ان کے حقوق زیادہ اور ذمہ داریاں کم ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک ان بزرگوں نے یہ بات (مقولہ) یونانی کیلی یارڈ (Kaleyard) کے مکتبہ فکر سے اخذ کیا ہوا ہے جنھوں نے اسکاٹ لینڈ کی عام زندگی میں جذباتی انداز میں عوام کو پیش کیا۔ اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں اسی نکتہ نظر کی وضاحت کے لیے مقامی بولی کو کثرت سے استعمال کرتے تھے۔ اور عوامی جذبات ابھارتے تھے۔ ایسی جوان نسل کے ہر قول و فعل سرگرمیوں، اور غیر معمولی حرکتوں اور حقوق ہمیشہ سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اس جوان نسل نے ہمیشہ اپنی اسی ساکھ کے بل بوتے پر بھرپور زندگی گزاری۔ اس صداقت کے برعکس صبح کاذب جو نصف رمزیہ ہوتی ہے اور نصف نرم دل ہوتی ہے جس میں تیقن ہوتا ہے۔ یہی رویہ اس وقت کے بزرگوں نے اپنی جواں سال نسل کو منتقل کر دیا ہے اور ان کے رویے کو صحیح اور مناسب قرار دے دیا ہے۔ چنانچہ اس نسل نے ترپ کے اس پتہ کو اس وقت کی نزاکت دیکھتے ہوئے ٹھیک نشانے پر پھینکا ہے۔ تاکہ وہ ریاست کے تمام حقوق پر ازخود قبضہ کریں کیونکہ یہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ حقوق اسی انسان کی ملکیت ہیں جس نے اس نسل کے لیے صدیوں سے کوشش شروع کی ہوئی ہے۔ بہت پہلے سے ان کو بہت کچھ دیا ہوا ہے۔

اگرچہ یہ بات محیرالعقول ہے کہ یہ نوجوان نسل ایک سرود روح چیز بن چکی ہے۔ ہم سچ میں سے ہیں یا صداقت ہیں جو ایک ایسے عہد میں رہتے ہیں جنھوں نے ان دو امدادی رویوں یعنی کسی چیز کا خاکہ بنانے میں تشدد اور مبالغہ آمیزی کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اس کا مقصد بھی وہی ہے جو کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی بہانے ہمیشہ سے اسی اجتماعی آدمی کی طرح ہوتا ہے۔ کہ وہ خدمت گاری کے رویے سے مبرا ہو سکے۔ تاکہ یہ بھی اعلیٰ افراد کی جی حضوری اور خدمت گاری سے مستثنیٰ ہو جائے۔

اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں کہ یہ اصل بحران یعنی دو اخلاقیات اور دو تہذیبوں کے درمیان تصادم کرائے کہ جس سے ایک کی تنزلی کا آغاز ہو اور دوسری کا عروج یعنی صبح صادق کا آغاز ہو۔ اس سے ایک تہذیب کا سورج غروب اور دوسری کا طلوع ہو رہا ہوتا ہے۔ اس نئی سحر میں عوامی آدمی اپنے خارجی یا چاروں جانب نئے اخلاقی ماحول میں معتبر ٹھہرے تاکہ یہ شعوری طور پر اس رویہ کے باعث اطاعت کرے یا اپنی ذمہ داری کو پورا کرے اور نبھائے نیز اپنے فرائض کو پوری ذمہ داری سے سرانجام دے سکے۔ لیکن شاید میں غلط (لگی لپٹی رکھے بغیر) کہہ رہا ہوں کیونکہ مجھے اس قسم کی مخلوق کے لیے کیا ایسے غیر اخلاقی الفاظ استعمال کرنا زیب نہیں دیتے؟ یقیناً" ! نہیں میں جواب آتا ہے ہمیں اس نسل کی طلب کم نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ علم اخلاقیات کو ٹھک ٹھاک کے بغیر حذف نہیں کیا جا سکتا۔ کیا گرامر میں اس کم تر الفاظ یا سادہ الفاظ موجود نہیں ہیں؟ کیا اس میں خیر و شر جیسی شے موجود نہیں ہے؟ اگر تم قانون و ضابطہ کی تابعداری کرنے پر رضامند نہیں ہوتے تو پھر کیا تم تاش

کے کھیل چھوئی موئی کا ڈھونگ رچا کر اپنے مد مقابل کو کیا ایک بڑی مات نہیں دیتے جبکہ یہ بھی ایک غیر اخلاقی فعل ہوتا ہے۔ اسے منفی اخلاقیات کا علم کہتے ہیں کیا تم غیر اخلاقیات کی ایک قسم سے انکار کیوں کرتے ہو۔؟ یقیناً" ! جو دوسری خالی خولی قسم کا تحفظ کرتی ہے۔ زندگی میں اس خیر و شر سے متعلق علم پر یقین کو کیسے ممکن بنایا جاتا ہے؟ بے شک ! کیونکہ تمام جدید تہذیب اور کلچر نے اپنی اصل سزا پانے کی طرف لڑھکنا شروع کر دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں یورپ نے اب اپنی غیر جمالیاتی کی خوفناک اور دردناک فصل کی کٹائی شروع کر دی ہے۔ جو عظیم الشان ہے جس کی کوئی بنیادیں اور جڑیں (Roots) نہیں ہیں۔

میں نے اس مضمون میں ایک فرنگی نسل شخص کے بارے میں موٹی موٹی باتوں خاص طور پر اس کے رویوں اور اس تہذیب میں جہاں اس نے جنم لیا ہے اور جنم لیتے ہی احتجاجی رویہ اختیار کیا' کا خاکہ ایک جائزہ کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے ایسی کوشش کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کیونکہ وہ تشخص جو ایک نئی تہذیب کو اپنی گذشتہ تہذیب کا لبادہ اوڑھنے کی جدوجہد نہیں کرتا وہ اپنی تہذیب کا عکس نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ صرف ایک منفی رویہ ہے۔ اس وجہ سے اس شخص کے فکر کی رنگین نمائندہ تصویر کشی کے عمل نے ہمارے زیر بحث اس عظیم سوال کے نتیجہ میں خلط مبحث کردیا ہے۔ وہ بنیادی نقائص کیا ہیں جن سے جدید یورپی ثقافت متاثر ہوئی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آج کے یورپ کی انسانی مقتدرہ کا ماخذ بھی انھیں نقائص میں موجود ہے۔

پہلے کی طرح اس عظیم سوال کی محض خارجی نمو کو ان صفحات سے باہر ہی رہنا چاہیے کیونکہ نظریہ انسانی وجودیت (ہست و بود) ہم سے تقاضہ کرتا ہے کہ اس پر جمی تہوں اور پرتوں کو بڑی تفصیل سے آشکارا کریں۔ اس طرح جیسے موسیقار مقصدی غنا کے عمل کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اور شاید میں بہت جلدی اس کا اعلان کروں۔

The GREAT BOOKS SERIES

The Revolt of Masses

By

Jose Ortega Y Gasset

Translated by

I.U.Jaral
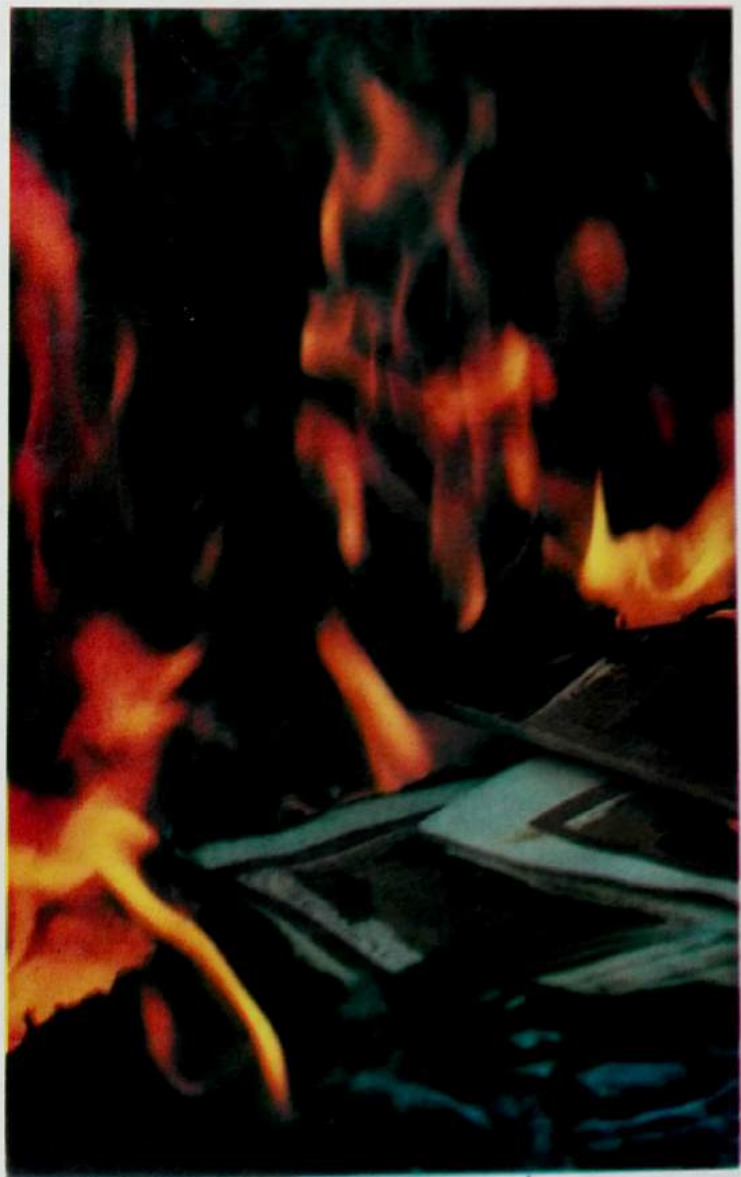
NATIONAL LANGUAGE AUTHORITY
PAKISTAN